

برگ و ساز ما کتاب و حکمت است
ایں دو قوت اعتسبات است

اقبال اور قرآن

فکر و پیام اقبال — قرآن کی روشنی میں

جلد دوم

پرویز

طالع پبلشرز، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	_____	اقبل اور قرآن
تالیف	_____	محمد عمر دراز
ناشر	_____	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	_____	25-B گلبرگ II لاہور 54660
طالع	_____	دوست ایسوسی ایشن
	_____	الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 54000
طبع	_____	عصمت اسلم پرنٹرز
پبلائیڈیشن	_____	اگست 1988ء
دوسرا ایڈیشن	_____	مئی 1996ء

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ آمدن
قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

فہستہ

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	متغاول اقبالؒ	۱
۲	اقبالؒ اور ختم نبوت	۱۸
۳	متبع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی	۲۲
۴	اسلامی مملکت کا تصور اقبالؒ کے نزدیک	۹۲
۵	فکر اقبالؒ کا سرچشمہ قرآن	۱۲۲
۶	روٹی کا مسئلہ اقبالؒ کی نظر میں	۱۴۳
۷	قانون شریعت میں اصول ارتقاء	۱۷۲
۸	اقبالؒ اور کمیونزم	۲۰۷
۹	دوقومی نظریہ اقبالؒ اور قدامت کی ٹنگا لہیں	۲۳۰
۱۰	احترام آدمیت	۲۵۸
۱۱	کس نہ گرد و درجہاں	۲۸۹
۱۲	پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ	۲۹۷
۱۳	نذر اقبالؒ	۳۱۵
۱۴	حقیقت خرافات میں کھو گئی	۳۳۹
	خلق خدا کی گھات میں رہند و فقیہہ میرپور	

پیش سے لفظ

(طبع اول)

اقبال اور قرآن " محترم پروفیسر صاحب کے ان مقالات اور خطابات کا مجموعہ ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً ارزاں فرمے۔ اس کتاب کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس میں ۱۹۴۳ء تک کے خطابات و مقالات آگئے ہیں۔ اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی کہ محترم پروفیسر صاحب کے ۱۹۴۵ء اور بعد ان کی وفات تک کے مقالات کو بھی کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ جلد دوم اسی ضرورت کے پیش نظر طبع کی جا رہی ہے، اور اس کے ساتھ، ان کا وہ مقالہ بھی زینتِ دہ اوراق ہے جو اوراقِ گم گشتہ سے ڈھونڈ کر نکالا گیا ہے کیونکہ (غالباً) یہ فکرِ اقبال پران کی پہلی نگارش ہے اور آدلا ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور کے خصوصی شمارہ، اقبال نمبر، بابت ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں یہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کردہ کتاب "اقبال معاصرین کی نظروں میں" میں بھی شائع ہوا، اور جس کا عنوان ہے متغاول اقبال؟

ہمیں امید ہے کہ اس جلد دوم کی طباعت سے محترم پروفیسر صاحب کی فکرِ اقبال سے متعلق تمام نگارشات کتابی صورت میں اکٹھی کر دی گئی ہیں۔

اس کے بعد، اگر ان کی اس سلسلہ کی کوئی تحریر سامنے آئی تو اسے جلد دوم کی اُنندہ اشاعت میں شامل کر دیا جائے گا۔

واللہ المستعان !

علی علیہ السلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

گلبرگ لاہور (۱۹۸۸ء)

متداول اقبال

کوئی تین برس اُدھر کا ذکر ہے، مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی، جس کا عنوان تھا — اقبالؒ معاصرین کی نظر میں — کتاب کے مرتب تھے پروفیسر وقار عظیم صاحب (جواب مرحوم ہو چکے ہیں)۔ اس میں ایک مقالہ بہ عنوان ”متداول اقبالؒ“ پر پروفیسر صاحب کے قلم سے بھی شامل تھا۔ حوالہ صرف ”۱۹۳۲ء“ دیا گیا تھا۔ ایک دوست کی نگاہوں سے یہ مقالہ گزرا تو انہوں نے ہم سے کہا کہ مقام حیرت ہے کہ پروفیسر صاحب کا یہ مقالہ (جو غالباً علامہ اقبالؒ پر ان کی اولین نگارش ہے) طلوع اسلام یا اس کی طرف سے شائع کردہ کسی کتاب میں درج نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس مقالہ (بلکہ پروفیسر صاحب کی اس قسم کی اور تحریروں کو بھی) طلوع اسلام کے صفحات میں محفوظ کر لینا چاہئے کہ ان کا شمار نوادرات میں ہوتا ہے۔ ہم نے ان سے اتفاق کیا۔ چنانچہ یہ مقالہ پیش خدمت قارئین ہے۔

پس منظر اس کا یہ ہے کہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۲ء میں، ماہنامہ نیرنگ خیال (لاہور نے اپنا خصوصی شمارہ، اقبال نمبر کے نام سے شائع کیا۔ وہ غالباً کسی ماہنامہ کا پہلا اقبال نمبر تھا) اور پروفیسر صاحب نے ان کے حسب فرمائش یہ مقالہ تحریر فرمایا۔ یہ آج سے پینتالیس سال پہلے کی بات ہے جب پروفیسر صاحب کی عمر ۲۹ سال کی ہوگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پروفیسر صاحب، تلاش حقیقت میں، تجسس و تحقیق کی مختلف وادیوں میں سرگرداں تھے۔ اور اگرچہ وہ اپنے دامن کو قدامت پرستی کی خاردار جھاڑیوں سے بڑی حد تک چھڑا رکھے تھے لیکن ہنوز ان سے بالکل بے باہر نہیں نکل پائے تھے۔ چنانچہ آپ کو ان کے اس مقالہ میں، اس ماضی کے کئی ایک نغمہ نشین دکھائی دیں گے، جو بعد میں قراء خالص پر آنے سے مٹ گئے۔ ہم نے مقالہ کے حواشی میں ان کی نشاندہی کر دی ہے۔ اس مقالہ کی اشاعت سے ہمارے پیش نظر جہاں یہ مقصد ہے کہ اس قسم کے نوادرات

طلوع اسلام کے اوراق میں محفوظ ہو جائیں، وہاں یہ دکھانا بھی مطلوب ہے کہ ایک مفکر کی فکر کن ارتقا میں کتنی گزرتی ہے۔ علامہ اقبال پر جب ایک دفعہ یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے اپنے سابقہ خیالات میں تبدیلی کر لی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ جلد تو پتھر ہوتا ہے۔ میں انسان ہوں۔ اور انسانی فکر میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ قائد اعظم پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ آپ پہلے نیشنلسٹ تھے، اب دو قومی نظریہ کے داعی کیسے ہو گئے، تو انہوں نے کہا کہ میں کبھی پرائمری میں بھی پڑھا کرتا تھا اور پرنیچر صاحب تو اپنی ہر تصنیف کے آخر میں وضاحت سے لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ میری فکر نہ صرف آخر ہے نہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن کریم کے سمجھنے کی انسانی کوشش ہے اگر اس میں کوئی بات قرآن مجید کے خلاف نظر آئے تو میں ان پر مزید غور کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں اور اس کے غلط ثابت ہونے پر اصلاح کے لئے آمادہ۔ اس مقالہ کے مطالعہ کے وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھئے اور پھر یہ دیکھئے کہ آج سے پینتالیس سال پہلے بھی، پیام اقبال اور قرآنی حقائق پر انہیں بہ ہیئت مجموعی کس قدر عبور حاصل تھا۔

مئی ۱۹۷۷ء

اب آپ وہ مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔

متداول اقبال

ترا چنانکہ توئی ہر کے کجا داند
بقدر طاقت خود می کنند شدراک

عام انسان ملائحہ سے افضل ہیں یا نہیں۔ یہ امر تو علم الاخلاق میں کسی حد تک متنازعہ فیہ رہا ہے۔ لیکن اس میں

تو کسی کو کلام نہیں کہ عالم خلق میں حضرت انسان سے زیادہ شرف و اعتبار کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ ایک طرف مشفق مقدسہ اس کی تصدیق میں طلب اللسان ہیں اور دوسری طرف دورِ جدید کے انکشافات اس کے مؤید۔ انجیل بتاتی ہے کہ آدم کو خدا نے اپنی شکل پر پیدا کیا ہے۔ خود قرآن حکیم خلقت انسانی کو "احسن تقویم" سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی ممکنات زندگی کو لامحدود قرار دیتا ہوا فرماتا ہے۔ **وَسَخَّرَ لَكُم مِّنَ السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ**... (۲۱) کہ پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب حضرت انسان کے تابع فرمان ہے۔ ادھر ماہرین نظریہ ارتقاء نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ موجودات عالم کی زنجیر کی آخری کڑی حضرت انسان ہے اور اس سے بڑھ کر شرف و مکمل ہستی بنو صغہ ارض پر نمودار نہیں ہوئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس یہ نظری شہادات نہ بھی موجود ہوتیں تو بھی انسانی قدرت و امکان کی داستانیں ہمیں مجبور کر دیتیں کہ اس کی خلافت و نیابت الہی پر امانت و صدقہ فدا کیا جائے۔

لیکن طبائع و اخلاق انسانی کی بوجھوں بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ایک طرف تو اس کی ہمت و حوصلہ کی وسعتوں کا یہ عالم، اور دوسری طرف، جب بعض ناگزیر اسباب و علل کے ماتحت اس کے ارادوں میں زلزل اور عزائم میں نسخ شروع ہوتا ہے تو یہ دوں ہمتی، یاس و غم، افسردگی و پشیمانی، بے بسی و بے چارگی کا جیسا نمونہ پیش کرتا ہے، باید و شاید۔ پتہ نہیں سب سے پہلے وہ کون سا شکستہ خاطر و اندوہ گیس انسان تھا جو حادثات و آلام سے مجبور ہو کر دل چھوڑ بیٹھا۔ اور اپنے ماحول، دنیا و مافیہا، بلکہ خود اپنی ذات سے تنگ آگیا اور وہ کون سے ناقابل برداشت مصائب و آلام تھے، جن سے تنگ آکر اس نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ دنیا، حزن و آلام، رنج و کربا، عقوبات، صعوبات، مشکلات و تکالیف کا گھر ہے اور مسرت و انبساط و سرور کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ متشائم نظریہ قدوینِ اولیٰ ہی سے انسانی دماغوں پر کالی گٹھاؤں کی طرح چھا گیا تھا۔ حکمت یونان اپنے ادب کمال پر بھی کہ افلاطون کا فلسفہ نفی حقیقت رائج ہو گیا۔ ادھر ہندوستان میں ویدوں کے زمانہ میں ہی اس کا مرغ مل جاتا ہے۔ آپ شدھ کی تعلیم کے مطابق امانت حقیقی اور اس کے ماوراء سب کچھ و ایم یعنی نفی ہے اور موجودات عالم مایا یعنی سراب۔

۱۔ پروفیسر صاحب نے قرآن مجید پر مزید غور و فکر کے بعد، ان نظریات میں تصحیح کر لی ہے۔ خدا نے آدم کو جس سے مراد آدھی ہے مسجد و ملائکہ قرار دیا ہے اور انسان کے متعلق کہا ہے کہ اسے "اکثر خلق" پر فضیلت عطا کی ہے (یعنی قرآن کریم اس کی بھی تصدیق نہیں کرتا کہ خدا نے آدم کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ یہ تصور غیر قرآنی ہے۔

۲۔ آدم کے خلیفہ اللہ جسے کانفرہ بھی صحیح نہیں۔ پروفیسر صاحب نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔

اس کے بعد بدھ مت کا زمانہ آتا ہے اور اس نے تو یوں کہتے کہ اُمیدوں کی چمکتی دنیا کا گویا جنازہ نکال کر رکھ دیا۔ مہاتما بدھ کی تعلیم کے مطابق، حزن و ملال خلقت انسانی کے اندر ولایت کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔ دنیا میں انسان کا وجود بذاتِ خود ایک بلائے عظیم ہے۔ اس تعلیم کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ ”زندگی نام ہے خواہش و آرزو کا۔ اور آرزو سراپا درد و الم ہے۔ لہذا زندگی فی نفسہ درد و الم ہے۔ اور صرف ترکِ علّاق، نفیِ خودی اور تعطلِ آرزو یعنی اُمید کی فنا اور خواہشات کی موت سے اتنا اس سکونِ ابدی اور راحتِ سرمدی کو حاصل کر سکتا ہے۔ جس کا نام نردوان ہے“ دوسری طرف عیسائیت میں مسئلہ کچھ اور بھی لپک لے کر ابھرا۔ ان کے نزدیک اس مجلسِ آب و گل میں انسان تشریف ہی اس لئے لاتا ہے کہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کی سزا بھگتے۔ لہذا جتنا اس جیل خانہ سے دور رہے اتنا ہی سکھ ہے کہ رہے

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری

فلاسفہ یورپ میں LIBNITZ کے وقت تک پھر بھی ایک حد تک متبادل نظریہ حیات کا چرچا تھا۔ ہیوم نے اس روش کا کچھ کاٹنا بدلا۔ ٹیکسے اور سپر اثبات سے تشکیک پر اترے اور شوہنپارے تو بالکل بدھ مت کا چولا پہن لیا۔ وہ زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو ورق ”کہہ دانتا ہے۔ اس کے نزدیک ”انسان ایک غیر فانی درد و کرب کا تختہ تمشت ہے اور مسرت و انبساط کا جو مراب اسے نظر آتا ہے وہ محض اس لئے ہے کہ یہ مصائب بھیلنے کے لئے ارتباطِ جسم و جان قائم رکھے۔“ لیکن چونکہ یورپ نے ایسے فلسفیانہ نظریات کو عملی دنیا میں دخل نہ دینے دیا۔ اس لئے یہ چیزیں ان کی مادی ترقی میں مانع نہ ہوئیں۔

اسلام دنیا میں آیا اور اُمیدوں کی ایک دُنیا اپنے ساتھ لایا۔ اس نے آتے ہی لٹکار کر کہا کہ: لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۱۳۱)

”مت گھراؤ، بالکل خوف نہ کھاؤ۔ تم ہی سب سے بلند و برتر ہو۔ پس تو این خداوندی کو ہاتھ سے نہ چھوڑو“

اس نے موجوداتِ عالم، اس کی فرمانبرداری میں۔ متاعِ دنیا اور مال و منال اس کے لئے باعثِ زینت و افتخار قرار دیئے۔ سرخروئیِ عقبی کے ساتھ ساتھ دنیاوی فلاح و بہبود کی زندگی کو بھی خاصہ حیاتِ گردانا

اور ایک مسلم کی زبان سے یہ دعا نکلوائی کہ :-

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً... (۱۱۶)

اس نے ایمان و عمل اور بحیر ایمان و عمل کو راز حیات بتایا۔ اور یاس و قنوط۔ نا اُمیدی اور عدم آرزو کو کفر سے تعبیر کیا اور صاف صاف فرمادیا کہ : لَا تَقْطَعُوا مِنْ مَرْجَاتِ اللَّهِ (۳۹/۵۳) مصائب و آلام کی گھٹائیں چاروں طرف چھا رہی ہیں۔ مسلمان ۔۔۔۔۔ بے یار و مددگار نظر آتے ہیں۔ بظاہر دل ہلا دینے والے اسباب جمع ہیں۔ لیکن اسلام زندہ آرزوؤں کا مذہبِ اسلام، اس وقت پکار پکار کر کہتا ہے :-

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (۱۱۶) مت گھبراؤ، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ (۱۱۷) وہ دیکھو نصرتِ خداوندی سامنے کھڑی ہے۔
وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالْقُلُوبِ (۱۱۸) ہمت و استقلال سے کام لو۔ ہمت بھی کرو۔
دعائیں بھی مانگو۔ حوصلہ رکھو۔ تم دس ہو گے تو سو پر فتح پاؤ گے۔ سو ہو گے تو ہزار پر بھاری ہو گے۔

بشرطیکہ اُمید کرنا تم سے نہ جائے دو۔

یہ قانونِ فطرتِ دنیا میں خدا کا آخری پیغام بن کر آیا اور چند دنوں میں، صدیوں میں نہیں چند دنوں میں، اس نے سرزمینِ عرب کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں، لبریا نشین، بادیاہ پمیا، اذنت چرانے والے بتوں کے ہاتھوں میں دبے دیں۔

لیکن افسوس، یہ تابناک و درخشندہ عہد کچھ زیادہ دیر نہ رہنے پایا تھا کہ فطرت کے یہ سیدھے سادے قوانین گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہونے لگ گئے۔ مشروع شروع میں شام و فلسطین کے کلیساؤں نے ان پر اپنا رنگ چڑھایا۔ پھر جب حکمتِ یونان عربی میں منتقل ہوئی شروع ہوئی، فلسفہ اشراقین نے اپنا اثر ڈالا۔ عجم میں زرتشتی آتش کرے ان اثرات کو جلا دینے کے لئے تیار تھے اور اس کے بعد جب ہندوستان میں پہنچے تو دیوانت نے ایسا "من تو شدم تو من شدی" کا منتر پھونکا کہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر بحیر "ہم اوست" ہو گئے۔ تاکس گوتہ بعد ازیں من و گیم تو دیکھ رہی۔ جہاں جہاں اور جب تک حکومت ہاتھ میں رہی اس کے اثرات زیادہ نہ ابھرے، لیکن جو نہی حکومت کا سلسلہ ہاتھ سے چھوٹا ان کا رنگ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ :-

باليقين من نيم، و وهم و گمانم باقيست

میرے نزدیک تصوف تہذیبِ نفسِ انسانی اور قوائے ملکیت کی جلا کے لئے از بس ناگزیر ہے۔ لیکن وہی تصوف جو "ناہ شعیب" سے قوتِ حیدری پیدا کر دے جس سے ادیس قرنی رحمہ کا سا عشق، بوذرجم کا سا فقر، سلمان رحمہ کا سا صدق، صدیق رحمہ کا سا ایثار اور خبیث رحمہ کا سا استقلال پیدا ہو جائے۔ جو خوفِ غیر اللہ کو اس طرح قلبِ مومن سے محروم کر دے کہ راجپوتانہ کے سے کفرستان میں تنہا توحید کا نعرہ بلند کرنے میں باک نہ سمجھے۔ جو سرزمینِ دہلی کو جہاں سپاری و سرفروشی کی امتحان گاہ بناوے، جو یہ سبق سکھائے کہ پانی پت کے میدان میں مسلمان سپاہیوں کی قبروں کے پہلو پہلو حضرت مخدوم جلال اور ترک شیرازی کے مقبرے بھی ہونے ضروری ہیں۔

ہاں تو عرض یہ کرنا تھا کہ ہندوستان میں پہنچ کر فلسفہ ویدانت نے اسلامی تصوف پر اس قدر گہرا رنگ چڑھا دیا تھا۔ یہ لہجہ، ہذا، اس کا حجاب مثنوی اسرار و رموز کی ایک تمثیلی حکایت سے ملے گا۔ لکھا ہے کہ ایک جنگل میں بہت سی بھیریں رہتی تھیں۔ کچھ دونوں کے بعد وہاں کچھ شیر آگئے اور ان بھیروں کا شکار کرنے لگے۔ ان میں سے ایک بھیر بڑی دانا اور ہشیار تھی اس نے سوچا کہ بھیروں کو شیر بنا تو مشکل ہے۔ اؤ ایک ایسی چال چلیں کہ شیر بھیروں کی خود بوا اختیار کر لیں، وہ ایک مقدس صورت اختیار کر کے شیروں کے پاس گئی اور ناشائی تہ دنیا، نفی وجود، مرابہستی کی خوش آمد تعلیم دینی شروع کی۔ رفتہ رفتہ شیر اس پندِ خواب آور سے اس درجہ متاثر ہو گئے کہ انہوں نے دین کو سفند اختیار کر لیا۔ حتیٰ کہ ۔

شیرِ میدار از فسونِ میشِ سخت
انخطاطِ خویش را تہذیبِ گفت

کچھ گروہ پیش کا اثر جس کے متعلق BLOOMFIELD ایک جگہ لکھتا ہے۔ "ارض ہند اپنی آب و ہوا، فطری اثرات اور معاشرتی حالات کی بنا پر متشائم فلسفہ حیات کی کافی وجہ اپنے اندر رکھتی ہے" اس پر فلسفہ ویدانت کا رنگ نتیجہ یہ کہ اکثر کے وقت تک اچھے غلمے ہمہ دوست کے رنگ میں رنگے گئے اور اگر سچ پوچھو تو عالمگیر کے بعد جو سلطنت کو زوال ہوا تو اصولی طور پر سب سے پہلے "شعلیاتِ دارا شکوہ" اس کے ذمہ دار ہیں۔

شاعری بقول میکالے چمکتی ہی دورِ تنزل و انحطاط میں ہے۔ جہاں رنگ و رو حیات، کش مکش روزگار

لے اس زمانے میں پروردگار صاحب ہنوز تصوف کی بھول بھلیوں سے نکل نہیں پاتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ دیکھتے کہ وہ اس وقت بھی کسی قسم کے تصوف کے قائل تھے۔

جبر للبقا کا سوال درپیش ہو۔ وہاں فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ایام سے متشائم فلسفہ حیات جذباتی شعراء کو ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ ہومر کا یہ المیہ گیت کہے یا نہیں :-
 ”دنیا میں جتنی چیزیں ہیں انسان سے زیادہ المناک کسی اور کی زندگی نہیں۔“
 اور سوفکلس کا یہ نوحہ کہ بھولا ہوا ہے :-

بہترین اندر یہ ہے کہ دنیا میں انسان آئے ہی نہیں۔

اور اگر اچھا ہے تو پھر سب سے بہتر یہ ہے کہ :-

انسان جہاں سے آیا ہے جتنی جلد ہی ہو سکے وہیں واپس لوٹنے کی کوشش کرے۔
 عرب کے ولولہ خیز خون میں حرارت پیدا کرنے والے رجزیرہ زمزمے جب غمی دورِ لغتیش و تنغم کی مجلس میں آئے تو یہاں دنیا ہی نرالی دیکھی۔ نتیجہ یہ کہ :-

اَلْقَصْدُ بِشَكْسَتْ وَاَلْ سَاقِي نَمَانْدُ

حرارت و اضطراب، سڑپ اور سیمابیت کی جگہ کیف و خمار، اسودگی و تن آسانی نے لے لی۔ اس دور کی شاعری پر نظر ڈالنے تو صاف نظر آجائے گا کہ کہاں یہ کہ :-

اگر جز بکام من آید جو اسب
 من و گمرز و میدان افرا سیاب

اور کہاں یہ کہ :-

حدیث مے و سڑپ کو دراز دہر کمتر جو کہ کس نکشو و نکشاید بکمت ایں معمار
 ہندوستان میں اول تو سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ ہی لیکن بالخصوص عذر کے بعد اردو شاعری پر یہ دورِ یاس و فئوٹ چھا گیا اور خوب اچھی طرح سے چھا گیا۔ شرکی انتہائی خوبی یہ قرار دی گئی کہ اس میں سوز و گداز ہو، افسردگی ہو، یاس ہو، موت ہو۔ بلکہ موت کے بعد بھی کوئی سڑپ، کوئی حرکت نہ ہو۔ کامل سکوت اور بے حسی ہو غرضیکہ واہ واہ کی جگہ، ہائے ہائے ہو۔ محفل میں چادوں طرف ایک کہرام مچ رہا ہو اور بزمِ مشاعرہ پر ماتم کدہ کا گمان گزرے۔ اس دور کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے واضح ہو جائے گا کہ جن شعراء کو اسائدہ فنی کے زمرہ میں لے لیا صفت میں جگہ دی جاتی ہے۔ ان کا طرہ امتیاز یہی افسردگی و یاس کا فلسفہ ہے۔ کسی ایسے شاعر کا دیوان اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ یہی رنگ نظر آئے گا۔ دو چار شعر ملاحظہ ہوں تو اسے

اب تو یہ چاہتا ہوں کہ، اے انتہائے غم
 اے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

عالم کی فضا پوچھو، محروم تمنا سے بیٹھا ہوا دنیا میں، اٹھ جائے جو دنیا سے

کیا ہنسنے انسان اور کیا رو سکے جی ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

میرے دم پر جو گزرتی تہ ہے گزر جانے دو قصہ غم نہ بڑھاؤ مجھے مرجانے دو

تمہیں ہے خزاں کی یہ ہنگامہ بہار اچھا ہے میرا نخل تمنا ہر آنہ ہو

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی سیر ہر قدم پہ گماں یاں رو گیا واں ہو گیا

دل مایوس میں اُمید نے لی اس طرح کڑو ابھر کر کوئی سطح آب پر گویا حباب آیا

کیا کردوں شرحِ خستہ جانی کی ہم نے مر مر کے زندگانی کی

صبا شکستہ پردوں کی دعائیں لیتی جا جھکاوے اور ذرا شاخِ اُشیانے کی

فنا سے پہلے غمِ دل کی انتہا معلوم مگر یہ دل بھی میٹے گا کبھی یہ کیا معلوم

غم ایک ہی ایسا ہے جو دنیا کو بھلا دے غم کیا ہے یہ نعمت مگر جس کو خدا دے

پوچھا اثر سے میں نے جو دل کا معاملہ اک آہِ مردِ کھینچ کے خاموش ہو گیا

خدا عدد کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا

عزضیکہ کہاں تک لکھتے جائیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک صنفِ ماتم بچہ رہی ہے۔ جس پر دنیا و مافیہا کی فحش خفانی ہو رہی ہے۔ اور قد اور جو چیزیں کبھی حصولِ سرور و انبساط کی عرض سے اختراع کی گئی تھیں، ان سے بھی مقصود حزن و غم ہی لیا جاتا ہے۔ شرابِ نمک کی بھی خواہش محض اس لئے رہ گئی کہ ایک گنہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے۔ اور ہمارے اس ”موردنی ذوقِ ماتم کدہ“ کا اندازہ آج بھی اس سے لگ سکتا ہے کہ موسیقی جیسی طرزِ انگیز اور گرما دینے والی چیز بھی اس وقت تک محفوظ نہیں کر سکتی جب تک اس میں نغمہ ہائے جاگہ ازاد ”سوز“ کی سریں نہ ہوں۔

عزضیکہ افسردگی و غنودگی کا یہ عالم مسلمانانِ ہند پر چھا رہا تھا۔ اور لطف یہ کہ اس کا نام ”تہذیب و اخلاق“ رکھ چھوڑا تھا۔ قاعدہ ہے کہ انحطاط و زوال کے وقت خدا کے بندے پیدا ہوتے ہیں۔ اور امتِ مرحومہ میں تو ایسے لیے صاحبانِ فکر و بصیرت پیدا ہوتے ہیں جو نبی اسرائیل کے انبیاء کے کام کے دھاتے ہیں (حدیث شریفہ) چنانچہ شعراء میں عالمی مرحوم نے اس کا احساس کیا۔ قوم پر پڑی لے دے کی۔ ہر چند دل میں بڑا درد تھا۔ لیکن صدیوں کے نشہ کو چید ”طعنوں“ سے آواز نا مشکل تھا۔ اکبر مرحوم بھی جب دل کی ٹھیس سے مجبور ہوئے تو مرلیض کو ہوش میں لانے کے لئے کچے دیئے اور حقیقت یہ ہے کہ خوب دیئے اور ہنسا ہنسا کر، گد گدا گد گدا کر ایسی ایسی پتے کی کہہ گئے کہ جتن لاگے سوتن جانے۔ لیکن مرض کی کہنگی اور مرلیض کی ضد سے وہاں بھی یاس کا پہلو غالب رہا۔

لیکن قدرتِ کاملہ نے ”بانگِ درا“ کی خدمت کسی اور کے حصہ میں رکھی تھی۔ وقت آیا اور وہ ہستی پنجاب کے ایک اقبالؒ کے نام سے منقہٴ شہود پر جلوہ نگن ہوئی۔ اس کی چشمِ حقیقت میں نے ذاقحات کو چھوڑ کر ان کے علل و اسباب پر غور کیا۔ اور اس رموز شناسِ فطرت نے خوب محسوس کیا کہ فقدانِ عمل، بے حسی اور مردہ دلی کا سبب یہ ہے کہ سینوں میں دل اور دلوں میں آرزوئیں اور آہنگیں، جوش و دلولے پیدا کرنے والی حرارت موجود نہیں۔ آتشِ دان ہیں، لیکن افسردہ اور ٹھٹھڑے ہوئے اور علتِ مرض یہ ہے کہ قوم اپنی حقیقت سے بے خبر ہو چکی ہے

انرا دولت کا نظریہ حیات متشائم ہو چکا ہے۔ لہذا سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ انہیں ان کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ انہیں ممکنات زندگی کی وسعتوں سے روشناس کرایا جائے۔ اور مشنوی کے تمثیلی شیر کی طرح جو ایک عرصہ تک بھیر پھول کے گلے میں پرویش پا کر اپنے آپ کو بھیر ہی شمار کرنے لگا تھا، کسی آئینہ میں اسے اس کے اصلی خط و نال سے واقف کرا دیا جائے۔ ایک حقیقت میں نباح کی طرح اس نے علت مرض دریافت کی اور بہترین معالج کی طرح اس کے لئے نئے تجویز کئے اور ہر خفید مرض مزمن اور مرہض فصدی۔ اور فصدی بھی ایسا کہ خود درد کو دوا سمجھنے لگ گیا تھا۔ لیکن اس کی پیشانی پر شکر نہک نہیں آیا۔ اس نے طالع کی کمزوریوں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا، بلکہ ان کے حال زبوں پر رحم کھایا اور مشفقانہ طور پر گرسے ہوئے کو اٹھایا اور اٹھا کر سینے سے لگایا۔

سب سے پہلے ہم یہی دیکھتے ہیں کہ اس نے زندگی کی درخشندہ و تابناک تصویر، جس پر مدلوں سے یا سزا مردہ دلی کا گمہ در غبار پڑ رہا تھا، کس طرح اپنے اصلی خط و خال میں پیش کی۔ ہر خفید علامہ ممدوح کا سارا کلام انہیں رموز و حقائق سے برنیہ ہے۔ لیکن مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں :-

آشنا اپنی حقیقت سے ہوائے دہقا ذرا دانا تو! کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

اپنی اصلیت سے ہوا گاہ اے غافل کہ تو قطر ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو کسیر بے تیغ و تنگ تو اگر سمجھ تو تیرے پاس وہ سماں بھی ہے
کیوں کہ قنار طلسم، میح مقداری ہے تو دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ علفاں بھی ہے

بے خبر توجہ ہر آئینہ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے
اور وسعتِ ملاحظہ فرمائیں :-

وہ مشتِ خاک ہوں فیض پریشانی صحراییں نر پھو میری وسعت کو زمین آسمان تک
شبِ معراج سے یہ سیتی اخذ فرماتے ہیں کہ :-

رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات
اس کے ”دست بازو“ کو یہ مادیات تک ہی محدود نہیں گردانتے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ارشاد ہے:-

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
دامِ تسخیر کی وسعت اور ملاحظہ فرمائیے:-

دردِ شب، جنوں میں جبریل زبوں حبیب
یزداں بکھڑا اور اسے ہمتِ مروانہ
وہ "حیاتِ جاوداں کو" زندگی کی چار دیواری تک محصور نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک:-
زندگی کی آگ کا انجم خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گدہ نہیں
جب حضرت انسان کی ممکناتِ زندگی کی یہ وسعتیں ہوں، تو اسے کیوں نہ یہ درسِ حیات دیا جائے کہ:-
اے زادِ آدابِ امانت بے خبر
ازدو عالمِ خویش را بہتر شمر
تا کجا خود را شمار و طیس
از گل خود شعشعلہ طور آفریں
یاور کھینے، اے

تا تو اس خود را اگر دہر و شر د
نقدِ حبانِ خویش بار ہزن سپرد

اور یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ:-

دلے اس باز جڑ من کس نہ اند
ضمیرِ خاک و خم بے چگون است
انتہایہ ہے کہ:-

قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست
اس سے زیادہ اور کیا قیمت ہو سکتی ہے کہ خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست۔ اللہ اکبر۔ یہ قدر و قیمت!
ہاں! اور چلتے چلتے ذرا اس معرکہ الاراء۔ زندہ جاویدِ نظم کے دو چار شعر بھی سنئے جائیے۔ جس کا عنوان
ہی اس پیامِ حیات نے "زندگی" رکھا ہے۔ دیکھتے اور غور فرمائیے کہ کیا یہ ہمارا ہی ذکر ہو رہا ہے۔
زندگی کی بقا، ملاحظہ فرمائیے:-

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
تو اسے پیمانہٴ امروز و فردا سے نہ ناپ
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں، زندگی
جاوداں، پیہم دواں۔ ہر دمِ جاں، زندگی
نہر آدم ہے ضمیر کن جہاں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر فندوں میں ہے

اشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے گہرے اک مٹی کے پیکر میں، زندگی پھر اس کے اثرات ملاحظہ فرمائیے :-

بھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے اشکار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
تایہ چپکار سی فروغِ جاوداں پیدا کرے
ممکناتِ زندگی کے ساتھ ساتھ متنازع دنیا کے تمتع اور تسخیر قوائے نظامِ عالم کا درس بھی ضروری تھا۔ کیونکہ متشائم فلسفہ حیات نے متنازع دنیا کو حرام سمجھ رہا تھا۔ فرماتے ہیں :-

اسے کہ از تاثیر ایفون خفستہ
خیزد و اکن ویدہ مخمور را
عالم اسباب را دوں گفتہ
دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را
جلوہ اشش یا دیدہ مومن سپرد
بر عنصرا حکم او محکم شود
جسے آب گوہر از دریا بہار
الغس و آفاق را تسخیر کن
شبنی؛ خورشید را تسخیر کن
غنیہ از خود چمن تعمیر کن

یعنی عناصرِ عالم کے سامنے سر نہیڑھا کر، ہاتھ باندھ کر اطاعت کے لئے کھڑا نہ ہو جا۔ بلکہ ان سے خدمت لے۔ انہیں تابعِ فرمان بنا اور متنازع دنیا سے پورا پورا فائدہ اٹھا۔

حقیقت سے آگاہی کا لازمی نتیجہ تھا کہ قوم کو اپنی بے بسی اور حیرت و سکت کا احساس پیدا ہوتا۔ چنانچہ جب دیکھا کہ قلبِ ملت میں خوابیدہ حسیات کی بیداری کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں۔ عروقِ مردہ میں خونِ زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں، تو تخلیقِ آرزو (یا کم از کم تجدیدِ آرزو) کی ضرورت پڑی۔ کیونکہ جب ایک طرف متنازع حیات کی قدر و قیمت اور دوسری طرف اپنی قوتِ بازو کا احساس پیدا ہو گیا تو جلدِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لئے آرزو کا پیدا ہونا اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ لہذا آرزو کی اہمیت مختلف پیراؤں میں واضح کی گئی اور میں کہوں گا کہ یہی چیز علامہ ممدوح کا حقیقی پیغام ہے۔ پہلی منزل کو اس کا مقدمہ سمجھنا چاہئے اور قوتِ عمل کو اس کا نتیجہ، یہی جوہر تھا جس کے فقدان سے قوم پر مرہ دلی اور بے بسی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں

اور اس کی تخلیق یا رجعت اس مرض کا علاج تھا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ کس جوش اور ولولے سے اُمید دل کی بستی
از سر نو تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے لٹکار کمر یہ پیغام سنایا کہ یہ
مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ہر نماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار
دیکھئے اس ایک شعر کے اندر کس قدر سربستہ راز حیات پوشیدہ ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سارے فلسفہ
حیات کا نچوڑ اس پیغام کے اندر موجود ہے۔ آرزو سے خالی دل کی کچھ قدر و قیمت ان کے نزدیک نہیں ہے۔
فرماتے ہیں :-

اگر ز رمز حیات آگہی بجوئے مگیر دے کہ از خلشِ خادِ آرزو پاک است
مثنوی امر آرد تو ز میں جس میں علامہ ممدوح کا حقیقی معنوں میں مکمل پیغام حیات محفوظ ہے اور اس کے بعد کلام
اسی کلام کی تفسیر و تشریح۔ مسئلہ آرزو پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے اور مختلف انداز سے اس
کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :-

زندگی در جستجو پوشیدہ است	اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دل خود زندہ دار	تا نگر دو مشت خاک تو مزار!
آرزو جانِ جہان رنگ دیوست	فطرت ہر شے امین آرزو ست
از تمنّا رقصِ دل در سینہ ہا	سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
طاقتِ پرواز بخشہ خاک را	خضر باشد ہوئے ادراک را
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات	غیر حق میر و چو او گیر حیات
چوں ز تخلیق تمنا باز ماند	شہیرش بشکست و از پرواز ماند
آرزو ہنگامہ آرائے خود می	موج بے تابلے ز دریائے خود می
آرزو صیدِ مقاصد را کند	دفعہ افعال را شیرازہ بند
زندہ را، منفی تمنا مردہ کرد	شعلہ را نقصان سوزا فرودہ کرد

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم

از شعاعِ آرزو تا بندہ ایم

دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

گرم خوں انسان ز داغ آرزو آتشِ این خاک از چراغ آرزو
از تمنائے بجام آمد حیات گرم خیز و تیز گام آمد حیات
زندگی مضمونِ تسخیر است و بس آرزو افسونِ تسخیر است و بس
زندگی صید، انگن و دام آرزو حسن را از عشق پیغام آرزو
ایک جگہ یاس و خون و خوف کو اُمّ الخبائث و قاطعِ حیات قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

مرگ را سامانِ ز قطع آرزوست زندگی کافی محکم از لا تقنطوست
تا امید از آرزوئے پیہم است نا اُمیدی زندگی را ہم است
زندگی را یاسِ خواب آور بود یاسِ دلیلِ هستی عنصرِ بود
از دُشس میرد فوائے زندگی خشک گرد و چشمِ ہائے زندگی

یاسِ دنا اُمیدی فی الحقیقت ان کے پاس تک نہیں پہنچتی، سخت سے سخت مسببت میں بھی سرشتہ اُمید ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتے۔ فرماتے ہیں :-

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھ ہے بھر دسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھ

اور :-

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جو شش کا زار
ریاضِ ملت پر خزاں مسلط ہو چکی ہے - بادِ سہم کے جھونکوں نے ہرے بھرے دختوں کو خشک کر دیا ہے۔ برگ و گل مرجھا کر گھر پڑے ہیں - ایک ادھرتیا کہیں کہیں مثلِ چہرہ مذوقِ زرد نظر آتا ہے۔ یاس و قنوط کے اس اندہناک سماں میں کسے اُمید ہو سکتی ہے کہ یہ اُجڑا چین پھر بھی آباد ہوگا۔ لیکن ہمارا اُمیدوں کا شہزادہ ہے کہ اب بھی متشائم نظریہ کو یاس تک نہیں آنے دیتا اور چپکے سے اکر یہ درسِ حیات دیتا ہے کہ :-
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھو پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھو
اس مضمون کو مثنوی میں اس طرح فرمایا ہے :-

برگ سبزے کنزِ نماں خویشِ رخت از بہاراں تارِ اُمیدش گسخت
در خزاں اے بے نصیب از برگ و بار از شجرِ مگسل با اُمید بہار

اُمید — اُمید — اور ہر حالت میں اُمید — کبھی مایوسی نہیں — کبھی افسردگی نہیں۔ پھر اس گلچینی بہار میں وسعت و اماں ملاحظہ فرمائیے :-
 نہ ہونقاعت شعار گلچیں اسی قائم ہے شان تیری و فرنگل ہے اگر چمن میں تو اور دامنِ راز ہو جا
 اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے :-
 تو ہی ناداں چنہ کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے
 اُمید و آرزو کا ایسا متبادل فلسفہ حیات کم ہی کسی کے ہاں ملے گا۔

اب جبکہ آرزوئیں پیدا ہو گئیں۔ اُمیدیں وابستہ ہو گئیں۔ نا اُمیدی کا چھلکا و اغائب ہو گیا۔ حُزن و ملال کا بوجھ دل سے ہلکا ہوا تو حصولِ مدعا کے لئے فطری طور پر دل میں ایک ترطب پیدا ہوئی۔ یہاں پہنچ کر اب یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ یاد رکھو۔ کامیابی و کامرانی، فتح و نصرت کا راز عمل اور قوت میں پوشیدہ ہے اور آرزو بغیر عمل کے بالکل مہل چیز ہے۔ چنانچہ یہ راز سر بستہ کھول کر سامنے رکھ دیا کہ :-
 عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خالی اپنی فطرت میں نہ لوری ہے نہ نارنجی
 مثنوی میں فرماتے ہیں :-

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات لذتِ تخلیقِ قانونِ حیات
 قوت کی اہمیت کے متعلق ذیل کے دو مصرعوں میں جن دو حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے۔ بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں بھی مضمون سمانہ سکتا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے :-
 زندگی کشتِ حاصلِ قوت است شرحِ رمزِ حق و باطلِ قوت است
 یہ وہ معارف و حقائق ہیں جو کسی دلیل کے محتاج نہیں۔ بل و اقوامِ عالم کی تاریخ۔ اور خورد و درِ حاضرہ کے روزانہ مشاہدات اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

جب اپنی حقیقت سے آگہی۔ دل میں آرزو اور جوشِ عمل اور بازو میں قوت پیدا ہو گئی تو ایک ایسا مسماہ حیات مقرر کر دیا جس سے زندگی کی خامیاں دور ہو کر اس میں نچتگی پیدا ہو جائے اور زندگی اس درجہ محکم و مستوار ہو جائے کہ بڑے سے بڑا خطرہ اور مہیب سے مہیب حادثہ اس میں ترنزل نہ پیدا کر سکے۔ اس مقام پر قرآنِ مجید نے فرمایا کہ : وَلَسْبَلُّوْكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَا اِلَيْهِ

وَأَجْعَلُونَ ۲۵۵ - کہ دنیا میں تمہارے اوپر مختلف قسم کی آزمائشیں آئیں گی۔ مہملہ ان کے خوف و حزن، بھوک پیاس نقص مال و جان وغیرہ ہوں گی۔ پس فتح و کامرانی کی خوشخبری ان کے لئے ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ہمت و استقلال سے کام لیتے ہیں اور بے باکانہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری زندگی اور موت، سچ و غم، سود و زیان جو کچھ بھی ہے، سب اللہ کے لئے ہے اور ہم سب کو اسی کی طرف پلٹنا ہے۔

چنانچہ ایک ایسی ہی زندگی کا نقشہ علامہ ممدوح نے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-
ہر کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
دوسری جگہ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں :-

مرا صاحب دلے این نکتہ آموخت
بے باک زندگی کے متعلق فرماتے ہیں :-

دل بے باک راضی غم و گم است
اگر نیچے نداری بھر صبر است
پوچھا گیا کہ راز حیات کس چیز میں ہے۔ جواب سن لیجئے :-
رفیقش گفت اے یار خسرو مند
خطر تاب و توان را امتحان است
لالہ طور میں فرماتے ہیں :-

سکندر با حق خوش نکتہ گفت
تو این جنگ از کتار عرصہ بینی
دوسری جگہ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں :-

بدریا غلط و بامو حش در آویزد
آپ نے غالباً یہ تعلیم بھی سنی ہوگی :-

بدریا در منافع بے شمار است
اب ذرا اوپر کے شعر کو دوبارہ ملاحظہ فرمائیے :-

خیال کن تو کجائی و ماکجا واعظ

دوڑ کے اُسے پر زندگی کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں :-
مرا از شکستن چنین عار ناید کہ از دیگران خواستن مومبائی

اسی طرح :-

نفس دارد و لیسکن حال ندارد کہ کو بر مراد دیگران زیست
یہ شعر تو یقیناً آج ہر مسجد کے محراب پر کندہ کہہ دینا چاہیے اور اس کے قطعات ہر مکان اور ہر دکان میں آویزاں ہونے چاہئیں۔

بخود خنذیدہ و محکم چو کہ ہاراں زنی
چو خس مزی کہ ہو! تیز و شعلہ بیباک است

اللہ اکبر کس قدر "زندگی" ہے اس پیغام کے اندر۔
پھر جب زندگی اس قالب میں ڈھل جائے۔ قوم کی قوم اس رنگ میں رنگی جائے تو امیدوں کی چمکتی دنیا کا
کس جنتِ ارضی کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ سن لیجئے :-
فرصتِ خاکیاں از زریاں افزوں شود روز زمین از کوکبِ تقدیر ما گزدوں شود روز

یہ ہے مختصر پیغامِ حیات ہمارے متبادل رموز شناس فطرت شاعر کا۔ جس نے فی الواقعہ مسیحا کا کام کیا ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ قوم کی حالت بدلنے کے لئے پہلے افرادِ ملت کی ذہنیت بدلنی ضروری ہوتی ہے تو بلا خوفِ نزدیک کہا جائے گا کہ آج تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اگر کچھ زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ تو یہ علامتِ ممدِ مدظلہ العالی کے پیامِ حیاتِ بخش کے رہنِ منت ہیں۔ آج اگر ان اثرات کی ابتداء ہے۔ تو کل یعونہ تعالیٰ پر شجرِ طیب اصلہا ثابت و فرعہا فی السمار بن کہ بڑھے پھولے گا اور اسلام کی حیاتِ جدیدہ میں علامتِ موصوف کا نام درخشندہ ستارے کی طرح تابناک رہے گا۔

اے کاششِ مردوں کی یادگاریں قائم کرنے والی قوم اپنے زندہ افراد کی قدر کرنا بھی سیکھے!

حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم پروین

تحریر کردہ ۱۹۳۲ء برائے اقبالؒ نمبر ماہنامہ نغمہ خیالؒ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اقبال اور ختم نبوت

(بتقریب یوم اقبال اپریل ۱۹۷۵ء)

پروفیز

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم !

اس سال یومِ اقبال کی تقریب کے ليے جو موضوع تجویز کیا گیا ہے، میرے نزدیک حالات کی مناسبت سے وہ نہایت موزوں ہے۔ ایک تو اس ليے کہ ختمِ نبوت دین کی اساس و بنیاد ہے اور دوسرے اس بنا پر کہ علامہ اقبالؒ نے جس طرح پاکستان کا تصور دے کر مسلمانانِ ہند کی جدوجہد آزادی کے ليے ایک نصب العین متعین کر دیا، اسی طرح انہوں نے عقیدہ ختمِ نبوت کی اہمیت اور عظمت کی وضاحت سے اس تحریک کو بھی نشانِ منزل عطا کر دیا۔ حضرت علامہ کے یہ اتنے بڑے احسانات ہیں کہ ان کی یاد قائم رکھنا قوم کا ملی فریضہ ہے، اس ليے بھی کہ خود اس کی دینی زندگی کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔

آج کل اس افتراء کو فضا میں عام کیا جا رہا ہے کہ علامہ اقبالؒ مرزا غلام احمد کے دعویٰ کی صداقت کے قائل تھے اور ان کی جماعت کی حقانیت کے معترف ”احمدی“ حضرات کا یہ عام شعار ہے کہ یہ تبلیغ سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے امام (مرزا غلام احمد) کی تحریروں سے چُن چُن کر وہ عبارتیں پیش کریں گے جن میں مرزا صاحب نے، اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں مسلمانوں جیسے عقائد و نظریات کی تلقین کی تھی اور ان کی انبار در انبار تحریروں کو کبھی سامنے نہیں لائیں گے جن کی دُور سے انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور تمام مسلمانوں کو خارج از اسلام قرار دے کر اپنی الگ اُمت کی تشکیل کی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک تقریر کی تھی جس کا اردو ترجمہ ”ملت بیضی پر ایک عمرانی نظر“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا۔ میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے، ٹھیک ہے۔

اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ اس نمونہ کو ترقی دی جائے۔ اور مسلمان ہر وقت اسے پیش نظر رکھیں۔ پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیکہ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔

علامہ اقبال کا اظہار حقیقت

”احمدی حضرات اس اقتباس کو ہر جگہ اچھالتے پھرتے ہیں اور اسے اپنے امام کے دعویٰ کی صداقت کے لئے بطور سند پیش کرتے ہیں اور کبھی یہ نہیں بتاتے کہ خود علامہ اقبالؒ نے اس عبارت کے متعلق کیا کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا:

جہاں تک مجھے یاد ہے، یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے (یعنی ۱۹۳۵ء سے) ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سربراہ اور وہ تھے اور گگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے، بانی تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، کتاب ”براہین احمدیہ“ میں بیش قیمت مدد پہنچائی۔ لیکن مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لئے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانی تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے۔ معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اُس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت — بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت — کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھیل سہا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول امیر سن اپنے آپ کو صرف پتھر جھٹلا نہیں سکتے۔

(احمدیت اور اسلام)

مفکرین کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ جوں جوں ان کے معاملہ میں وسعت اور فکر میں گہرائی پیدا ہوتی ہے، وہ اپنے سابقہ خیالات پر نظر ثانی کر کے ان میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ یہ تو صرف غاصۂ نبوت ہے کہ اس کا پیغام روزِ اول سے آخری دن تک یکساں اور واحد رہتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس پیغام کا سرچشمہ علم خداوندی ہوتا ہے جو زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء اور ہر آن بدلنے والے احوال و کوائف کی اثر پذیری سے منزہ و معزا ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی تقریر کے متعلق جو وضاحت کی ہے، اس کے علاوہ خود ”احمدی“ حضرات کے ہاں سے بھی ایسی شہادت ملتی ہے جس کی روش سے ان حضرات کا یہ دعویٰ کہ علامہ اقبالؒ بھی قادیانیت کی صداقت کے معترف تھے، پاش پاش ہو جاتا ہے۔ مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیر احمد نے ”سیرت المہدی“ کے عنوان سے اپنے والد کے سوانح حیات قلمبند اور شائع کئے ہیں۔ وہ اس میں لکھتے ہیں کہ:-

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔۔۔۔۔ شیخ نور محمد صاحب نے غالباً ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سید حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبالؒ اسکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود کے معتقد تھے۔ چونکہ سر محمد اقبالؒ کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا اس لیے ان دنوں میں انہوں نے سعد اللہ دھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔ مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبالؒ کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آگئی اور انہوں نے اپنے باپ کو سمجھا بھگا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ..... آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ مرحوم کے نام گیا جس میں لکھا گیا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیں کہ وہ جماعت سے الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں..... ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے) شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو ہر پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر اقبالؒ کا مخالفانہ پروپیگنڈہ تھا۔

(سیرت المہدی - جلد سوم صفحہ ۲۴۹ - طبع اول اپریل ۱۹۳۹ء)

میں ان بیانات کے تنقیدی جائزہ سے صرف نظر کرتے ہوئے، کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ ”احمدی“ حضرت علامہ اقبالؒ

کی تقریر کے ایک فقرہ کو تو اچھالتے پھرتے ہیں لیکن دہان کی طرف سے پیش کردہ وضاحت کا کبھی ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی خود مرزا صاحب کے صاحبزادہ کی اس شہادت کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ ہے ان کے تبلیسی پراپیگنڈے کے انداز کی ایک مثال۔

علامہ اقبالؒ کی طرف سے تحریک "احمدیت" کی اس (بقول مرزا بشیر احمد) نہر آلود مخالفت کی ابتداء ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ اور یہیں سے میں بھی اس داستان کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کی تمہید کے طور پر ایک اور واقعہ کا پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسے پیش کرتے وقت مجھے کچھ جھجک سی محسوس ہوتی ہے کیونکہ ذکر علامہ اقبالؒ کا ہو رہا ہے اور اس واقعہ کا تعلق خود میری اپنی ذات سے ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کا تقاضا اس جھجک پر غالب آجاتا ہے اور اس جرأت کا کفارہ بن جاتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے۔

بہاول پور کا مقدمہ

کہ سابق ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں ایک مسلمان خاتون نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے خاوند نے قادیانی مسک اختیار کر لیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتد ہو گیا ہے۔ اس لیے اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور مسلمانوں میں ایک ہیمجان پیدا ہو گیا۔ اس لیے نہیں کہ اس میں فریقین کی حیثیت بڑی ممتاز تھی۔ وہ تو بالکل غیر معروف سے تھے۔ یہ اس لیے کہ (غیر منقسم) ہندوستان میں (غالباً) یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا جس میں فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ ایک شخص قادیانی مسک اختیار کرنے کے بعد مسلمان رہتا ہے یا نہیں؟ اس اعتبار سے یہ متعلقہ فریقین کا مابہ النزاع معاملہ نہ رہا بلکہ قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کے مابین ایک دینی سوال بن گیا جس کا عدالتی فیصلہ، ظاہر ہے کہ، بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ مقدمہ قریباً نو سال تک زیر سماعت رہا اور آخر الامر محمد اکبر صاحب ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے (جواب مرحوم ہو چکے ہیں) ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ اپنی شہرت اور اہمیت کے پیش نظر اس زمانے میں بھی الگ چھپ گیا تھا اور اس کے بعد بھی چھپتا رہا۔ میرے سامنے اس وقت اس کا وہ نسخہ ہے جسے جون ۱۹۷۳ء میں "مختل ارشادیہ، سیالکوٹ" نے شائع کیا اور جواب عام طور پر دستیاب ہو جاتا ہے۔ اس فیصلہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مدعیہ کی طرف سے بڑے بڑے جید علمائے کرام بطور گواہ پیش ہوئے۔ مثلاً مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور۔ مولانا نجم الدین صاحب پروفیسر اور نیٹل کالج لاہور۔ مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری اور مولانا سید انور شاہ صاحب شیخ الحدیث

دارالعلوم دیوبند وغیرہم۔ اس سے اس معاملہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ فاضل حج نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ اس مسئلہ کا دار و مدار اس بات پر تھا کہ نبوت کی حقیقت کیا ہے اور نبی کسے کہتے ہیں؟ لیکن (انہوں نے کہا کہ) مشکل یہ ہے کہ :

”موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان نبی کی حقیقت سے بھی نا آشنا ہیں۔ اس لیے بھی ان کے دلوں میں یہ مسئلہ گھر نہیں کر سکتا کہ مرزا صاحب کو نبی ماننے میں کیا قباحت ہوتی ہے کہ جس پر اس قدر پیچ و پیکار کی جا رہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی کچھ تھوڑی سی حقیقت بیان کر دی جائے۔ مدعیہ کی طرف سے نبی کی کوئی تعریف نہیں بیان کی گئی۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ نبوت ایک عہدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے برگزیدہ بندوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ اور نبی اور رسول میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے اور نبی کے لیے لازمی نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ قرآن ثانی نے بیان کیا ہے کہ رسول ایک انسان ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ احکام شریعت کی تبلیغ کے لیے بھیجتا ہے، برخلاف نبی کے کہ وہ عام ہے۔ کتاب لائے نہ لائے۔ رسول کے لیے کتاب لانا شرط ہے۔ اسی طرح رسول کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جو صاحب کتاب ہو یا سابقہ شریعت کے بعض احکام کو منسوخ کر دے“ (فیصلہ صفحہ ۱۰۷-۱۰۸)

اس کے بعد فاضل حج نے لکھا :

”یہ تعریفیں چونکہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی نہ تھیں، اس لیے میں اس جستجو میں رہا کہ نبی یا رسول کی کوئی ایسی جامع تعریف مل جائے جو تصریحات قرآنی کی رو سے تمام لوازم نبوت پر حاوی ہو۔“ (صفحہ ۱۰۷)

اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ انہوں نے اس باب میں کافی جستجو کی۔ لیکن نبی کی کوئی جامع تعریف انہیں نہ مل سکی۔ آخر کار ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان ”میکانجی اسلام“ از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز میری نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے مذہب اسلام کے متعلق آجکل کے روشن ضمیر طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں

نبوت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جاسکتی۔ اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس

لئے میں ان کے الفاظ میں ہی اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں (صفحہ نمبر ۱۰)

اذن بعد انہوں نے میرے اس مضمون سے، خاصہ مفصل اقتباس درج کیا اور نبی کی جو تعریف میں نے پیش کی تھی اس پر مبنی بحث کے بعد اپنے فیصلہ میں کہا:

مدعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے۔ لہذا اس کے ساتھ مدعیہ کا

نکاح تاریک ارتداد مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے۔ (صفحہ ۱۸۲)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس مقدمہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے جیدہ علمائے کرام پیش ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کا بیان سینکڑوں صفحات پر مشتمل تھا۔ لیکن فاضل حج حقیقت نبوت کے متعلق ان میں سے کسی کے بیان سے بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ وہ مطمئن ہوئے تو میرے ایک ایسے مضمون سے جو اس مقدمہ سے بالکل الگ آزادانہ لکھا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ میرے مضمون کی وہ کون سی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ اس قدر اطمینان بخش اور قوی فیصلہ ثابت ہو گیا۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ میں نے مقام نبوت کی وضاحت قرآن کریم کی روشنی میں کی تھی اور خارج از قرآن بحثوں کو اس میں ذیل نہیں ہونے دیا تھا۔ یہی مسلک علامہ اقبالؒ کا بھی تھا۔ اور میرے دل میں ان کے احترام کی بنیاد بھی یہی ہے۔ انہوں نے اپنی

سب سے پہلی تصنیف — اسرار و رموز کے آخر میں بحضور رحمت اللعالمین ایک عرضداشت پیش کی ہے جس میں وہ بصد سوز و گداز کہتے ہیں:

گر دلم آئینہ بے جوہر است و بحر فم غیر قرآن مضمر است

تو

پیردہ ناموس حکرم چاک کن این خیاباں راز غارم پاک کن
اور انتہایہ کہ۔۔

۱۔ یہ اُس شخص کے متعلق ”عدالتی سند“ ہے جس کے خلاف ”منکر رسالت“ ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور ایسا کہنے والے نے کوئی جھجک محسوس کرتے ہیں، نہ ندامت۔ (طلوع اسلام)

روزِ محشر خواہ در سوا کن مرا بے نصیب از بوسہ پاکن مرا
اس کے برعکس

گردِ اسرارِ قرآن سفتہ ام با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیشِ خدائے عزوجل عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آپ بیسانم گہر گرداں مرا
اور اس کے بعد بھی وہ تمام عمر مسلمانوں سے یہی کہتے رہے کہ :-
گر تو می خواہی مسلمان زبستی نیست ممکن جز بقسراں زبستی

ختم نبوت کی ماہیت

ختم نبوت کی حقیقت و ماہیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ نبوت کہتے کسے ہیں۔ یہ موضوع بڑی فرصت چاہتا ہے جس کی اس وقت گنجائش نہیں۔ لیکن بایں ہمہ میں چند الفاظ میں اس کا ملخص پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ انسان، عقل و فکر، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ سے علم حاصل کرتا ہے۔ یہ ذرائع علم ہر شخص کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔ اس لئے جو شخص بھی چاہے اپنی صلاحیت اور محنت کے مطابق اکتسابِ علم کر سکتا ہے۔ لیکن علم کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جس میں انسان کی اپنی عقل و فکر اور سعی و کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ علم خدا کے ایک برگزیدہ بندے کو خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا تھا۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ جس منتخب ہستی کو یہ علم عطا ہوتا تھا اسے اس سے ایک دن پہلے تک بھی اس کا علم و احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے یہ علم عطا ہونے والا ہے۔ اس علم کو وحیِ خداوندی یا منزل من اللہ کہا جاتا تھا اور جس برگزیدہ ہستی کو یہ وحی عطا ہوتی تھی اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا جاتا۔ اس کی وحی کو خدا کی طرف سے عطا کردہ کتاب سے بھی تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ ہر نبی کو خدا کی طرف سے کتاب ملتی تھی۔ نبی اور رسول میں یہ فرق کہ رسول وہ ہوتا تھا جسے کتاب ملتی تھی اور نبی بلا کتاب آتا تھا، قرآنِ کریم کی تعلیم سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآنِ کریم نے انبیاء اور رسل دونوں کے متعلق کہا ہے کہ انہیں کتاب دی جاتی تھی۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے۔

فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَّ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأُتْرِلَ مَعَهُمُ الْكِتَابُ بِالْحَقِّ..... (۲/۱۳۳)

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا اور ان سب کو کتاب دی۔ دوسری جگہ سورہ مدیہ میں ہے کہ :-

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ (۵۶)

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام رسولوں کو کتاب ملی۔ ان آیات (اور انہی جیسی متعدد دیگر آیات) سے واضح ہے کہ ہر نبی اور ہر رسول کو خدا کی طرف سے کتاب ملتی تھی اور ”احادیث“ کا یہ کہنا کہ نبی بلا کتاب آتا تھا۔ قرآن کریم کی نصوص صریحہ کے خلاف ہے۔ واضح رہے کہ نبی اور رسول بھی الگ الگ نہیں ہوتے تھے۔ یہ ایک ہی ہستی کی دو خصوصیات تھیں۔ یوں کہنے کہ خدا کی طرف سے وحی پانے کی حیثیت سے اسے نبی کہا جاتا تھا اور اس وحی کو دوسروں تک پہنچانے کی حیثیت سے رسول۔ نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو گوشے تھے۔

خدا کی طرف سے وحی یا کتاب نازل ہونے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ تا آنکہ مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ زمانہ آگیا جب یہ سمجھا گیا کہ انسانی راہنمائی کے لیے جو کچھ خدا کی طرف سے دیا جانا مقصود و مطلوب ہے اسے نہایت واضح اور مکمل حیثیت سے آخری مرتبہ دے دیا جائے۔ چنانچہ یہ آخری وحی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی اور اسے قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ۔

وَكَمَلَتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ حَقًّا عَدْلًا لِّدَوْلَةٍ مُّبَدِّلٍ لِّكَلِمَتِهِ (۱۱۵)

”خدا کو جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا، جو کلام ان سے کرنا تھا، جو باتیں ان سے کرنی تھیں اس کتاب میں انہیں مکمل طور پر دے دیا گیا ہے۔ ان میں اب کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے ساتھ ہی یہ ضمانت بھی دے دی کہ:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۱۵)

”ہم نے اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ وحی تو خدا کی طرف انسانوں کے لیے راہنمائی کی خاطر آتی تھی۔ جب وہ راہنمائی مکمل اور غیر متبدل طور پر دے دی گئی اور قیامت تک اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا تو پھر وحی کی ضرورت کیا باقی رہی اور جب وحی کی ضرورت ہی نہ رہی تو پھر کسی نبی یا رسول کے آنے کا مقصد کیا! اسی حقیقت کو ختم نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسلام میں یہ نظریہ اس قدر صاف، واضح اور مستم تھا کہ مسلمانوں کو اس باب میں نہ کبھی کوئی شک گزرا، نہ الجھن پیدا ہوئی۔ امام اعظم کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے سچا ہونے کی نشانیاں دکھانے کے لیے مہلت چاہی۔ امام صاحب نے سنا تو فرمایا کہ جس شخص نے اس مدعی نبوت سے کوئی علامت بھی طلب کی وہ بھی کافر ہو جائے

گا کیونکہ اس سے مترشح ہو گا کہ اسے نبی اکرم کے آخری نبی ہونے کی بابت تردد ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرمایا لیجئے کہ ختم نبوت کا عقیدہ مسلمانوں میں کس قدر مستحکم اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھا۔ ختم نبوت کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اب انسان اس راہنمائی کی روشنی میں جسے قنیل قرآنی میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اپنے معاملات کا حل آپ دریافت کرے۔ واضح رہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان کو اب وحی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں رہی اور اب وہ تنہا اپنی عقل و فکر کی روش سے اپنے معاملات حل کر سکتا ہے۔ ایسا سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ انسانی عقل اسی طرح وحی کی محتاج ہے جس طرح انسانی آنکھ سورج کی روشنی کی محتاج۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر (بالخصوص اپنے خطبات میں) بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ وحی کی روشنی میں انسانی معاملات کا حل انفرادی طور پر نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ یہ ایک اجتماعی نظام کی روش سے ہو گا جسے خلافت علی منہاج نبوت کہا جاتا ہے۔ مزید سمجھنے کے لئے اسے قرآنی نظام مملکت کہہ لیجئے۔ یعنی مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت جس میں تمام کاروبار قرآن کریم کے عطا کردہ اصول و اقدار و قوانین کے تابع رہ کر سرانجام دیا جائے۔ اسی کو نظریہ پاکستان کہتے ہیں جسے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۱ء میں پیش کیا تھا۔



یہ سیاسی تحریک تھی

مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اسے ایک مذہبی مسئلہ کی حیثیت سے پیش کیا تاکہ مسلمان اسی الجھاؤ میں رہیں اور اس مقصد اور غایت کی طرف ان کی نگاہ ہی نہ اٹھنے پائے جس کے لئے یہ سارا ڈرامہ ایشیہ کیا گیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ تحریک ”احمدیت“ مذہبی تحریک ہے ہی نہیں۔ یہ ایک خالصتہً سیاسی تحریک ہے جسے انگریزوں کے حکومتی مصالح نے پیدا کیا ہے اور جسے عوام کو دھوکہ دینے کے لئے مذہبی نقاب اوڑھا دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انگریزوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کی تو اس کے خلاف انہیں سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کی طرف سے تھا۔ سیاسی طور پر تو اس لئے کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے سلطنت چھینی تھی اور مذہبی سطح پر اس لئے کہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھا کہ مسلمان غیر مسلموں کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرنا خلاف اسلام سمجھتے تھے اور ایسی حکومت کے خلاف جہاد کرنا اپنا دینی فریضہ۔ آپ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب (THE INDIAN MUSALMANS) اٹھا کر دیکھئے۔ اس نے اس حقیقت کو بڑے واضح و آشکار

الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اسی دینی جذبہ کے ماتحت حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید نے تحریک جہاد شروع کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی زمیں بھی اُسے ہی جراثیم کا فرما نظر آتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہابی تحریک کو گلوہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی بیان کرتا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان کے دین فروش علماء سے اس قسم کے فتاویٰ بھی حاصل کئے جن میں کہا گیا کہ انگریزوں کی اطاعت فرض ہے اور ان کے خلاف جہاد حرام۔ لیکن مسلمانوں پر ان فتاویٰ کا چنداں اثر نہ ہوا۔ ہمارے علماء کے فتاویٰ عام طور پر اپنی اثر انگیزی کھو چکے تھے۔ اس سلسلہ میں برطانوی سیاستدان اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمان صرف وحی سے متاثر ہو سکتا ہے اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں یہ بتایا جائے کہ ان پر خود خدا نے حکومت برطانیہ کی اطاعت فرض قرار دی ہے اور اس نے جہاد کو منسوخ اور حرام قرار دیا ہے۔ یہ تھا وہ پردہ جسے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۵ء میں یہ کہہ کر اٹھایا کہ:

مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں ”احمدیت“ کا موقف ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

(احمدیت اور اسلام۔ بحوالہ ختم نبوت اور تحریک احمدیت، پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۹۴)

اس تشریح میں انہوں نے کہا کہ :

مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے، صرف ایک چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے یعنی وحی کی سند۔ لہذا راسخ عقائد کو مؤثر طریق پر جڑ بنیاد سے اکھیڑنے اور مذکورہ بالا سوالات میں جو دینی نظریات مضمر ہیں ان کی ایک ایسی نئی تفسیر و تعبیر کرنے کے لئے جو سیاسی طور پر مفید مطلب ہو، یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس کی بنیاد وحی پر رکھی جائے یہ بنیاد ”احمدیت“ نے فراہم کر دی۔ خود ”احمدیوں“ کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو انہوں نے سر انجام دی ہے۔

(احمدیت اور اسلام۔ انگریزی ایڈیشن صفحہ ۱۲۶)

میں نے اس اجمال کی تفصیل اپنی کتاب ”ختم نبوت اور تحریک احمدیت“ میں مرزا غلام احمد صاحب کی تحریروں کی روشنی میں پیش کی ہے۔ انہی میں سے چند ایک میں اس وقت آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

مرزا صاحب کی خاندانی خدمات

انگریزوں کو اس مقصد کیلئے جس قسم کی شخصیت کی ضرورت تھی اس کے لئے اپنے آپ کو بطور ”امیدوار“

پیش کرتے ہوئے مرزا غلام احمد نے عرضداشت پیش کی کہ۔

میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔ میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں ایک وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا جن کو دربار گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخ ریسلین پنجاب میں ہے اور ۱۸۵۷ء میں انہوں نے اپنی ملاقت سے بڑھ کر سرکار انگریزی کو مدد دی تھی۔ یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانہ غدر کے وقت سرکار انگریزی کی امداد میں دیئے تھے۔ (کتاب البریہ - صفحہ نمبر ۳)

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

پھر میرے والد کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدمات سرکاری میں مصروف رہا اور جب ہتھوکی رہگزر پر مقصدوں کا سرکار انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکار انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک ہوئے۔ (ایضاً - صفحہ ۵)

ان "خدمات جلیلہ" کی روشنی میں، مرزا صاحب اس منصب کے لئے منتخب کر لیئے گئے اور انہوں نے مامورین اللہ ہونے کے دعوای شروع کر دیئے۔ انہوں نے پہلی ہی جست میں اپنے نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق بتدریج اس مقام پر پہنچے۔ ملہم ربانی، صاحب کشف والہام، محدث - مجدد - مسیح موعود، ظلی، بروزی، حلوی نبوت اور پھر آخر الامر مکمل نبوت اور رسالت - ایسا تدریجی پروگرام کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کی مصلحت خود انہی کی زبان سے سنئے۔ مرزا صاحب شروع میں عام مسلمانوں کی طرح یہی کہتے چلے آ رہے تھے کہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو آیات آئی ہیں ان میں حضرت عیسیٰ سے مراد وہی پیغمبر ہیں جو رسول اللہ سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ لیکن بعد میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ میں مسیح موعود ہوں اور ان آیات میں میرے ہی متعلق ذکر کیا گیا ہے۔ شروع کے بیانات اور اس دعویٰ میں اختلاف کیوں ہوا، اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

پیچ میں پھنسانے کے لئے

"یہ الہامات اگر میری طرف سے اس موقع پر ظاہر ہوتے جبکہ علماء مخالف ہو گئے تھے، تو وہ ہزار ہا اعتراض کرتے۔ لیکن وہ ایسے موقع پر شائع کئے گئے جبکہ یہ علماء میرے موافق تھے۔ یہی سبب ہے کہ باوجود اس قدر جوشوں کے، ان الہامات پر انہوں نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ ایک دفعہ ان کو قبول کر

چلے تھے اور سوچنے سے ظاہر ہو گا کہ میرے دعویٰ مسیح موعود ہونے کی بنیاد انہی الہات سے پڑی ہے۔
 انہی میں خدا نے میرا نام عیسیٰ رکھا اور جو مسیح موعود کے حق میں آیتیں تھیں وہ میرے حق میں بیان کر دیں۔ اگر علماء کو خبر
 ہوتی کہ ان الہات سے تو اس شخص کا مسیح ہونا ثابت ہوتا ہے تو وہ کبھی ان کو قبول نہ کرتے یہ خدا کی قدرت ہے کہ
 انہوں نے قبول کر لیا اور اس بیچ میں بھنس گئے۔“ (البعین نمبر ۲ - صفحہ ۲۱)

انگریزوں کی اطاعت

آپ نے غور فرمایا کہ بتدریج دعویٰ کرنے میں کیا مصلحت پنہاں تھی! یہ تو بہر حال ان کے دعوای کی سیرمیاں
 تھیں۔ لیکن ہر دعوے کی لم اور غایت ایک ہی تھی۔ یعنی یہ کہ انگریزوں کی اطاعت فرض ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے
 کہ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ (۱۶۵)۔ مرزا صاحب نے اس آیت کے لکھنے
 کے بعد تحریر کیا کہ

”اولی الامر سے مراد جسمانی طور پر بادشاہ اور روحانی طور پر امام الزمان ہے اور جسمانی طور پر
 جو شخص ہمارے مقاصد کا مخالف نہ ہو اور اس سے مذہبی فائدہ ہمیں حاصل ہو سکے وہ ہم
 میں سے ہے۔ اس لئے میری نصیحت اپنی جماعت کو یہی ہے کہ وہ انگریزوں کی بادشاہت کو
 اپنے اولی الامر میں داخل کریں اور دل کی سچائی سے ان کے مطیع رہیں۔“

(ضرورت الامام - صفحہ ۲۳)

علامہ اقبال ”ضربِ کلیم میں نفسیاتِ غلامی کے عنوان سے کہتے ہیں کہ :

سخت باریک ہیں امراض اُم کے اسباب کھول کر کہیے تو کتنا ہے بیاں کوتاہی
 دینِ شیریں میں غلاموں کے امام اور شیوخ دیکھتے ہیں فقط اک فلسفہٴ روباہی
 ہوا اگر قوت، فرعون کی درپردہ مُرید قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللہی

جہاد حرام ہے

اس طرح مرزا صاحب آہستہ آہستہ اُس مقام پر پہنچ گئے جس کے لئے یہ سارا ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ یعنی
 انہوں نے اعلان کر دیا کہ جہاد حرام ہے۔ انہوں نے کہا۔

”آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما دیا ہے کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ سواب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں“
(اربعین نمبر ۴ - صفحہ ۴۷)

اپنے اسی ”الہام“ کو نظم میں یوں بیان فرمایا کہ :-

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح، جو دیں کا امام ہے دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نور خدا کا نزول ہے اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(مندرجہ تبلیغ رسالت جلد نہم - صفحہ ۴۹)

گورنمنٹ کی خدمت میں درخواستیں

اس کے بعد ان کی ”نبوت کافر یعنی قرار پا گیا کہ وہ اس خیال کو عام کرتے رہیں کہ جہاد حرام ہے، جہاد حرام ہے۔ وہ یہ کرتے تھے اور ساتھ کے ساتھ اس کی اطلاع حضور گورنمنٹ برطانیہ کو دیتے رہتے تھے۔ مثلاً انہوں نے ۱۰ دسمبر ۱۸۹۴ء کو ایک اشتہار شائع کیا جس کا عنوان تھا ”اشتہار لائق توجہ گورنمنٹ جو جناب ملکہ معظمہ قیسرہ ہند اور جناب گورنر جنرل ہند اور لیفٹیننٹ گورنر پنجاب اور دیگر معزز حکام کے ملاحظہ کے لئے شائع کیا گیا“ اس میں انہوں نے کہا:-

”میں نے برابر سولہ برس سے یہ اپنے پر حق واجب ٹھہرایا ہے کہ اپنی قوم کو اس گورنمنٹ کی غیر خواہی کی طرف بلاؤں اور ان کو سچی اطاعت کی طرف ترغیب دوں۔ چنانچہ میں نے اس مقصد کے سرانجام کے لئے اپنی ہر اک تالیف میں یہ لکھنا شروع کیا کہ اس گورنمنٹ کے ساتھ کسی طرح مسلمانوں کو جہاد درست نہیں ہے“

دوسری جگہ لکھا ہے ۔

”میں نے خدا تعالیٰ سے یہ عہد کیا ہے کہ کوئی مبسوط کتاب بغیر اس کے تالیف نہیں کروں گا۔ جو اس میں احساناتِ قیصرہ ہند کا ذکر نہ ہو۔“

(نور الحق - حصہ اول صفحہ ۲)

وہ اپنی کتاب تریاق القلوب میں لکھتے ہیں :-

”میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنتِ انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہارات شائع کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اسٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔“

(صفحہ ۱۵)

چنانچہ وہ فخر یہ بیان کرتے ہیں کہ میری ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ :-

”لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلبہ خیالات چھوڑ دیئے جو تاہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمتِ ظہور میں آئی کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہ سکا۔“

(ستارہ قیصرہ - صفحہ ۳)

یہ تھا اس نبوتِ جدیدہ کا ماحصل۔ اقبال کس درد و سوز سے کہتے ہیں کہ :-

ہو بندہ آزاد اگر صاحبِ الہام	ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے ہمیز
اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی	ہو جاتی ہے خاکِ چینستانِ شرر آمیز
شاہیں کی ادا ہوتی ہے بیل میں نمودار	کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغِ مرغِ خیز
اُس مردِ خود آگاہ و خداست کی صحبت	دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے

غارتِ گمراہِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

(منزلِ کلیم ص ۵)

فریاد! مجھے مولوی ستاتے ہیں!

وہی خداوندی کی تاثیر سے توفی الواقعہ خاک چمنستان شرر آمیز اور بلبل ناتواں میں شاہین کی ادا نمودار ہو جاتی ہے لیکن ہمارے دور کے مدعی نبوت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ”حضور گورنمنٹ عالیہ کی خدمت میں عاجزانہ درخواست“ پیش کرتے ہیں جس میں کہتے ہیں کہ:-

”میں اس گورنمنٹ محسنہ کے زیر سایہ ہر طرح سے خوش ہوں۔ صرف ایک رنج اور درد اور غم مجھے لاحق ہے جس کا استغاثہ پیش کرنے کے لئے اپنی محسن گورنمنٹ کی خدمت میں حاضر ہوں اور وہ یہ کہ اس ملک کے مولوی، مسلمان اور ان کی جماعتوں کے لوگ حد سے زیادہ مجھے ستاتے اور دکھ دیتے ہیں۔“ (مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہشتم ص ۵۳)

انگریزوں کا خودکاشتہ پودا

اس کے بعد وہ سرکار عالیہ سے کہتے ہیں کہ ہم جو آپ کو مدد کے لئے پکارتے ہیں تو کچھ اپنی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ یہ اس پودے کی حفاظت کے لئے ہے جو خود آپ کے اپنے ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے نام اپنی درخواست مورخہ ۲۴ فروری ۱۸۹۵ء میں کہتے ہیں:-

”میری اس درخواست سے جو حضور کی خدمت میں مع اس لئے مریدین روانہ کرتا ہوں، متدعا یہ ہے کہ اگرچہ میں ان خدمات خاصہ کے لحاظ سے جو میں نے اور میرے بزرگوں نے محض صدق دل اور اخلاص اور جوش اور وفاداری سے سرکار انگریزی کی خوشنودی کے لئے کی ہیں، عنایت خاص کا مستحق ہوں۔ صرف یہ التماس ہے کہ سرکار دولت مدارہ . . . اس خودکاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم و احتیاط اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو ارشاد فرمائے کہ وہ بھی اس فائدان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھے . . . اس لئے کہ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو سرکار انگریزی کی نمک پروردہ اور نیک نامی حاصل کردہ موردِ مہراجم گورنمنٹ ہے۔“

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں :

”ہم نے جو اس گورنمنٹ کے زیر سایہ آرام پایا اور پارہے ہیں وہ آرام ہم کسی اسلامی گورنمنٹ میں بھی نہیں پاسکتے۔ ہرگز نہیں پاسکتے۔“ (ازالہ اوہام۔ ص ۵۰۹)

وہ اپنے اشتہار مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۹۷ء میں لکھتے ہیں :

”میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں نہ مدینہ میں، نہ روم میں نہ شام میں، نہ ایران میں، نہ کابل میں۔ مگر اس گورنمنٹ میں جس کے اقبال کے لئے میں دعا کرتا ہوں“

(مندرجہ تبلیغ رسالت۔ جلد ششم ص ۶۹)

وقت کی کمی کی بنا پر میں انہی اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔ جو احباب مزید تفصیل دیکھنا چاہیں وہ میری کتاب ”ختم نبوت اور تحریک احمدیت“ کا مطالعہ فرمائیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں، میں نے یہ بھی تفصیل سے بتایا ہے کہ مرزا صاحب نے کس طرح نبوت کا دعویٰ کیا، مسلمانوں کو کافر اور فاسق انداز اسلام قرار دیا اور اپنے متبعین پر مشتمل ایک نئی امت کی تشکیل کی۔ یہ نکتہ زیادہ اہم ہے اور اب میں اسی کے متعلق کچھ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

امت رسول کی نسبت سے متشکل ہوتی ہے

دنیا میں خدا کے ماننے والے عام ہوتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تخصیص و تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن ایک جداگانہ امت کی تشکیل اس رسول پر ایمان لانے سے ہوتی ہے جسے اس کے پیرو سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی سمجھیں۔ مثلاً ایک یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر کے تمام انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان لاتا ہے۔ لیکن یوں ہمہ وہ امت عیسوی کا فرد قرار نہیں پاتا۔ جس دن وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آتا ہے وہ قوم یہود کا فرد نہیں رہتا، عیسائی امت کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک عیسائی، رسول اللہ سے پہلے کے تمام انبیاء پر ایمان رکھتا ہے لیکن وہ امت محمدیہ کا فرد نہیں بنتا۔ جس دن وہ نبوت محمدیہ پر ایمان لے آتا ہے وہ عیسائی امت کا فرد نہیں رہتا۔ امت محمدیہ کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ اس اصول کے مطابق اگر کوئی شخص رسول اللہ کے بعد کسی نبوت پر ایمان لے آتا ہے تو وہ امت محمدیہ کا فرد نہیں رہتا اس لئے نبی کی امت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو ”رموز بے خودی“ میں بڑے

دلاویز انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے۔

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید ! دذرِ سالت در تنِ ما جاں دمد
حرفِ بے صوت اندرین عالم بدیم از رسالت مصرعہٴ موزوں شدیم
ماز حکمِ نسبت اُو ملتیم اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم
فرد از حقِ حلت ازوئے زندہ است از شعاعِ مہرِ او تابندہ است

از رسالت ہمنوا گشتیم

ہم نفس ، ہم مدعا گشتیم

مسلمان جو ایک جداگانہ اُمت کے فرد قرار پاتے ہیں تو خدا پر ایمان کی بنا پر انہیں بلکہ محمد رسول اللہ کی رسالت پر ایمان لانے کی بنیاد پر ایسا قرار پاتے ہیں۔ یہ اُمتِ محمدیہ کے فرد اسی صورت میں قرار پا سکتے ہیں کہ یہ حضور کو سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی سمجھیں۔ ختمِ نبوت کے معنی یہی نہیں کہ حضور کی ذاتِ گرامی پر نبوت ختم ہو گئی بلکہ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اب دنیا میں دین کی بنیادوں پر کوئی نئی اُمت وجود میں نہیں آ سکتی۔ حضرت علامہ اس باب میں فرماتے ہیں :-

پس خدا پر ما شریعت ختم کرد بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

اور اس ساری بحث کا نکتہٴ آخری یہ ہے :-

رونقِ ازما محفلِ آیامِ را اُو رسلِ را ختم و ما اقوامِ را

ساری بحث چار لفظوں میں ختم — اُو رسلِ را ختم و ما اقوامِ را — اسی حقیقت کو وہ بانگِ درا میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

بے خبر تو جو ہر آئینہٴ آیامِ ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

وہ ”احمدیت اور اسلام“ میں تحریر فرماتے ہیں :-

”ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا۔ لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی

یا ملت، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔“

خود مرزا غلام احمد بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب ”آئینہٴ کمالاتِ اسلام“ میں لکھتے ہیں :

”جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ اس دعویٰ میں ضرور ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرے اور نیز یہ بھی کہجے کہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے میرے پر وحی نازل ہوئی اور نیز خلق اللہ کو وہ کلام سنا دے جو اس پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور ایک اُمت بنا دے جو اس کو نبی سمجھتی ہو اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہو۔“ (ص ۳۲۳)

اسی بنا پر مرزا صاحب نے اپنے متبعین کو مسلمانوں سے الگ قرار دیا اور ان کی ایک نئی اُمت تشکیل کی اور ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں خود درخواست دے کر ان کا ایک الگ جماعت کی حیثیت سے شمار کرایا۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ مرزا صاحب نے اپنی الگ اُمت کیوں بنائی، اخبار الفضل نے لکھا:-

”کیا مسیح ناصری نے اپنے پیروؤں کو یہود بے بہود سے الگ نہیں کیا؟ کیا وہ انبیاء حق جن کے سوانح کا علم ہم تک پہنچا ہے اور ہمیں ان کے ساتھ جماعتیں بھی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنی جماعتوں کو غیروں سے الگ نہیں کر دیا؟ ہر ایک شخص کو ماننا پڑے گا کہ بے شک کیا ہے۔ پس اگر حضرت مرزا صاحب نے بھی جو کہ نبی اور رسول ہیں اپنی جماعت کو منہاج نبوت کے مطابق غیروں سے الگ کر دیا تو نئی اور انوکھی بات کون سی کی؟“

(الفضل بابت ۲۶ فروری - ۲ مارچ ۱۹۱۸ء)

انہوں نے، اپنی اُمت کو اُمت محمدیہ سے الگ بھی ایسے واضح اور نکھرے الفاظ سے کیا کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہ جائے۔ انہوں نے کہا کہ:

”خدائے تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک وہ شخص جس تک میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا ہے وہ مسلمان نہیں۔“

(ارشاد مرزا صاحب منقول از اخبار الفضل۔ بابت ۱۵ جنوری ۱۹۳۵ء)

میاں محمود صاحب اس سے بھی آگے بڑھے اور فرمایا کہ:

”کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوتے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا۔ وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔“

(آئینہ صداقت ص ۳۵)

مرزا صاحب کے دوسرے صاحبزادہ، بشیر احمد کہتے ہیں:

”ہر ایک شخص جو موتی کو مانتا ہے مگر عیسیٰ کو نہیں مانتا۔ یا عیسیٰ کو مانتا ہے مگر محمد کو نہیں مانتا۔ یا محمد کو مانتا ہے مگر مسیح موعود کو نہیں مانتا۔ وہ نہ صرف کافر بلکہ پتہ کا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔“ (حکمتہ الفضل۔ مصنفہ صاحبزادہ بشیر احمد)

جب مسلمان، دائرہ اسلام سے خارج قرار پا گئے تو دین کی بنیادوں پر ان سے ہر قسم کے تعلقات بھی ناجائز ہو گئے۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز۔ ان کا جنازہ پڑھنا بھی ناجائز۔ مرزا صاحب نے خود اپنے بیٹے (فضل احمد) کا جنازہ بھی اس لئے نہ پڑھا کہ وہ ”غیر احمدی“ تھا۔ اور جو ہمدردی ظفر اللہ خان صاحب، قائد اعظمؒ کے جنازہ کی نماز میں بھی اسی لئے شریک نہ ہوئے، غیر مسلموں کے ساتھ ایک طرف الگ کھڑے رہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے ساتھ رشتوں ناطوں کا تعلق ہے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی لڑکیاں لی تو جاسکتی ہیں انہیں لڑکیاں دی نہیں جاسکتی۔ مرزا محمود صاحب نے کہا تھا کہ اس باب میں ان کی پوزیشن، ہندوؤں اور سکھوں جیسی ہے کہ ان کی لڑکیاں بھی لی جاسکتی ہیں۔ انہیں لڑکیاں دی نہیں جاسکتیں۔ (الفضل۔ ۱۷ جولائی ۱۹۲۲ء)

انہی فیصلوں کی رو سے، صاحبزادہ بشیر احمد نے لکھا کہ :

”غیر احمدیوں سے ہماری نمازیں الگ ہو گئیں۔ ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا۔ ان کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے جو ہم ان کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں۔ دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک دینی دوسرے دنیوی۔ دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادت کا اکٹھا ہونا ہے اور دنیوی تعلق کا بھاری ذریعہ رشتہ و ناطہ ہے۔ سو یہ دونوں ہمارے لئے حرام قرار دے دیئے گئے ہیں۔“ (حکمتہ الفضل)

الگ قوم قرار دی جائے

علامہ اقبالؒ نے ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں یہ تحریک اٹھائی اور تجویز یہ کیا کہ :-

”میری رائے میں حکومت کے لئے بہترین طریقہ کار یہ ہو گا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہو گا اور مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لے گا جیسے وہ باقی اہل مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔“ (احمدیت اور اسلام)

میں نے جو اقتباسات آپ حضرات کے سامنے پیش کئے ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ مرزا غلام احمد کے متبعین روزِ اقل سے اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ اُمت تصور کرتے تھے۔ وہ اس تصور کی عام نشر و اشاعت بھی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو کہتے مسلمان ہی تھے۔ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ اس کے متعلق، علامہ اقبالؒ نے کہا تھا :-

”اس امر کے سمجھنے کے لئے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے مفاد کے ان کی موجودہ آبادی جو چھپتین ہزار ہے، انہیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس لئے انہیں سیاسی اقلیت کا بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالس قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہو سکتی۔“

(احمدیت اور اسلام)

ان لوگوں کی اسی دورِ غمی پالیسی کے پیش نظر انہوں نے (علامہ اقبالؒ نے) کہا تھا کہ، بہائیت، قادیانیت سے زیادہ دیانت دار ہے کہ انہوں نے اگر دعویٰ نبوت کیا ہے تو اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ اُمت قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے حکومت سے کہا یہ تھا کہ وہ اس معاملہ کو یکسو کر دے اور جس بات کو یہ الگ اپنے عقیدے کے طور پر اختیار کئے ہوئے ہیں (یعنی مسلمانوں سے ایک الگ اُمت) اسے قانونی حیثیت دے دیں۔ انگریزی حکومت نے اس تجویز کو قابل قبول نہ سمجھا کیونکہ یہ خود ان کے مصالح اور مقاصد کے بھی خلاف جاتی تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی مسلمانوں نے اس مطالبہ کو مستعین طور پر پیش نہ کیا، یا یوں کہئے کہ یہ آواز شور و غوغا میں گم ہو جاتی رہی۔ البتہ طلوعِ اسلام اسے متعین طور پر دہراتا رہا تا آنکہ ستمبر ۱۹۷۴ء میں اس نے قانونی شکل اختیار کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا سہرا بالواسطہ حضرت علامہؒ ہی کے سر بندھتا ہے۔

فدا رحمت کندا میں عاشقانِ پاک طینت را

لاہوری "احمدی"

لاہوری "احمدی" یہ کہہ کر لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتے۔ مسیح موعود مانتے ہیں اور یہ ایسا دعویٰ نہیں جس کے نہ ماننے سے کوئی مسلمان کافر قرار پا جائے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو کافر نہیں کہتے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قادیانیوں کے ساتھ ہمیں بھی کیوں دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے۔

مرزا صاحب نے مسیح موعود ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ اور انہوں نے کون سا دعویٰ نہیں کیا تھا؛ ملہم۔ مامور من اللہ۔ محدث۔ مجدد۔ مہدی۔ ظلی۔ بروزی۔ علوی۔ حقیقی نبی۔ محمد کا اوتار۔ خود محمد۔ کرشن گوپال وغیرہ۔ انہوں نے ان کے دعویٰ مسیح موعود کے منکرین کے متعلق کہا :-

"کفر دو قسم پر ہے۔ ایک کفر یہ ہے کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا ہے اور آنحضرت کو رسول نہیں مانتا۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسول نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے۔ پس اس لئے کہ وہ خدا اور رسول کے فرمان کا منکر ہے، کافر ہے اور اگر خود سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔"

(حقیقتہ الوحی - ص ۱۷۱)

آپ دیکھیں گے کہ لاہوری "احمدی" حضرات مرزا صاحب کی اس عبارت کو بھی پیش نہیں کریں گے۔ یہ تو رہا مرزا صاحب کو مسیح موعود نہ ماننے والوں کے متعلق کہ وہ کافر ہیں۔ اب مرزا صاحب کا خود اپنے متعلق فتویٰ بھی سن لیجئے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے جہاد بالسیف کو منسوخ قرار دیا اور اسے حرام بتایا۔ جہاد بالسیف قرآن کریم کا جس قدر اہم حکم ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں قرآن کے کسی حکم کو منسوخ قرار دینے والے کے متعلق مرزا صاحب کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اپنی کتاب ازالہ اوہام میں لکھتے ہیں۔

"ہم پختہ یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن شریف خاتم کتب سماوی ہے۔

اور ایک شعشعہ یا نقطہ اس کی شرائع اور حدود اور احکام اور ادا و امر سے زیادہ نہیں ہو سکتا نہ کم ہو سکتا ہے اور اب کوئی ایسی وحی یا الہام منجانب اللہ نہیں ہو سکتا جو احکام فرقانی کی ترمیم

تسلیخ یا کسی ایک حکم کی تبدیلی و تغیر کر سکتا ہو۔ اور اگر کوئی ایسا خیال کرے تو وہ ہمارے نزدیک جماعتِ مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر ہے۔“ (ص ۱۳۸۔ بحوالہ پیغام صلح۔ بابت ۵، دسمبر ۱۹۷۲ء)

اب آپ سوچئے کہ مسلمانوں نے اگر مرزا صاحب کو دائرۃ اسلام سے خارج قرار دیا ہے تو یہ خود مرزا صاحب کے فیصلے کے مطابق ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بحث ہی بیکار ہے کہ لاہوری جماعت مرزا صاحب کو کیا مانتی ہے اور قادیانی (دُلبوی) جماعت کیا؟ لاہوری جماعت کا یہی کہنا ہے نا، کہ مرزا صاحب کو نبی تو ربوہ والے مانتے ہیں۔ ہم انہیں ایسا نہیں مانتے۔ اس لئے ربوہ والوں کے ساتھ ہمیں بھی دائرۃ اسلام سے خارج کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک جو لوگ مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں انہیں دائرۃ اسلام سے خارج قرار دیا جانا درست ہے۔ لیکن ٹھہریئے۔ یہ بھی فریبِ دہی کی ایک اور شکل ہے۔ لاہوری ”احمدی“ قادیانیوں (اہل ربوہ) کو بھی دائرۃ اسلام سے خارج قرار دیئے جانے کے لیے تیار نہیں۔ جس زمانے میں یہ سوال زیرِ غور تھا کہ ”احمدیوں“ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو لاہوری جماعت نے اپنے اخبار ”پیغام صلح“ کی اشاعت بابت ۳۰ مئی ۱۹۷۳ء میں لکھا تھا۔

”ان حالات میں اول تو کسی جماعت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا صحیح نہیں۔ اور اگر اس شوق کو پورا ہی کرنا ہے۔۔۔۔۔ تو کم از کم ”احمدیوں“ کے اس گروہ کو اس سے مستثنیٰ کرنا ضروری ہے جو حضرت فاطمہ النبیین کے بعد کسی بھی نبی کے آنے کے قائل نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے حق میں ہیں۔ ہمارے نزدیک قادیانی ہو یا غیر قادیانی ہر کلمہ گو مسلمان ہے۔ اس کو غیر مسلم قرار دینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں؟

آپ نے دیکھا کہ قادیانی اور لاہوری اصل میں دونوں ایک ہیں۔ ان کا باہمی نزاع، جنگِ زردگری سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ میں نے اسی بنا پر تجویز کیا تھا کہ قانون یہ پاس ہونا چاہیے کہ مرزا غلام احمد کو مسلمان سمجھنے والا دائرۃ اسلام سے خارج ہے۔



مقامِ نبوت

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۵ء میں جو تجویز پیش کی تھی کہ مرزا

غلام احمد کے متبعین کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور جسے قانونی حیثیت ستمبر ۱۹۴۷ء میں مملکت پاکستان میں دی گئی۔ وہ کس قدر مبتنی بر حقیقت اور خود مرزا صاحب کے مسلک کے عین مطابق تھی۔ لیکن قطع نظر، ان قانونی مباحث کے، مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت نے خود منصب نبوت کی اس قدر تذلیل کی ہے جس کے تصور سے روح کا نبی اٹھتی ہے۔ انہوں نے نبوت جیسے بلند و بالا منصب کو، جو شرف و مجد انسانیت کی معراج کبریٰ ہے، انتہائی پست سطح پر لا کھڑا کر دیا۔ میں نے شروع میں بتایا ہے کہ بہاول نگر کے ڈسٹرکٹ جج محمد اکبر مرحوم نے اپنے فیصلہ میں کہا تھا کہ انہوں نے مقام نبوت کو میرے ایک مضمون سے سمجھا اور اسی بنا پر اپنا فیصلہ صادر کیا۔ میں نے اس کے بعد مقام نبوت کے متعلق اپنی کتاب، معراج انسانیت، میں بڑی شرح و بسط سے لکھا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ میں اس سلسلہ میں اس کا ایک اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میں نے اس میں لکھا ہے :-

”نبوت کا مقام اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تصور سے روح میں بالیدگی، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا، قلب میں روشنی، خون میں حرارت، بازوؤں میں قوت، ماحول میں درخشندگی، فضا میں تابندگی اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ نئی کا پیغام انقلاب آفریں دین و دنیا کی سر فرازیوں اور سر بلندیوں کا امین ہوتا ہے۔ وہ مردوں کی بستی میں صوبہ اسرافیل پھونک دیتا ہے اس سے قوم کے عروج و مغلوبہ میں پھر سے خون حیات رقص کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی ملت کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے اور ان کے ایک ہاتھ میں زمین کی خلافت اور دوسرے میں آسمان کی بادشاہت دے دیتا ہے۔ وہ اپنی ہوش ربا تعلیم اور محیر العقول عمل سے باطل کے تمام نظام ہائے کہنہ کی بنیادیں اکھیر کر آئین کائنات کو ضابطہ خداوندی پر متشکل کر دیتا ہے۔ اس سے زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ آرزوئیں آنکھیں ملتی ہوئی اٹھتی ہیں۔ دلوں لے جاگ پڑتے ہیں۔ ایمان کی حرارتیں دلوں میں سوز اور جگر میں گداز پیدا کرتی ہیں۔ روح کی سرتوں کے چشنے اُبلتے ہیں، قلب و جگر کی نورانیت کی سوتیں ٹھوٹتی ہیں۔ تازہ اُمیدوں کی کلیاں مہکتی ہیں۔ زندہ مقاصد کے غنچے چمکتے ہیں اور اس خوش بخت قوم کا صحن چین، دامان صدیا غیاں و کعب ہزار گل فروش کا فردوسی منظر پیش کرتا ہے۔ حکومت الہیہ کا قیام اس کا نصب العین اور قوانین خداوندی کا نفاذ اس کا منتہی ہوتا ہے جب اس کے ہاتھوں خدا کی بادشاہت کا تخت اجلال پچھتا ہے تو باطل کی ہر طاغوتی قوت

یہاڑوں کے غامدوں میں منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ جو رواستیداد کے قصرِ فلک بوس کے کنگورے
سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ طغیان و سرکشی کے آتش کدے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں
کی قذوسی جماعت کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے باہر نکلتا ہے تو فتح و ظفر اس کی رکاب چوتی
ہے۔ شوکت و حشمت اس کے جلو میں چلتی ہے۔ سرکش اور خود پرست قوتیں اس کے خدائے واحد
القدر کا کلمہ پڑھتی ہیں اور خدا اور اس کے فرشتے ان انقلابِ آفریں ملکوتی کارناموں پر تحسین و
تبریک کے پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی۔“

یہ تھا مقامِ نبوت جسے شمعِ قرآنی سے اکتسابِ ضیاء کے بعد میں نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد ہمارے
سامنے ایک مدعیِ نبوت آتا ہے جس کی ساری عمر انگریزوں جیسی ایلیسی سیاست کی حامل قوم کی غلامی کی تلقین و تاکید
میں گزر جاتی ہے۔ وہ لیفٹیننٹ گورنر بہادر کو درخواستوں پر درخواستیں گزارتا ہے کہ میں نے آپ کی اس قدر خدمت
کی ہے، آپ اس کے صلہ میں میری حفاظت بھی کریں اور خصوصی مراعات سے بھی نوازیں! سوچئے عزیزانِ من! کہ اس
سے نبوت کو کس مقام پر لے آیا گیا ہے؟ یہی وہ احساس تھا جس سے تڑپ کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

فتنہ ملت بیضی ہے امامت اس کی

جو مسلمان کو سلاطین کا پرستار کرے

مقامِ نبوت کے تعارف کے بعد میں نے اپنی مذکورہ صدر کتاب میں لکھا تھا:-

”مقامِ نبوت تو ایک طرف، شمعِ نبوی سے اکتسابِ ضیاء کرنے والے مردِ مومن کی کیفیت یہ ہوتی
ہے کہ اس کی نگاہوں سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں ایک اللہ کے سوا کسی کا خوف اس کے دل
میں نہیں پہنچ سکتا۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اس کی شمشیرِ جگر وار کے سامنے لرزہ برآمد ہوتی ہیں۔
اس کی قوتِ بازو حکومتِ خداوندی کے ممکن و بقا کی ضامن ہوتی ہے۔ وہ قوانینِ خداوندی کا
عملاً نفاذ کرتا ہے۔ یہ وہ ”مجدد“ ہوتا ہے جس کی قوتِ ایمانی اور بصیرتِ فرقانی سے

محمد رسول اللہ والذین معہ کے عہدِ سعادت مہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔
یہ وہ ”مسیحا“ ہوتا ہے جس کے اعجازِ نفس سے مردہ قوم میں از سر نو زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔
یہ وہ ”مہدی“ ہوتا ہے جو خود اللہ کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر ساری دنیا کے لئے ہدایت و
رشادت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ مرکز ہوتا ہے جس کے گرد ایسی جماعت کا دائرہ کھنچ جاتا ہے

جس کے متعلق فرمایا کہ۔

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ
يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ كُوفَةً لَا يَأْتِيهِمْ (۱۵۵)

”اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے۔ وہ مومنوں کے سامنے جھکے ہوئے اور مخالفین کے مقابل میں غالب ہوتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے۔“

مؤمنین کی جرأتِ ایمانی

حضراتِ انبیاء کرام کا مقام تو ایک طرف رہا، عام مؤمنین کی جرأتِ ایمانی کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اس کے لئے خود قرآن کریم نے ایک واقعہ درج کیا ہے جو عبرت و معظمت کی ہزار داستانیں اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب ساحرین دریا پر فرعون نے صداقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر خدا پر ایمان کا اعلان کر دیا تو فرعون نے بجلی کی سی کڑک اور شیر کی سی دھاڑ کے ساتھ کہا کہ تمہیں یہ جرأت کس طرح سے ہو گئی کہ میری اجازت کے بغیر ایمان کا اعلان کر دو! تم دیکھو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میں تمہیں حوالہ دار و رسن کر دوں گا اور تمہارے ایک ایک حصہ بدن کو کٹوا کر الگ کر دوں گا۔ ان مؤمنین نے (جنہیں ایمان لائے ابھی چند ثانیے ہی گزرے تھے) اس قہر آلود دھمکی کو نہایت سکون و سکوت کے ساتھ سنا اور ایک بستمِ زیر لب کے ساتھ کہا —

كَافِقُضْ مَا أَنْتَ قَاضٍ (پنچ)۔ جو تیرے جی میں آئے کر لے۔ اِنَّا أَمَنَّا بِرَبِّنَا، ہم اپنے رب پر ایمان لے آئے ہیں اور پھر تو ہمارے ساتھ کر بھی کیا سکتا ہے۔ اِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (نک) تیرا دائرہ اختیار ہماری اسی دنیاوی زندگی تک ہے اور زندگی تو یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ آگے بھی بڑھتی ہے۔ اور اُس دائرے تک تجھے رسائی ہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تو ہمیں ڈرنا کس بات سے ہے!

یہ ہوتی ہے مؤمنین کی جرأتِ ایمانی! اس کے برعکس اس مدعی نبوت کی ”جرأتِ ایمانی“ کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگائیے۔ مرزا صاحب نے جب اپنے ان الہامات کی نشر و اشاعت کی جن میں اپنے مخالفین پر خدا کے عذاب کی وعید تھی تو بٹالہ کے مولوی محمد حسین (مرحوم) نے ان کے خلاف زیر دفعہ (۱۰۷) تعزیراتِ ہند، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، گورداسپور کی عدالت میں استغاثہ دائرہ کر دیا۔ دفعہ (۱۰۷) کے تحت اگر مجرم ثابت بھی ہو جائے تو سزا پھانسی

نہیں ہوتی، ضمانتیں ہو جاتی ہیں۔ لیکن مرزا صاحب کی ”جرات“ ایمانی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے عدالت میں معافی نامہ داخل کر دیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

”میں، مرزا غلام احمد قادیانی بحضور خداوند تعالیٰ باقرار صالح اقرار کرتا ہوں کہ آئندہ :-

(۱) میں آئندہ ایسی پیش گوئی شائع کرنے سے پرہیز کروں گا جس کے یہ معنی ہوں یا ایسے معنی خیال کئے جائیں کہ کسی شخص کو (یعنی مسلمان ہو خواہ ہندو ہو یا عیسائی وغیرہ) ذلت پہنچے گی یا وہ موردِ عتابِ الہی ہوگا۔
(۲) میں خدا کے پاس ایسی اپیل (فریاد و درخواست) کرنے سے بھی اجتناب کروں گا کہ وہ کسی شخص کو (یعنی مسلمان ہو یا ہندو یا عیسائی وغیرہ) ذلیل کرنے سے یا ایسے نشان ظاہر کرنے سے کہ وہ موردِ عتابِ الہی ہے، یہ ظاہر کرے کہ مذہبی مباحثہ میں کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔

(۳) میں کسی چیز کو الہام بتا کر شائع کرنے سے مجتنب رہوں گا جس کا یہ منشاء ہو یا جو ایسا منشاء رکھنے کی معقول وجہ رکھتا ہو کہ فلاں شخص (یعنی مسلمان ہو، خواہ ہندو یا عیسائی وغیرہ) ذلت اٹھائے گا یا موردِ عتابِ الہی ہوگا۔۔۔۔

(۴) جہاں تک میرے احاطہ طاقت میں ہے میں تمام اشخاص کو جن پر کچھ میرا اثر یا اختیار ہے، ترغیب دوں گا کہ وہ بھی بجائے خود اس طریق پر عمل کریں جس طریق پر کار بند ہونے کا میں نے دفعہ علما و علماء میں اقرار کیا ہے۔

گواہ مشد

العید

خواجہ کمال الدین بی۔ لے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔

مرزا غلام احمد بقلم خود

دستخط۔ جے۔ ایم۔ ڈوٹی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ ۲۴ فروری ۱۸۹۹ء۔

سچ کہا تھا اقبالؔ نے کہ :-

میں نہ عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہ ہم
ہاں مگر عالمِ اسلام پر رکھتا ہوں نظر
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
فاش ہے مجھ پر ضمیرِ فلکِ نیلی فام
عصرِ حاضر کی شبِ تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تمام

وہ نبوت ہے مسلمان کے لئے برگِ حشیش

جس نبوت میں نہیں قوت و شوکتِ کبیرام

والسلام
پرویز

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

عزیزانِ گمراہی قدر - سلام و رحمت !

آپ نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہ آواز آپ کے کان میں مسلسل آتی رہی ہوگی کہ مسلمانوں میں اتحاد نہیں، اتفاق نہیں۔ ان میں انتشار ہے، تشتت ہے۔ یہ مختلف قوموں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مختلف مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں میں منقسم ہیں۔ اگر ان میں کہیں اتحاد پیدا ہو جائے تو یہ ساری دنیا پر چھا سکتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ سب پر غالب آسکتے ہیں۔ اس قسم کی آوازیں زمانہ حال ہی کی پیدا شدہ نہیں۔ یہ قصبہ صدیوں پرانا ہے۔ ہمارے اختلافات اور تفرقات کی داستان ہزار بارہ سو سال سے مسلسل آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ ان اختلافات کو مٹانے کی کوششیں بھی بہت ہوئیں۔ دور کیوں جاتیے! بھی پچھلی صدی میں جمال الدین افغانی بھسی شخصیت ہمارے سامنے آئی تھے۔ وہ ساری عمر نعل برائش، اسی اتحاد کا درد اور تڑپ سینے میں لئے مسلمانوں کے مختلف ممالک میں بگولے کا سارقص کرتے رہے۔ مسلسل سفر کی مشقتیں اٹھائیں۔ کہیں قید و بند کی صعوبات برداشت کیں۔ کہا جاتا ہے کہ آخر میں انہیں زہر تک بھی دے دیا گیا۔ بہر حال وہ ساری عمر اسی جدوجہد میں مصروف اور اسی ٹنگ و تاز میں سرگرداں رہے لیکن انہیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ مجھے اُن کی تحریک پان اسلامزم کے مالہ و ماعلیہ سے بحث نہیں۔ میرا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ان کی عمر بھر کی جدوجہد بلا نتیجہ ثابت ہوئی۔ بلکہ مسلمانوں کی مختلف مملکتوں کے اختلافات کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئے۔ ان کے بعد ہمارے دور میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ بھی اسی درد کو دل میں لئے ہوئے اُٹھے۔ انہوں نے بھی اپنی ساری عمر اسی آہ و فغاں میں بسر کر دی۔ آپ جواب شکوہ کو دیکھئے۔ وہ کس کسب و اذیت سے کہتے ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک ایک ہی سبکدانی، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، ستر اُن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں!

کیا زمانے میں پیپنے کی یہی باتیں ہیں؟

اُن کے شکوہ کا جو جواب ندائے جمال کی طرف سے ملا اُس میں اقبالؒ سے کہا گیا کہ تم نے مسلمانوں کی ذلت و پستی کی دروازہ بجز داستان بھی سنائی اور اس باب میں ہماری بے اعتنائی کا شکوہ بھی کیا۔ لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ :-

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلمان نابود ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟

دفع ہیں تم ہو نصاریٰ، تو مت دن میں ہندو یہ مسلمان ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

مروں تو ستید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو

تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!

یہاں تو انہوں نے مسلمانوں کی مختلف ذاتوں اور گوتوں کا ہی ذکر کیا ہے لیکن آگے چل کر انہوں نے اپنے اس پیغام کی آماجگاہ کو وسیع تر کرتے ہوئے دنیا بھر کے مسلم ممالک کو مخاطب کیا اور کہا :-

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے نیل کے ساحل سے لے کر تباہ خاک کا شہر

جو کہ یگا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا ترکِ خمر گا ہی ہو یا اعرابی والا گھر

یہ کچھ انہوں نے خضر راہ میں کہا اور اس سے لگے ہی سال، اپنی مشہور نظم طلوع اسلام میں انہوں نے خون کے آنسوؤں کے ساتھ کہا کہ :-

ہو سس نے کہ دیا ہے ٹھٹھے ٹھٹھے نزع انسان کو اخت کا بیاں ہو جا، محبت کی زبان ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی تو اسے شرمندہ ساحل، اُچھل کر بکراں ہو جا

غبار آلودہ رنگ و نسب میں بال پر تیرے

تو اسے مرغِ حرم اُٹنے سے پہلے پریشاں ہو جا

میں نے حضرت علامہؒ کے یہ چند اشعار مثال کے طور پر پیش خدمت کئے ہیں، ورنہ ان کا سارا کلام

اسی حقیقت کا ترجمان اور ان کا پیغام اسی نصب العین کا داعی ہے۔ لیکن بعدِ حسرت یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان

کی یہ آتش زواری بھی کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہ کر سکی۔ اور وہ یہ کہتے ہوئے دنیا سے رحمت ہو گئے :-

دیا اقبالؒ نے ہندی مسلمانوں کو سوزا پتا
یہ اک مرد تن آساں تھاتن آسانوں کے کام آیا

سوال یہ ہے کہ جب اختلاف و افتراق کے نقصانات کا بھی سب کو احساس ہے اور مسلمانوں کی سترستی کم و زیادہی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جو آپس کے اتحاد و استلاف کی ضرورت اور اس کی وجہ کیا ہے؟

اہمیت کا قائل نہ ہو، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان میں یہ اتحاد پیدا نہیں ہوتا؟
اس ضمن میں دردمندان ملت کی تمام کوششیں کیوں بے نتیجہ رہتی ہیں؟

یہ وہ سوال ہے جو ہر دلِ درد مند میں بار بار اٹھتا ہے اور پھر کوئی جواب نہ پا کر کاشانہ قلب میں بعد حسرت و یاس واپس لوٹ جاتا ہے۔ اسی سوال کا جواب میرے آج کے خطاب کا مرکز ہی خیال ہے۔

آج جہاں ہر شخص مسلمانوں کے اختلافات کا شکوہ سنا کر اور ان کے افتراق کا نوحہ خواں ہے، وہاں ہر فرد اس حقیقت کا معترف بھی ہے کہ اسلام کے صدرِ اول میں اُمت میں کامل اتحاد ہی نہیں بلکہ وحدت تھی، مسلمانوں میں کسی قسم کا اختلاف اور افتراق نہیں تھا۔ اس اتحاد کے لئے اُن کے جسم ہی آپس میں ملے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ، قرآنِ کریم کے الفاظ میں، ان کے دل بھی ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان میں ایسی وحدت کس طرح پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس کے بعد وہ کون سا عنصر تھا جس کے نہ رہنے سے یہ وحدت اس طرح پارہ پارہ ہو گئی کہ وہ پھر دوبارہ آج تک پیدا نہ ہو سکی۔ اگر ہم اس کھوئی ہوئی حقیقت کو تلاش کر لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے اپنے مزمن مرض کی صحیح تشخیص نہ کی ہے اور ظاہر ہے کہ صحیح تشخیص کے بعد مرض کا علاج ممکن ہو جاتا ہے۔ آئیے ہم اس اصل و بنیاد کی تلاش کے لئے بقلبِ سلیم، تاریخ کی راہوں پر چڑھ سو منازلِ تیجھے کی طرف لڑیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام، مذہب نہیں دین تھا۔ مذہب میں مقصود ہر شخص کی انفرادی نجات ہوتا ہے جس کے لئے وہ انفرادی طور پر کچھ رسوم بجالاتا اور مذہب کے بتائے ہوئے نیک کام کرتا ہے۔ اس میں اجتماعیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر شخص اپنے اپنے طور پر ہر مقام پر اور ہر قسم کے حالات میں مذہب پر کاربند رہ سکتا ہے۔ اس کے برعکس، دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہوتا ہے۔ اس اجتماعی نظام کو قائم کرنے کے لئے ایک اُمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ افراد، جو دین کے نظریہ یا ایڈیٹوریالوجی کی صداقت کو بطیب خاطر تسلیم کرتے ہیں، وہ انفرادی زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ اس اُمت کے اجزاء بن

جاتے ہیں۔ یہ جو آج کل آپ عام طور پر سُننے چلے آ رہے ہیں اور سُننے رہتے ہیں کہ اسلام میں قومیت کا مدار ایمان کا اشتراک ہے تو اس کے یہی معنی ہیں۔ اس پوری کی پوری اُمت کا نصب العین حیات بھی ایک ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لئے راستہ بھی ایک۔ اسے وحدتِ فکر و عمل کہتے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ اللہ علیہ وسلم نے اسی معیار اور منہاج کے مطابق ایک اُمت کی تشکیل کی تھی۔ یہی وہ اُمت تھی جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے کہا تھا۔ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لَّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔ (۳۱) اس آیتِ جلیلہ میں بین اہم حقیقتوں کا بیان ہے۔ پہلی یہ کہ مسلمان مختلف افراد نہیں تھے بلکہ ایک اُمت تھے۔ دوسری حقیقت یہ کہ اس اُمت کا وجود خود اپنی منفعت ہی کے لئے نہیں تھا، اس کا فریضہ یہ تھا کہ یہ اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرے۔ اسی اعتبار سے اسے اُمتِ وسطیٰ کہا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اُمت دنیا کی ہر قوم کے لئے یکساں فاصلے پر ہوگی، جس طرح دائرے کا مرکز اس کے محیط کے ہر نقطہ سے یکساں فاصلے پر ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے دوسری جگہ کہا گیا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۹) ”تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوح انسان کی بہبود و منفعت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور میری حقیقت یہ کہ خود اس اُمت کی بھی ایک مرکزیت ہوگی۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی۔ حضور کا منصب یہ تھا کہ وہ اس اُمت کے اعمال کی نگرانی کریں۔ یہ تھا اس اُمت کا منہاج اور طریقِ کار۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا نقطہ اتصال تھا جس نے ان افراد کو ایک اُمتِ واحدہ کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ بُنْيَانُ مَرْحُوصٍ یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح۔ (۱۱) قرآنِ کریم نے اس حقیقت کی ان الفاظ میں وضاحت کر دی کہ وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔ (۱۲) یعنی ان کی وجہِ جامعیت ”اعتصام بحبل اللہ تھی“۔ حبل اللہ کے لفظی معنی ”اللہ کی رسی“ کے ہیں اور اس سے مقصد خدا کی کتاب قرآنِ کریم ہے۔ حبل اللہ یا رسی کی تشبیہ سے بات بڑی واضح ہو جاتی ہے۔ بہارِ دُجھاڑو کے سینکڑوں تنکے ایک تنگے یا رسی سے بندھے ہوتے ہیں۔ جو کام ان تنکوں کو باہم دگر پیوست رکھنے میں جھاڑو کی رستی کماتی ہے وہی کام مختلف افراد کو اُمتِ واحدہ بنانے کے لئے اللہ کی رسی یعنی اس کی کتابِ سرانجام دیتی ہے۔ یعنی خدا کی کتاب وہ ضابطہ حیات تھی جو ان مختلف افراد کی باہم دگر پیوستگی کا ذریعہ تھی۔ لیکن کتابِ لوح و قلم کا مجموعہ ہوتی ہے اور مجرد (ABSTRACT)

الفاظ مختلف افراد کے لئے وجہ جامعیت نہیں بن سکتے۔ اس کے لئے کسی محسوس اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو ان افراد کو یکجا رکھ سکے اور ان کے اختلافی معاملات میں حکم بن جائے۔ یہ محسوس اتھارٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی۔ قرآن کریم نے افراد امت کے مومن ہونے کے لئے شرط ہی یہ بتائی تھی کہ

وہ اس سنٹرل اتھارٹی کے فیصلوں کو بطیب خاطر قبول کریں۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے۔ **رَسُولُ اللَّهِ كَمَا مَنُوبٌ**

فَمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۱۶)

”تیسرا یہ اس حقیقت پر مشاہدہ ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکے جب تک ان کی حالت یہ نہ ہو کہ یہ اپنے ہر اختلافی معاملے میں تجھے اپنا حکم تسلیم کریں اور اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہو کہ میرے فیصلے کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرائی محسوس نہ ہو۔ یہ اُسے بطیب خاطر قبول کریں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔“ افراد امت کے مومن ہونے کے لئے تو یہ شرط عاید کی گئی اور دوسری طرف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ **فَا حْكُمُوا بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ** (۱۷) ”تم ان کے اختلافی معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔“ دوسرے مقام پر اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی گئی۔ **وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكِّمُوا إِلَى اللَّهِ** (۱۸)۔ ”تمہارے تمام اختلافی امور کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہونا چاہئے۔“ ان تصریحات کی روشنی میں اُس اجتماعی نظام کا پورا پورا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے جسے قائم کرنے کے لئے یہ امت وجود میں لائی گئی تھی اور جس سے خود اس امت کی وحدت قائم رہتی تھی، یعنی :-

۱۔ ان افراد کے فکر و عمل کا مرکز قرآن مجید

۲۔ لیکن قرآن مجید کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں بلکہ ایک جمعی جاگتی اتھارٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اجتماعی طور پر۔ اس اتھارٹی کے لئے جمعی جاگتی ہونے کی شرط نہایت اہم اور لاینفک ہے۔

یہی ہے وہ محور جس کے گرد اسلامی نظام گردش کرتا ہے۔ اور یہی ہے وہ نقطہ ماسکہ **زنده اتھارٹی**

جس سے امت کی وحدت قائم رہتی ہے۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے۔ اس میں اطاعت کے لئے **وَأَسْمِعُوا** بنیادی شرط ہے۔ یعنی احکام کا سننا، اور ان کی اطاعت کرنا۔ سورۃ تغابن میں ہے **فَاسْمِعُوا**

وَأَطِيعُوا (۱۹)۔ ”احکام کو سنو اور ان کی اطاعت کرو۔“ سورۃ انفال میں ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنَّا وَانْتُمْ تَسْمَعُونَ** (۲۰) ”اے جماعت مومنین! لے

اُمتِ مسلمہ۔ تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو۔ درآن حالیکہ تم اس کے احکام کو سن رہے ہو۔“ اور مومنین کی طرف سے اس کا جواب آتا تھا۔ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (ہم نے سنا اور ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں۔) ان تصریحات سے واضح ہے کہ اطاعت کے لئے احکامات کا تئنا بنیادی شرط ہے اور احکامات وہی سنئے جاسکتے ہیں جو کسی زندہ اتھارنی طکی طرف سے دیئے جائیں۔ اس نقطہ کو عزیزانِ من! بڑھی اچھی طرح سے ذہن نشین فرملیجئے کہ یہی دین کی لم ہے۔ اطاعت کتابوں کی نو سے نہیں کی جاسکتی زندہ اتھارنی طکی نو سے کی جاسکتی ہے۔

اب آگے بڑھیئے۔

قرآن کریم میں قانون یا نظام کے الفاظ نہیں آئے کیونکہ یہ قرآن کریم کی اولین مخاطب قوم کے ہاں مروج نہیں تھے۔ اس نظام کو ”اطاعتِ خدا اور رسول“ کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی خدا کی اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے۔ قرآن مجید

اللہ اور رسول سے مراد

میں ”أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ“ کی جامع اصطلاح اسی مفہوم کی ادائیگی کے لئے آئی ہے۔ دورِ حاضرہ میں اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہہ کر پکارا جائے گا جو کتاب اللہ کی اطاعت کے لئے قائم کی گئی ہو واضح رہے کہ یہ مفہوم نہ میرا ایجاد کردہ ہے نہ دورِ حاضرہ کا وضع کردہ۔ ہمارے متقدمین کی تفسیروں میں اس سے یہی مفہوم لیا گیا ہے۔ وہ اس سنظل اتھارنی طکی کے لئے عام طور پر امام کا لفظ استعمال کرتے ہیں کیونکہ نظام کا لفظ ابھی ان کے زمانے میں بھی رائج نہیں ہوا تھا۔ ہمارے زمانے میں یہ اصطلاح رائج ہو چکی ہے اور عصرِ حاضر کی تفاسیر میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔ اس ضمن میں دو ایک مثالیں پیش خدمت ہیں۔ سورۃ الانفال کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ... (۱۵) لفظی ترجمہ ان الفاظ کا یہ ہے۔ ”اے رسول! لوگ تم سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو! کہ مالِ غنیمت دراصل اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔“ اس کی تشریح کرتے ہوئے (مولانا) ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:-

”مالِ غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ یعنی یہ بات نہیں

ہونی چاہیے کہ جو جس کے ہاتھ میں پڑ گیا وہ اسی کا ہو گیا۔ بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش

کرنا چاہیئے۔ وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا۔“

مولانا آزاد نے یہاں ”اللہ اور رسول“ کے لئے متقدمین کے اتباع میں، امام کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن

اگلے ہی صفحے پر یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی ہے کہ :-

”قرآن حکیم نے حکم دیا ہے کہ مالِ غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے، حکومت (یعنی اسٹیٹ) کا ہے۔“

(ترجمان القرآن - جلد دوم - صفحہ ۵۴، ۵۳)

اب دوسری مثال لیجئے۔ سورۃ المائدہ میں ہے۔ اِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ
وَيُكْفَرُوْنَ فِي الْاَمْرِ ضَرْبٌ فَاْدَا... (۳۳) ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یہ دیا ہے :-
”جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے جنگ دو کر تے پھرتے
ہیں کہ فساد برپا کریں... (ان کی سزا یہ ہے کہ....)
اس ترجمے پر وہ حسب ذیل حاشیہ لکھتے ہیں۔

زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی
حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسولؐ سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ
کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔۔۔ ایسا نظام جب کسی سر زمین
میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا۔۔۔ دراصل خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف
جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیرات ہند میں ہر اس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت
کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے ”بادشاہ کے خلاف لڑائی“ (WAG ING
WAR AGAINST THE KING) کا جرم قرار دیا گیا ہے۔“

(تفہیم القرآن - جلد اول - ایڈیشن ۱۹۵۱ء - ص ۴۶۵)

اس کے بعد مختلف سزائوں کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے حسب ذیل حاشیہ لکھا ہے :-
”یہ مختلف سزائیں بر سبیل اجمال بیان کر دی گئی ہیں تاکہ قاضی یا امام وقت اپنے اجتہاد سے
ہر مجرم کو اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی
شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کرنا بدتر
جرم ہے۔“ (ایضاً)

ان حوالوں سے آپ نے دیکھ لیا کہ یہ کہنا کہ ”اللہ اور رسولؐ“ سے مراد اسلامی نظام یا اسلامی حکومت
ہے، ایجادیندہ نہیں۔ اور تو اور خود مودودی صاحب بھی اس سے یہی مراد لیتے ہیں۔ میں نے مودودی صاحب

کا نام خاص طور پر اس لئے لیا ہے کہ یہ صاحبِ اوران کی جماعت میرے خلافت سب سے بڑا الزام یہ عاید کرتی ہے کہ میں "اللہ اور رسول" سے مراد اسلامی نظام لیتا ہوں اور اسی بناء پر یہ حضرات میرے خلافت منکر سنت ہونے کا پراپیگنڈہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کی عرض میں ذرا آگے چل کر عرض کر دوں گا۔ بہر حال بات یوں چلی آرہی تھی کہ قرآن کریم کی رو سے دین سے مراد ایک اجتماعی نظام ہے، اور اللہ اور رسول کی اطاعت سے مقصود اس نظام کی اطاعت ہے۔ اور اس اطاعت کے لئے ایک زندہ انتھاری کی موجودگی لازمی ہے۔ اس نظام کی یہ سب سے پہلی سنٹرل انتھاری حضور نبی اکرم کی ذات اقدس تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک قائم رہنا تھا یا اسے آگے بھی چلنا تھا؟ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو آخری کتاب اور اسلام کو تمام نفع انسان کے لئے قیامت تک کے لئے دین الٰہی قرار دیا تو اس سے واضح ہے کہ اس نظام کو حضور کی زندگی تک محدود نہیں رہنا تھا، آگے بھی چلنا تھا۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی :-

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَلَا يَفْقَهُونَ
أَوْ قَبْلَ أَنْ تَقْلُبَ لَكَ أَعْقَابُكُمْ وَمَنْ يَتَقَلَّبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا۔ (۳۱)

"محمدؐ، ہجرہ میں نیست کہ خدا کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے کئی رسول دنیا میں آئے اور اپنے اپنے فرائض منصبی سر انجام دینے کے بعد رخصت ہو گئے۔ اگر یہ رسول بھی کل کو وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ خیال کر کے کہ یہ نظام تو اس رسول کی زندگی تک محدود تھا، پھر اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو ایسا کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

اس سے واضح ہے کہ اس نظام کو رسول اللہ کے بعد ختم نہیں ہو جانا تھا، آگے بھی چلنا تھا۔ اس نظام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں (خلفاء) نے برقرار رکھنا تھا۔ اس میں خلیفہ الرسول کی اطاعت نے رسول اللہ کی اطاعت کی جگہ لے لی تھی۔ اور "اللہ اور رسول کی اطاعت" کی عملی شکل خلافت علی منہاج رسالت کی رسالت کی اطاعت تھی۔ اس

خلافت علی منہاج رسالت

نکتہ کی وضاحت کے لئے حضور نے فرمایا تھا :-

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمُهْدِيِّينَ .

مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنة

”تم پر میری طریقہ اور میرے خلفائے راشدین، مہدیین کے طریقہ کی پیروی لازمی ہے۔“

اس نظام کی بنیادی شرط اُمت کی وحدت تھی۔ یاہوں کہتے کہ اس نظام کا لازمی نتیجہ اُمت کی وحدت تھی۔ اگر اُمت میں تفرق پیدا ہو جائے تو یہ نظام باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں، اس نظام کے باقی نہ رہنے سے اُمت کی وحدت ختم ہو جاتی تھی۔ یعنی پھر اسلام دین نہیں رہتا تھا، مذہب بن جاتا تھا۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے اُمت مسلمہ کو بڑی شدت کے ساتھ تاکید کی کہ تم تفرق نہ پیدا کر لینا۔ سورۃ الروم میں ہے وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَفَرَّقَ اللَّهُ بَيْنَ أُمَمٍ ۚ اے اُمت واحدہ! ایسا نہ ہو کہ تم مشرکین میں سے ہو جاؤ۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے دین میں تفرق پیدا کر لیا۔ فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے اور پھر ان کی حالت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ اس خفیب نفس میں مبتلا ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں۔ یہاں دیکھئے! اُمت کی وحدت ٹوٹنے کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بات بالکل واضح ہے جب اُمت ایک اتحادی ٹکے تابع رہے تو اس کی وحدت قائم رہتی ہے۔ تفرقہ کے

تفرقہ شرک ہے

معنی یہ ہیں کہ مختلف گروہ، مختلف اتحادی ٹکے تابع ہو جاتے ہیں۔ اسی کا نام شرک ہے۔ اس کی تفسیر میں دوسری جگہ کہا۔ وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ اسی کو صراط مستقیم کہا جاتا ہے۔ تم سب نے اسی کا اتباع کرنا۔ اگر تم نے مختلف راستے اختیار کر لئے تو پھر خدا کی طرف لے جانے والا راستہ کسی کے سامنے نہیں رہے گا۔ یعنی اس طرح دین، مذہب میں تبدیل ہو جائے گا اور مذہب میں خدا کی طرف لے جانے والا راستہ ہوتا ہی نہیں۔ دوسرے مقام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيعًا اَلَسْتُ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۱۶) ”جو لوگ دین میں تفرق پیدا کر دیں اور خود گروہ بن کر بیٹھ جائیں۔ اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔“ رسول تو اس نظام کی سنٹرل اتحادی طاقت تھاجس کے فیصلوں کا اطلاق تمام اُمت پر یکساں ہوتا تھا۔ جن لوگوں نے کسی اور اتحادی کو تسلیم کر لیا وہ اگر اس نظام کے اندر رہے تو ان کی حیثیت باغیوں کی ہوگی۔ اور اگر نظام سے باہر چلے گئے تو اُمت محمدیہ

کے افراد نہ رہے۔ دونوں صورتوں میں رسول کا لٹنے کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہا۔ قرآنی آیات کے علاوہ اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث بھی ہیں جن میں تصریح کیا گیا ہے کہ اُمت سے علیحدگی کے معنی دائرہ اسلام سے خارج ہو جانا ہے۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ کی ایک روایت ہے جس کا تشریحی ترجمہ حسب ذیل ہے۔

”حضورؐ نے فرمایا۔ میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ الجاہدۃ۔ الطاعة۔ والجماعة۔ والحق۔ یعنی جماعت کے ساتھ رہو۔ (حکم امیر سنو۔ اور اس کی اطاعت کرو) ضرورت پڑے تو اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھی چھوڑ دو۔ (اسے ہجرت کہتے ہیں)۔ اور اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے نکل کھڑے ہو۔ یاد رکھو! جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا۔ اسلام کا پٹہ اس کی گردن سے اُتر گیا۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! خواہ وہ روزے رکھتا ہو اور نمازیں پڑھتا ہو۔ (کیا پھر بھی اسلام سے خارج ہو جائے گا) فرمایا۔ ہاں! خواہ وہ نمازیں پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور بزمِ خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو (دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا)۔“

اُمت کو اس قسم کی واضح تاکیدات کے بعد حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے اور آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدینؓ نے اس نظام کو اسی طرح قائم رکھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ رسول اللہؐ کے مامور تھے اور یہ خلفاء۔ قرآن کریم کے مشاورت کے حکم کی رو سے، اُمت کے منتخب کردہ ختم نبوت کے ساتھ مامورین من اللہ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ مامور من اللہ صرف رسولؐ ہوتا تھا۔ لہذا رسول اللہؐ کے بعد اسلامی نظام کی مرکز ہی اٹھارہ اُمت کا منتخب کردہ امام، یا خلیفہ ہوتا تھا۔ منصب اور فرائض دونوں کا ایک تھا۔ یعنی دین کے نظام کا قیام جس میں قوانینِ خداوندی و قرآن مجید کی اطاعت کرائی جائے۔ یہ نظام خلافتِ راشدہ تک قائم رہا۔ اُس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ پیدا ہوا نہ سیاسی پارٹی۔ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کے لئے ایک سنٹرل اٹھارہ موجود تھی اور اس طرح اُمت کی وحدت قائم تھی۔ انتظامی مقاصد کے لئے یہ وسیع و بلیض مملکت بے شک مختلف ولایتوں (صوبوں) میں منقسم تھی لیکن ان سب کی سنٹرل اٹھارہ ایک ہی تھی۔ اس قسم کے انتظام کا ذکر خود قرآن کریم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ اَطِيعُوا اللَّهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ (۹۹)۔ ”اے جماعتِ مومنین! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور ان حاکموں کی جنہیں اسلامی نظام نے کچھ اختیارات سونپے ہوں۔“

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

الْأَخْزَرُ... (۱۵۹) ”اگر تم میں اور ان حکام میں کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اس کے رفع کرنے کے لئے اللہ اور رسول یعنی اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کی طرف رجوع کرو۔ تم اس طریق پر قائم رہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ تم صاحب ایمان ہو۔“

بنی اُمیہ کے زمانے میں اس نظام کی کیا کیفیت تھی اس کے متعلق تاریخ سے کوئی واضح نقشہ ہمارے سامنے نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری تاریخ بالکل ناقابل اعتماد نہیں۔ اسے مختلف زوایائے نگاہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ بایں ہمہ اتنی بات واضح ہے کہ اس زمانے میں بھی کم از کم اُمت کی سیاسی وحدت قائم تھی۔ بنو عباس کے زمانے میں نہ مملکت کی سیاسی وحدت قائم رہی نہ دین کا وہ نقشہ برقرار۔ مسلمانوں کی الگ الگ خود مختار سلطنتیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ دوسری طرف سیکولر نظام رائج ہو گیا جس کی وجہ سے سلطنت نے پبلک امور تو اپنے اقتدار میں رکھ لئے اور مذہبی امور علماء کی تفویض میں دے دیئے۔ اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مختلف فرقے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ان میں سے ہر فرقہ کی اتھارٹی الگ الگ تھی۔ چونکہ دین کی سنٹرل اتھارٹی باقی نہ رہی اس لئے اُطِيعُوا اللَّهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ کا صحیح مفہوم بھی نکلا ہوا سے اوچھل ہو گیا۔ اس کے معنی ہو گئے۔ اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت۔ اس سے یہ سوال ابھر کہ اللہ کی اطاعت سے مراد تو اس کی کتاب کی اطاعت ہوئی۔ اس کے رسول کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس مشکل کا حل یہ سوچا گیا کہ رسول کی اطاعت حضور کی طرف منسوب احادیث کی رو سے کی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے احادیث کے مختلف مجموعے مرتب کئے گئے۔ لیکن ان احادیث میں باہم گہ اختلاف تھا۔ اس لئے ان کی رو سے اطاعت میں بھی اختلاف ہو گیا۔ مختلف فرقوں کا وجود اس اختلاف فطری نتیجہ تھا۔ اُمت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس سنٹرل اتھارٹی کے نہ رہنے سے کس طرح دین کا نظام بھی ختم ہو گیا اور اُمت کی وحدت بھی معدوم!

یہ ہے وہ کیفیت جو ہمارے ہاں صدیوں سے مسلسل چلی آرہی تھی۔ کمر و زوروں افراد پر مشتمل مسلمان افراد کا بے شک نام تو ایک ہے (یعنی مسلمان) لیکن اس نام کے سوا ان میں کوئی قدر مشترک نہیں رہا۔ میں ہوتا ہی یہاں ہے۔ آپ عیسائیوں کے ہاں دیکھئے۔ دنیا میں ان کی آبادی مسلمانوں سے بھی زیادہ ہے لیکن ان میں اشتراک صرف نام کا ہے۔ عیسائیت کا مذہب ان کی وجہ جامعیت نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عیسائی سلطنتیں باہم گہ مصروف جنگ و قتال رہتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں پہلی اور دوسری عالمی جنگیں بنیادی طور پر عیسائی مملکتوں کے مابین ہی تھیں۔ ان عیسائیوں میں مشترک قدر اتنی ہی ہے کہ وہ آوار کے دن گرجوں میں چلے

ہماری حالت

جاتے ہیں یا کمرہ سس کے تیر ہاڑ کا جشن مسرت منالیتے ہیں۔ بعینہ یہی حالت ہم مسلمانوں کی ہے۔ ہم سب اپنا نام مسلمان رکھتے اور اسلام اپنا مذہب لکھتے اور بتاتے ہیں۔ لیکن یہ مذہب مختلف مسلم سلطنتوں میں تو ایک طرف، ایک ہی مقام پر بسنے والے مسلم افراد میں بھی کسی قسم کی یکانیت کا موجب نہیں بنتا۔ مثلاً قرآن کریم نے کہا تھا وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعْنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ”جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو بالارادہ قتل کر دیا تو وہ ابدی طور پر جہنم میں رہے گا۔“ یہ بھی قرآن کی رو سے مسلمانوں کے ہاتھوں کسی ایک مسلمان کے قتل کی پاداش۔ اب صورت یہ ہے کہ انفرادی طور پر ہر روز مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں اور اجتماعی طور پر مسلمان مملکتیں ایک دوسرے کے ساتھ مصروف جنگ و قتال رہتی ہیں۔ مذہب اسلام کا اشتراک انہیں اس سنگین جرم کے ارتکاب سے باز نہیں رکھتا۔ مختلف فرقوں کی یہ کیفیت ہے کہ ہر فرقے کی مسجد الگ الگ ہے اگرچہ ہر فرقہ اپنی مسجد کا رخ ایک ہی سمت (قبلہ) کی طرف رکھتا ہے۔ باجماعت نماز ادا کر کے سمجھ لیا جاتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کے ساتھ رہنے کا جو تاکید حکم دیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی۔ امام کی آواز پر رکوع و سجود کی ادائیگی سے اس خود فریبی میں مبتلا رہا جاتا ہے کہ ”سمع و طاعت“ کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی پوری پوری تعمیل ہو رہی ہے۔ حج کے موقع پر لاکھوں کے میکانیکی اجتماع کو اتحاد اسلامی کا رُوح پرور نظارہ کہہ کر تکریر کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر رابطہ عالم اسلامی کی سی تحریکوں اور سربراہان مملکت اسلامیہ کی کانفرنسوں سے یہ اطمینان حاصل کر لیا جاتا ہے کہ ہم وحدت اُمت کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ قرآن کریم نے ایک قسم کی اجتماعیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ۚ ”تم انہیں یکجا دیکھ کر خیال کر دو گے کہ یہ واقعی ایک جماعت ہے۔ لیکن ان کا یہ اتحاد محض ان کے جسموں کا یکجا ہونا ہے۔ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔“ دو سال اُدھر جو خود ہمارے ہاں مسلم سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اسکے ”اتحاد کا بھانڈا ابھی حال ہی میں پھوٹا ہے۔ اس میں مصر کے صدر ساوآت اس اتحاد کی کوششوں میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر ہر ایک سے گلے مل رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے نجیب الرحمٰن کو کانفرنس میں شریک کرنے اور نیگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لئے بھی نمایاں خدمات“ سر انجام دی تھیں۔ نظر آتا تھا کہ اس شخص کا سینہ درجہ ملت سے لبریز اور اس کا دل اتحاد اُمت کے جذبہ سے سرشار ہے۔ اب حال ہی میں

یہ بھید کھلا کہ ۱۹۴۱ء کی جنگ میں روسی اسلحہ کے لدے ہوئے جہاز قاہرہ ایئر پورٹ سے سیدھے بھارت بھیجے جاتے تھے تاکہ وہ ان کے ذریعہ بنگلہ دیش میں پاکستانی فوجوں کو شکست دے سکیں۔ اسی سے یہ باز بھی کھلا کہ صدر ساوات مربراہی کا نفرنس کے اختتام پر یہاں سے سیدھے بھارت کیوں تشریف لے گئے تھے۔ سوال: عزیزان من! کسی ایک مملکت یا کسی ایک سربراہ کا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ”مذہب“ مختلف افراد میں وجہ اخوت اور مختلف مملکتوں میں باعث یگانگت بن سکتا ہے۔ یہ فریب نفس ہے۔ مذہب (خواہ کوئی بھی ہو) نہ کبھی وجہ یگانگت بنا سکتا ہے نہ اب بن سکتا ہے۔ یہ صورت تو دین سے پیدا ہوتی ہے۔

ادبیہ وہ پیغام تھا جسے اقبال ”عمر بھرام کہتا رہا۔ سب سے پہلے اس نے اس حقیقت کو واشگاف کیا کہ دین کی نو سے فرد کی ہستی ربطِ ملت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ یعنی وہی چیز جسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمک بالجماعت کہہ کر پکارا تھا۔ اسرار و رموز، علامہ اقبال کا سب سے پہلا مجموعہ کلام ہے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں۔

فرد در ربط جماعت رحمت است جوہر اور اکمال از ملت است
فرد و قوم، آئینہ یکدیگر اند سک و گوہر، کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

جادید نامہ ان کے فلسفہ اور پیام پر مشتمل بڑی اہم کتاب ہے۔ وہ اس میں ایک مقام پر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اُمت کی تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے... کہتے ہیں کہ:-
قوت دین از مقام وحدت است وحدت از مشہور و گمراہ، ملت است
یعنی افراد کی وحدت جب محسوس اور مشہور شکل اختیار کرے تو اسے ملت یا جماعت یا اُمت کہا جاتا ہے۔ اور یہی وہ وحدت ہے جس سے دین کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

ارمغانِ حجاز ان کا آخری مجموعہ کلام ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ وہ اس میں اس طرح

تشکل شدہ اُمت کے متعلق کہتے ہیں کہ :-

میان اُمتوں والا مقام است کہ اُس اُمت دو گیتی والا امام است
نیاساید ز کارِ افسرینش کہ خوابِ خوشگی بر و حرام است
اسی سلسلہ میں آگے ایک قطعہ ہے جس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ دین کا پورا نظام اور اُمت اور اس کے
نصب العین کا باہمی ربط اس کے اندر سمٹ کر آگیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس اُمت کی کیفیت یہ ہے۔

پہرہ دروس و گمہ دوں لیگانہ نگاہِ او بہ شاہِ آشیاں
مروا نجسم گرفتار کندش بدستِ ادست تقدیرِ زمانہ
پندرہ دن بھر فضا کی پہنائیوں میں مجھ پر داز رہتے ہیں۔ وہ سینکڑوں میل تک دور دور تکل جاتے
ہیں لیکن اپنے آشیاں کے تصور ایک ثانیہ کے لئے بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اور وہ دن بھر
کی تک و ناز کے بعد شام کو پلٹ کر اُسی آشیاں میں آجاتے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کی بھی یہی کیفیت ہے
وہ مذمکہ حیات کے ہر گوشے میں مصروفِ نگ و ناز رہتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں منہمک و سعی و
عمل رہتی ہے۔ لیکن اپنا نصب العین حیات اس کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا۔ اور اسی وحدت
نصب العین سے اس قوم میں ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ چاند اور ستاروں تک اس کی کمندیں گرفتار
ہوتے ہیں۔ اور اقوامِ عالم کی تقدیر اس کے ہاتھ میں۔

وحدتِ نصب العین کی اسی بنیادی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان حسین و بلیغ الفاظ میں
مرکز کر دیا ہے کہ :-

چیت ملت ہے کہ گوئی لا الہ ؟ باہزاراں چشم بودن یک نگاہ
جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، ہم رسی طور پر اُمتِ محمدیہ اور ملتِ اسلامیہ جیسے الفاظ استعمال
کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اقبالؒ اس ملت کو (یعنی ہم مسلمانوں کو) وہ ملت ہی نہیں قرار دیتا جسے قرآن کی
دوشنی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشکل فرمایا تھا۔ وہ ارمغانِ حجاز میں لکھتے ہیں :-
مسلمان فاقہ مست و زہد پوش است ز کارش جبرئیل اندر خروش است

بیان نقشِ دگر ملت بریزیم کہ ایں ملت جہاں رابار دوش است
 اس نشاۃِ جدیدہ کی رو سے مشکل ہونے والی ملت کے متعلق اگلے قطع میں ہے :-
 دگر ملت کہ کار سے پیش گیرد دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد
 نگر دو پایکے عالم رضا مند دو عالم رابہ دوش خویش گیرد
 اقبالؒ، نازی ازم، فاشیزم یا کمیونزم کی طرح فرد کو ملت میں گم کہہ کے اس کے جداگانہ تشخص کو مٹا نہیں
 دیتا۔ وہ افراد کا تشخص قائم رکھتا ہے اور اسی کو ملت کی قوت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-
 افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
 ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

بانگِ دہا میں ہے :-

یقین افراد کا سرمایہ تعمیرِ ملت ہے یہی قوت ہے جو صورتِ گہر تقدیرِ ملت ہے

جماعت کی اہمیت کے بعد اقبالؒ دین کے نقطہٴ ماسکہ کی طرف آتا ہے۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ
 اسلامی نظام کی سنٹرل اتھارٹی اس وحش کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اقبالؒ اسے مرکزِ ملت کہہ کر
 پکارتا ہے۔ یہاں اتنا واضح کہہ دینا ضروری ہے کہ مرکزِ ملت سے مراد کوئی ایک فرد
 نہیں۔ اسلامی نظام میں سنٹرل اتھارٹی یا مرکزِ حکومت کی جو شکل بھی قرآنی حدود کے
 اندر رہتے ہوئے امت کے باہمی مشورہ سے متبعین کر لی جائے گی، اسے مرکزِ ملت سے تعبیر کیا جائے گا۔
 اس مرکزِ می اتھارٹی کے متعلق اقبالؒ نے اپنی مختلف کتابوں میں بڑی شرح و بسط سے لکھا ہے۔ وہ امر
 رموز میں کہتے ہیں :-

قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے
 حلقہ را مرکزے چو جاں در سپر است خطِ اُودر نقطہٴ او مضمر است
 اس سلسلے میں وہ مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو دیکھو۔ جب ان کی مرکزیت باقی نہ رہی تو ان
 کا سارا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ لکھتے ہیں :-
 عبرتے اے مسلم روش ضمیر از مآلِ اُمتِ موسیٰ بگیر

۱. دادچوں آں قوم مرکز راز دست رشتہ جمیعت ملت شکست
وہ موجودہ مسلمانوں کی لامرکزیت پر خون کے آنسو بہاتے ہیں اور ان کے تمام امراض کی علت اسی کو قرار دیتے ہیں۔ ارمغانِ حجاز کے دو تین قطعات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں :-

ہنوز این چرخ نیلی کج خرام است ہنوز این کارواں دور از مقام است
ز کار بے نظام اوجہ گویم تومی دانی کہ ملت بے امام است
ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :-

شے پیش خدا بگریم زارا مسلماناں چہ از اند و خوارند
ندا آمد! بخنی دانی کہ ایسے قوم دلے دارند و محبوبے ندارند

وہ لامرکز قوم کی تمام جدوجہد کو سچی لا حاصل قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں :-

ازاں فکھ فلک پمیاچہ حاصل کم گمرد ثابت و سیارہ گمرد
مثال پارہ ابرے کہ از باد برپہنکے افضا آوارہ گمرد

اسی کو وہ پرندے اور اشیائے کے غیر مرنی ربط کی تشبیہ سے زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہیں :-

ان کے ایک اور قطعہ کا پہلا شعر میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ پورا قطعہ اب ملاحظہ فرمائیے :-

چیت ملت اے کہ گوئی لا الہ! باہزاراں چشم بودن یک نگاہ
مردہ! از یک نگاہی زندہ شو بگمرد از بے مرکزہ پائیندہ شو

وہ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں کہ :-

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدا!

میں نے پہلے بتایا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کا فکری، اعتقادی اور آئینی مرکز خدا کی کتاب قرآن مجید ہے اور ان کے عمل و کردار کا مرکز اسلامی نظام اور اس کی مرکزی اتھارٹی۔ لیکن محسوسات کا جو گمراہ انسان کوئی محسوس مرکز بھی چاہتا ہے جو اس کے نصب العین کی علامت بن سکے۔ دورِ حاضر کی مثال میں یوں سمجھئے کہ جب ہم ماسکو کہتے ہیں تو اس سے مراد ایک شہر نہیں ہوتا بلکہ کمیونزم کا محسوس مرکز یا علامت ہوتا ہے دنیا میں کمیونسٹ کہیں بھی ہوں، ان کی حکم و نظر اس محسوس مرکز کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان

کے اس تقاضا کا بھی احترام کیا اور ان کے لئے ایک محسوس مرکز متعین کر دیا۔ یہ مرکز کوئی شہر نہیں بلکہ کعبہ ہے جسے خدا نے اپنا گھر کہہ کر پکارا ہے۔ تعمیر کعبہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ دنیا کے توحید پرستوں کا محسوس مرکز بن سکے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی مملکت قائم کی مدینہ اس کا دار الحکومت تھا، عام دنیاوی ملکوں کے منہا یکمطابق اسی شہر کو اس ہلت کا محسوس مرکز قرار پایا چاہئے تھا۔ لیکن مدینہ شریف رکھتے ہوئے بھی حضور کے دل میں یہ مقدس آرزو مچلتی تھی کہ یہ مرکز محسوس کعبہ ہی ہونا چاہئے، حالانکہ اس وقت کعبہ، اسلام کے مخالفین کے قبضے میں تھا۔ قرآن کریم نے حضور کی اس آرزو کو ان حسین الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ قَدْ مَنَّ اِلٰہُ عَلٰی مَنْ اٰمَنَ وَجْہُکَ فِی السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّیْنٰکَ قِبْلَۃً مَّرْضٰیاً۔ ”ہم دیکھ رہے ہیں کہ تیرا لگاؤ کس طرح بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ ہم تمہارے پسندیدہ مرکز کو یقیناً تمہاری تولیت میں دے دیں گے۔ چنانچہ آخر الامر کعبہ کی تولیت اس نظام کی تحویل میں آگئی اور اسے امت مسلمہ کے لئے قبلہ قرار دے دیا گیا۔ قبلہ کے معنی ہوتے ہیں وہ شے جو ہر وقت کسی کے پیش نظر رہے۔ اسی کو نصب العین کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس امت سے کہا گیا۔ وَحِیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْہَکُمْ شَرْقًا۔ ”تم جہاں کہیں بھی ہو اپنی نگاہیں اسی مرکز کی طرف مرکوز رکھو۔“ اس کے مفہوم کو اور وضاحت سے سمجھنے کے لئے اقبالؒ کے اُس شعر کو پھر سے سامنے لیتے۔ جسے میں پہلے بھی پیش کر چکا ہوں کہ:-

پُرورد و وسعت گرد و لے یگانہ نگاہ او بشاخِ اشیا نہ

اقبالؒ نے اسرار و رموز میں، اس مرکز کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے:-

قوم را ربط و نظم از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے

راز دار و راز ما بیت الحرام سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام

توز پیوند حریمے زندہ تا طواف او کئی، پاسندہ

درجہاں جانِ اُمم جمعیت است

در تکریم، تہ حریم جمعیت است

اور ایمانِ حجاز میں قبلہ کی غایت اور امت کے ساتھ اس کے قلبی روابط کو ایسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے

ہے کہ نگہ بصیرت اس پر غور کرنے سے وجد میں آجاتی ہے۔ کہا :-

حرم، جز قبلہ، قلب و نظر نیست طواف ادطواف بام و در نیست

میان ما و بیت اللہ، رمزے ست کہ جبریل امیں را ہم خیر نیست

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے۔ آج دنیا کی مختلف مملکتوں کے اپنے اپنے محسوس مراکز ہیں۔ ماسکو، پکنگ و واشنگٹن وغیرہ۔ لیکن یہ انسانوں کے وضع کردہ نظاموں کے قومی مراکز ہیں۔ اس کے برعکس کعبہ، نہ انسانوں کے وضع کردہ نظام کا نصب العین ہے اور نہ ہی دُعا کی اصل کی اصطلاح میں کسی قوم کا مرکز وہ ضابطہ خداوندی کی اطاعت کا محسوس مرکز ہے جسے تمام نوع انسان کا مرکز بننے کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ دنیا میں رائج سیکولر نظام اس قسم کے مرکز سے محروم ہے، اس لئے اس کی رو سے نوع انسان کی عالمگیر برادری متشکل نہیں ہو سکتی جو قرآن کی غایت الغایات ہے۔ اسی بنا پر اقبالؒ کہتا ہے کہ :-

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے حرم کا راز توحید اُمم ہے

تہی و حست سے ہے اندیشہ غرب کہ تہذیبِ فسرنگی بے حرم ہے

اقبالؒ کے زمانے میں "لیگ آف نیشنز" قائم ہوئی تھی جس کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں تھا۔ اس نظام اور قرآنی نظام کے فرق کو نمایاں کرنے کے لئے اقبالؒ نے کہا کہ :-

کہے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام

جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم ؟

ان تصریحات سے آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ قرآن کریم کی رو سے دین کا مفہوم کیا ہے ؟ یعنی خدا کی کتاب کو ضابطہ حیات تسلیم کرنے کی بنا پر اُمت واحدہ کی تشکیل۔ اس اُمت کی ایک مملکت، اُس مملکت کی ایک سنٹرل اتھارٹی جسے اقبالؒ نے مرکزِ ملت کہہ کر پکارا ہے۔ اس پورے نظام کو قرآن کریم نے "الاسلام" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان اجزاء میں سے کوئی ایک جزو بھی باقی یا اپنی اصل شکل پر قائم نہ رہے تو اسلام، اسلام نہیں رہتا۔ اس آئینہ میں دیکھئے تو قرآنی اسلام دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اسلام، مذہب ہی کی شکل میں موجود ہے۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے بڑی شدت سے محسوس کیا جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک اسلام کا نظام قائم نہیں ہوتا، اُمت میں وحدت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اتنا عظیم اور وسیع تھا کہ وہ، بحالاتِ موجودہ ایک ہی

جست میں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس منزل تک بتدیج ہی پہنچا جاسکتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اس پروگرام کی ابتداء کسی ایک خطہ زمین سے کی جائے۔ انہوں نے، علامہ جمال الدین افغانی کے ناکام تجربہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس وقت مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی قومی مملکتیں قائم نہیں اور کوئی مملکت بھی اپنے اس جداگانہ تشخص کو ملت کی وحدت میں گم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے یہ سوچا کہ اس پروگرام کا آغاز کسی ایسے خطہ زمین سے ہو سکتا ہے جہاں پہلے سے کوئی مملکت قائم نہ ہو۔ اس کے لئے انہوں نے مملکت پاکستان کا تصور دیا اور اس تصور کو قائد اعظم کی مجاہدانہ فکر نے ایک محسوس مملکت کی شکل میں متشکل کر دیا۔ یہ ایک ایسا عظیم انقلاب تھا جس کی مثال ہماری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس سے پھر اُسی دین کے احیاء کے امکانات تابندہ اور روشن ہو گئے جسے صمد اول میں محمد رسول اللہ والذین معہ کے مقدس ہاتھوں نے قائم کیا تھا۔ اس سے آپ اس خطہ زمین کی اہمیت کا اندازہ لگائیے۔

مملکت پاکستان

لیکن وائے بر حال ما ا کہ اقبال کا یہ خواب، خواب پریشاں ہو کر رہ گیا۔ پاکستان، مسلمانوں کی ایک جداگانہ مملکت ہی نہ بن سکا۔ اور اس میں اسلام، مذہب کی حیثیت ہی سے رائج رہا۔ یہ دین کے نظام کی جولا نگاہ نہ بن سکا۔ اس کی وجوہات متعدد و قرار دی جاسکتی ہیں لیکن میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ اور اساسی سبب ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے اس بد نصیب ملک میں جماعت اسلامی کا وجود۔ مجھے اس کا اچھی طرح سے احساس ہے کہ میرے اس کہنے پر بہت سی بھڑکیاں تھیں گی، بہت سی پیشانیوں پر بل پڑیں گے۔ بہت سے چہرے خمیگین اور بہت سے دہن کھٹ آگئیں ہوں گے۔ میرے خلاف پروپیگنڈے کے سمندر میں ایک نیا تلاطم برپا ہو گا۔ لیکن عزیزانِ من! میں جس بات کو حقیقت اور صداقت سمجھتا ہوں، مخالفتوں کا ہجوم مجھے اس کے اظہار و اعلان سے باز نہیں رکھ سکتا۔ میں پچیس سال سے ان کے اس پروپیگنڈے کا پٹ بننا چلا آ رہا ہوں۔ میں جب اس طویل عرصے میں اس حقیقت کے اظہار سے روک نہیں سکا تو اب، عمر کے اس آخری حصے میں، جبکہ میں جانتا ہوں کہ خدا کی باز پرس کا دن قریب آ رہا ہے، میں اظہارِ صداقت سے کیوں باز رہوں۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری قوم بڑی جذباتی واقع ہوئی ہے۔ اس لئے وہ کسی تحریک پر اُس کے آغاز میں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی عادی نہیں رہی۔ اس کی یہی جذباتیت تھی جس سے تحریک احمدیت اس

جماعت اسلامی

طرح پر مبنی اور پھیلتی چلی گئی۔ مرزا غلام احمد نے اپنا تعارف ایک مناظر کی حیثیت سے کر لیا اور بظاہر اسی مقصد کے لئے اپنی پہلی کتاب ”براہین احمدیہ“ شائع کی۔ قوم نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی مدح و ستائش میں غلغلے بلند کر دیئے۔ اس نے منظر غائر یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ اس تحریک کا رخ کس منزل کی طرف ہے حالانکہ مرزا صاحب نے بعد میں خود اس امر کا اظہار کیا کہ اس کتاب میں ان کے بعد کے وعادی بین السطور پیچھے ہوئے تھے اور یہ کہ انہوں نے یہ انداز اس لئے اختیار کیا تھا کہ یہاں کے علماء اس پینچ میں پھنس جائیں (بحوالہ اربعین نمبر ۲۔ صفحہ ۲۱) مسلمانوں کو اس کا احساس اس وقت ہوا جب وہ تحریک اپنے برگ بار لاکھی گئی۔ اس قوم (بالخصوص پنجابی مسلمانوں) کی یہی وہ جذباتیت اور عجلت پسندی ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ :-

ندیب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کھلے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہر تار ہے بہت جلد

تاویل کا بھنڈا کوئی سیاد لگا دے

یہ شاخ نشین سے اترتا ہے بہت جلد

مردودی صاحب جب حیدر آباد دکن سے پنجاب آئے ہیں، تو انہوں نے پنجابی مسلمان کی اس طبیعت کا خوب اندازہ لگایا۔ میرے ان کے ساتھ اس سے بہت پہلے سے مراسم تھے۔ لیکن اس وقت تک میرا اُن سے تعارف صرف ان کی تحریروں کے ذریعہ تھا۔ ۱۰ میرے مضامین بھی ان کے رسالہ ترجمان القرآن، میں چھپا کر تے تھے) میں یہاں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس قسم کی بحثوں میں، ذاتیات کو درمیان میں نہیں لایا کرتا۔ لہذا اس مقام پر بھی صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ حیدر آباد سے پنجاب جانا وقت وہ اپنے مسکن دہلی میں کچھ دنوں کے لئے ٹھہرے تو ان کی اکثر نشستیں میرے مکان (واقعہ نئی دہلی) پر ہوتی رہیں۔ اس وقت مجھے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے ان کی طبیعت میں اس قسم کے جراثیم محسوس کئے اور دینی زبان سے انہیں اس سے متنبہ بھی کیا۔ اُس وقت تک وہ ماڈرن ٹائپ کے نوجوان صحافی تھے۔ دارالاسلام جا کر انہوں نے مذہبی لبادہ اوڑھا۔ اور اس کے بعد پنجاب کے مرکز ہی مقام لاہور میں اپنی علیحدہ جماعت کی بنیاد رکھی۔ ان کی جماعت کے پہلے اجتماع کی روئیداد ان کے رسالہ۔ ترجمان القرآن کی جون جولائی اگست ۱۹۳۱ء کی مشترکہ اشاعت میں درج ہے، اور ہر صاحب

بصیرت کو آج بھی دعوتِ غرور و فخر دیتی ہے۔ اس اجتماع کی افتتاحی تقریر میں مودودی صاحب نے اس کی اہمیت کے سلسلے میں فرمایا کہ :-

”اسلام بغیر جماعت کے نہیں ہے اور جماعت بغیر امارت کے نہیں۔ اس قاعدہ کلیہ کے مطابق ضروری ہے کہ جماعت بننے کے ساتھ ہی آپ اپنے لئے ایک امیر منتخب کر لیں۔ (ترجمان القرآن ص ۱۷)

جب حضور بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (بالبعض روایات کی دوسے حضرت عمرؓ) نے فرمایا تھا کہ ”جماعت کے بغیر اسلام نہیں“ تو ظاہر ہے کہ جماعت سے مراد اُمتِ واحدہ تھی۔ لیکن مودودی صاحب اس اُمت کے اندر اپنی جماعت کی تشکیل کرتے ہیں۔ اور اس کی سندیں یہ ارشادِ نبویؐ (یا فاروقیؓ) پیش کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مودودی صاحب نے فرمایا کہ اس جماعت کے بغیر، جواب متشکل کی جائی ہے، اسلام نہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس کا نام اُسلَہی جماعت رکھا۔ اب ہی اس کے امیر کی پوزیشن، سوا انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ :-

”اسلامی نقطہ نظر سے اقامتِ دین کی سعی کرنے والی جماعت میں، جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف وراصل اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا ایک جز ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو امیر مانا ہے وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے وراصل، اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے۔“

(ہدایات نمبر ۳۷)

آپ غور کیجئے کہ یہ دعاوی کس قدر خطرناک مستقبل کا پیش خیمہ تھے۔

مودودی صاحب کا مقام

اس کے امیر کی اطاعت ”خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت“ کے مرادف۔ یا للعجب!

رسولؐ کی اطاعت کے سلسلے میں مودودی صاحب نے کہا کہ یہ اطاعت احادیث کی دوسے کی جاسکتی ہے لیکن انہی احادیث کی دوسے، جسے ”مزاج شناس رسولؐ“ صحیح احادیث قرار دیدے۔ اس

جماعت کے نزدیک ”مزاج شناس رسول“ خود مودودی صاحب ہیں۔ احادیث کے متعلق بعینہ یہی مسلک مرزا غلام احمد... کا تھا۔ انہوں نے اس ضمن میں کہا تھا کہ :-

”جو شخص حکم ہو کہ آیا ہے اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرے میں جس انبار کو چاہے خدا سے علم پاکر قبول کر لے اور جس ڈھیر کو چاہے، خدا سے علم پاکر رد کر دے۔“
(تحفہ گولڑویہ - صفحہ ۱۰)

”مزاج شناس رسول“ کے ساتھ ہی اس جماعت نے مودودی صاحب کے متعلق یہ عقیدہ عام کیا کہ :-
”مودودی صاحب کی شخصیت امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔“
(ماہنامہ فاران - بابت جون ۱۹۵۳ء)

اس جماعت کے موجودہ امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اس تمام تفصیل کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا۔
جب کہا کہ :-

”مولانا مودودی اُس زمانے میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور سند ہیں۔“

(جریدہ قاصد - کشمیر نمبر - بحوالہ ماہ نامہ الفرقان - مئی جون ۱۹۵۵ء - صفحہ ۹)

مودودی صاحب نے جس زمانے میں اپنی جماعت کی تشکیل کی ہے۔ انہی دنوں انہوں نے ترجمان القرآن (بابت دسمبر ۱۹۴۲ء و جنوری ۱۹۴۱ء) میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا - ”تجدید و احیاء دین“۔ جسے بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے ”مجددین“ میں سے ایک ایک کا نام لے کر یہ بتایا کہ یہ حضرات اپنے مشن میں کس طرح ناکام رہ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے قوم سے کہا کہ اس میں بایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ایک آنے والا آئے گا۔ اور جو کچھ ان اسلاف میں سے کسی سے نہیں ہو سکا وہ کچھ کر کے دکھائے گا۔ انہوں نے اس میں لکھا ہے کہ :-

”میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل جدید

مقام مہدویت

ترین طراز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل کو بخوبی سمجھتا ہوگا۔ عقلی و ذہنی سیاست، سیاسی تدبیر، جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جمادے گا۔ اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید تر ہوگا۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے۔ پھر مجھے یہ بھی اُمید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا۔ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائے گا۔۔۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر پیدا کرے گا۔ ذہنی طور کو بدلے گا اور ایک زبردست تحریک اٹھائے گا۔ جریدہ وقت تہذیب بھی ہوگی اور سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی۔ مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دے گا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اور کمال تک پہنچ جائے گی۔

(ترجمان القرآن، صفحات ۴۵-۴۶)

آپ نے دیکھا کہ مودودی صاحب کس طرح قدم بقدم میرزا غلام احمد کے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں ایک بڑا فرق ہے۔ مرزا صاحب نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ لیکن مودودی صاحب کا مطلع نگاہ، حکمرانی کا اقتدار حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ وہ اسلام کے صدراقل کی مثال پیش کرنے کے بعد ”صالحین“ سے کہتے ہیں کہ:-

”تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہذا، اگے بڑھو۔

لڑ کر خدا کے بایںوں کو حکومت سے بے دخل کر دو۔ اور حکمرانی کے اختیارات

اپنے ہاتھ میں لے لو۔“ (خطبات، صفحات ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۳۵)

ان حضرات کے یہ عزائم تھے جن کے پیش نظر قائد اعظمؒ، تحریک پاکستان کے دوران اس کی وضاحت کرتے رہے کہ پاکستان میں تھیا کہ ایسی قائم نہیں ہونے دی جائے گی۔ اور یہاں پہنچ کر بھی انہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ:-

”کچھ بھی ہو، یہ ستم بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی

تھیا کہ ایسی راج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں

وے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) ”خدا فی مشن پورا کریں۔“

(تغاریہ بحیثیت گورنر جنرل۔ ص ۶۵)

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ مودودی صاحب قائد اعظمؒ کے اس قدر مخالف کیوں تھے اور ان کے متعلق اس قسم کا پروپیگنڈا کیوں کیا کرتے تھے کہ ان کی فکر و کردار میں اسلام کی ایک چھینٹ تک بھی نہیں مودودی صاحبؒ خدا اور رسولؐ کے نام پر اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے اور قائد اعظمؒ اسے بدترین قسم کی آمریت تصور کرتے تھے۔

بہر حال، میں کہہ رہا تھا کہ مودودی صاحب، مہدویت کے مقام تک پہنچنے کے لئے کس طرح زمین ہموار کرتے جا رہے تھے۔ اصل یہ ہے کہ انہوں نے اس مقام کے لئے بہت پہلے سے ردارکھ دیا تھا۔ مرزا غلام احمد صاحب نے اپنی خلافت کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے۔۔۔۔۔ پیشگوئی کی تھی کہ تین سال کے بعد میرے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوگا۔ جو اسلام کے استحکام اور فروغ کا باعث بنے گا۔ مودودی صاحب نے بھی اپنی پیدائش کے

اپنی پیدائش کے متعلق

سلسلے میں کہا ہے۔

”میں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ (۲۵ دسمبر ۱۹۰۳ء) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش سے ۳ سال پہلے ایک بزرگ والد مرحوم کے پاس آئے تھے۔ انہوں نے میری پیدائش کی پیشگوئی کی تھی اور والد صاحب سے فرمایا تھا کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا“

(کتاب تصوف اور تعمیر سیرت، صفحہ ۱۵۔ مرتبہ عام نعمانی)

شائع کردہ: اسلامک پبلیکیشنز۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

مودودی صاحب انہی ۶۰ ائمہ کو لے کر پاکستان آئے تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب انہوں نے ۱۹۵۳ء کے ختم نبوت کے سلسلے کے ہنگاموں میں دیکھا کہ اس قسم کے کھلے ہوئے دعاوی کے خلاف مسلمانوں کا اعتماد و رد عمل کیا ہوتا ہے تو انہوں نے اس کے متعین اعلان سے اپنے آپ کو روک لیا۔ لیکن اپنی کوششوں کو بدستور جاری رکھا۔ انہوں نے اس کی گنجائش بھی پہلے سے رکھ لی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ آنے والا مہدی خود اس کا اعلان نہیں کرے گا۔ لیکن :-

”اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج

النبوت پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا۔

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۴۲ء، جنوری ۱۹۴۳ء، صفحہ ۴۵-۴۴)

ظاہر ہے کہ یہ تدبیر اپنی جماعت کے دل میں شمع اُمید کو روشن رکھنے کے لئے بڑی گام گہ ہے۔ اور اب جو کہا جاتا ہے کہ مودودی صاحب کی روزمرہ کی زندگی کی جزئیات تک کا تصویر سی سونچ تیار کیا جا رہا ہے۔ وہ غالباً اسی موعودہ ظہور کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ دہشت روزہ سنگرام لاہور۔ بابت ۷ تا ۱۴ فروری ۱۹۶۹ء۔ صفحہ ۱۳)

یہ تھے عزیزانِ من! وہ عزائم جنہیں لے کر مودودی صاحب پاکستان تشریف لائے۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا۔ یہاں کے سادہ لوح مسلمان نے اسے قطعاً نہیں بھانپا، اور تحریک احمدیت کے ابتدائی دور کی طرح اس تحریک کو بھی اسلامی نظام کے قیام اور دین کے احیاء کا ذریعہ سمجھا چلا آ رہا ہے۔ جیسا کہ میں۔۔۔ کہہ چکا ہوں، میں نے ان جراثیم کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ میں اس جماعت کے یوم تکبیس کے وقت سے بالعموم اور قیام پاکستان کے بعد بالخصوص اس کی التزاماً مخالفت کرتا چلا آ رہا ہوں۔ (میں نے تحریک احمدیت کی بھی بہت پہلے سے مخالفت شروع کی تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۳۵ء میں بہاولپور کے مشہور مقدمہ کے فیصلے میں ”احمدیوں کو خارج از اسلام قرار دیا گیا تھا تو اس کی بنیاد میرے ہی ایک مقالہ پر تھی) اور یہی وجہ ہے کہ اس جماعت نے، اور سب کو چھوڑ کر مجھے اپنے پروپیگنڈے کا ہدف بنا رکھا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہیں مجھے منکرِ حشر قرار دیتے ہیں کہیں منکرِ اتباع سنت! اور چونکہ اپنی مصلحتوں کے لئے جھوٹ بولنا ان کے نزدیک شرفاً واجب ہوتا ہے۔ اس لئے وہ میرے خلاف اس قسم کے افراء باندھنے میں کوئی باک نہیں سمجھتے، بلکہ اسے کارِ ثواب خیال کرتے ہیں۔

مودودی صاحب اپنے ان عزائم میں اس قدر اُگے بڑھتے گئے کہ خود ان کی جماعت کے بعض سرکردہ حضرات نے بھی انہیں بھانپ لیا اور انہیں اس پر متنبہ کیا۔ لیکن جب وہ اس پر بھی اپنی روش سے باز نہ آئے تو ان حضرات نے ان کی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان علیحدگی اختیار کرنے والوں میں (مولانا امین احسن اصلاحی کا نام سرفہرست تھا۔ جماعت اسلامی میں مولانا صاحب کا مقام، مودودی صاحب سے دوسرے درجہ پر تھا۔ وہ ان کی عدم موجودگی میں، جماعت کے امیر مقرر ہوتے تھے۔ ان کے علم و فضل کا تعارف ان الفاظ میں کیا جاتا تھا:-

”عالم، بلند نظر اور متبحر عالم، جس کی نگاہ خاک کے ذروں کا بھی جائزہ لیتی ہے، اور سہ واختریم کی گذرگاہوں کا بھی پتہ کرتی ہے۔ دس بیس نہیں، ہزاروں راہیں صرف قرآن کریم کے مطالعہ میں بسر کی ہیں۔ جن کی ذات قرآنی علوم کے لئے قابلِ وثوق سند ہے۔ قرآن کا مفسر اور حدیث و فقہ میں جس کی ذر فنگاہی مسلم“

(ماہنامہ فاران، بابت جون ۱۹۵۳ء)

اپنی اصلاحی صاحب نے جماعت سے علیحدہ ہونے کے وقت، مودودی صاحب کو ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ :-

”آپ اپنے آپ کو نہ صرف جماعت اسلامی کا قائم مقام سمجھتے ہیں بلکہ خود اسلام کا بھی قائم مقام سمجھنے لگے ہیں۔ آپ کے نزدیک اگر آپ کی کسی حرکت پر کسی کو اعتراض ہو تو وہ جماعت پر اعتراض ہے۔ اور جب یہ جماعت پر اعتراض ہے تو اسلام پر اعتراض ہے۔ اسی طرح آپ اپنا یہ ذہن بنا بیٹھے ہیں کہ آپ کی ذات اگر کبھی زیر بحث آتی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس ملک میں اقامتِ دین کا سارا کام درہم برہم ہو جائے گا اور لادینی طاقتیں غالب ہو جائیں گی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سوچنے کے اس انداز کو بدلیں۔ خدا نے اسلام کو نہ آپ کے ساتھ باندھا ہے نہ جماعت اسلامی کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ اگر آپ اسلام کا کام کرنے لڑے ہیں۔ تو خدا را اس کی یہ قیمت نہ مانگئے کہ اگر آپ اسلام پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگ جائیں تو بھی لوگ اس کو جاننے کے باوجود چپ رہیں، کیونکہ اس سے اقامتِ دین کے جہاد کو نقصان پہنچ جائے گا۔“

لیکن مودودی صاحب (روپے کے بل بوتے پر) ایسی پوزیشن حاصل کر چکے تھے کہ ان حضرات کی جماعت سے علیحدگی انہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکی۔ اودوہ اپنے عزائم میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔

علامہ اقبالؒ نے اسلامی نظام اور اس میں مرکزِ ملت کا تصور شرعی زبان میں پیش کیا تھا، جو بہر حال، اشاراتی اور تلخیصاتی ہوتی ہے۔ میں نے ان اشارات کی تفصیل اپنے مقالات اور تصنیفات میں شرح و بسط سے پیش کی۔ اس نظام کے قیام سے اس جماعت کے حصولِ اقتدار اور مودودی صاحب

کے آمر مطلق ہونے کی سبب امیدیں خاک میں مل جاتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اس تصور کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ میں نے پہلے دن سے یہ التزام رکھا ہے کہ جہاں بھی مرکزیت کی اصطلاح استعمال ہے اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس سے مراد اس اسلامی مملکت کی سنٹرل اتھارٹی ہے جو علیٰ منہاج نبوت قائم کی جائیگی۔ میں نے اس نظام کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کے بمنزلہ قرار دیا تھا۔ نظام ربوبیت (قرآن کے معاشی نظام) کے سلسلہ میں بھی میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ افراد مملکت کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری اس نظام (خلافت علیٰ المنہاج نبوت) کے سر پر ہوگی۔ اور اس کے اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ ذرائع پیداوار اس نظام کی تحویل میں رہیں۔ میں شروع سے آخر تک، سیکولر نظام، اور اشتراکیت کے معاشی نظام کی شدت سے مخالفت کرتا چلا آیا ہوں۔ میری ہزار ہا صفحات پر مشتمل تحریریں اس حقیقت کی شاہد ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ہمارے برسرِ اقتدار طبقہ کی عیاشیوں اور فحاشیوں کا چرچا کرتے ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس شخص (یعنی پرویت) کو دیکھئے کہ وہ ایسے لوگوں کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کے مرادف قرار دیتا ہے، اور ان کے سپرد ذرائع پیداوار کرنے کو اسلام کا معاشی نظام کہتا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ماہنامہ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۷۶ء کے اشارات میں تحریر ہے:-

”اسی طرح آپ نظام ربوبیت“ پر غور کریں۔ یہ اصطلاح اپنے مزاج کے اعتبار

سے ایک دینی اصطلاح ہے۔ اور اسے سن کر کسی سلیم الفطرت انسان کے ذہن

میں اسلامی نظام کا نقش ہی اُجاگر ہوتا ہے۔ کیونکہ کائنات کے خالق نے انسان

کی ساری احتیاجات کا بطریق احسن انتظام کر رکھا ہے۔ اس ذات نے ایک

طرف اگر انسان کی مادی احتیاجات کی تسکین کے لئے ذرائع و وسائل ہیسا کئے

اور ضابطے مقرر فرمائے ہیں تو دوسری طرف انسان کی روحانی پیاس بجھانے اور

اس کے اخلاقی احساسات کو زندہ رکھنے کا بھی پورا پورا التزام کیا ہے۔ لیکن مادی

فلسفہ حیات انحصاراً اشتراکیت کے زیرِ اثر اس مقدس اصطلاح کو اس طرح بگاڑا

گیا ہے کہ اُسے سننے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسے نظام کا تصور آتا

ہے جس میں انسانوں کا ایک محدود سا گروہ مرکزیت کے نام پر نہ صرف کسی

ملک کے وسائل رزق پر قابض ہو، بلکہ اس کے سیاہ و سفید کا بھی پوری طرح مالک ہو۔ اور پھر وہ اپنی صوابدید کے مطابق عوام کو روٹی کے نوالے تقسیم کرے۔ کیا اس اصطلاح کے پردے میں اشتعالیت کا پرچار نہیں کیا جا رہا؟ یہ اصطلاح جب جدید مفہوم کے ساتھ سامنے آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے غالباً وضع ہی اس غرض کے لئے کیا گیا ہے کہ دنیا کو یہ یاد دلا جائے کہ کسی ملک کے وسائل معیشت پر حکومت کی مکمل اجارہ داری صرف اشتعالیت کا ہی طغوان امتیاز نہیں بلکہ اسلام بھی اس قسم کے جابرانہ نظام کا علمبردار ہے۔

اس سے ہمارے سادہ لوح عوام کے دلوں میں میرے خلاف جس قسم کے جذبات نفرت اور خود مرکزیت کی اصطلاح کے خلاف جس قسم کا بغیانہ تصور ابھرے گا وہ ظاہر ہے۔ یہ ہے وہ ٹیکنیک جس سے یہ حضرات ایک طرف علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ اور میرے وضاحت کردہ اسلامی نظام کا اس قدر بھیاں اور نفرت انگیز تصور لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ صاحب کی شخصیت کو اٹھارتے چلے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ پچھلے سال انہوں نے ان کو "اللہ کے شاہکار" کے لقب سے بھی نوازا تھا۔

یہ ہے براہِ رائے عزیز! مختصر سی تفصیل اس نکتہ کی، جسے میں نے پہلے پیش کیا کہ اگر مودودی صاحب کے عزائم کی علمبردار اسلامی جماعت یہاں نہ اٹھتی تو اس خطہ زمین میں اسلامی نظام، یعنی مملکت علیٰ منہاج النہوت کے قیام کے امکانات بڑے روشن تھے۔ اگر علامہ اقبالؒ زندہ رہتے تو وہ اس عجز کی بھی اسی طرح مخالفت کرتے جس طرح انہوں نے "احمدیوں" کی تحریک کی مخالفت کی تھی، اس لئے کہ وہ اس خطہ زمین میں اسلامی نظام کے احیاء کی کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ ان کے ایمان کا تعامن اور عشق کا منتہی تھا۔ اور یہی کیفیت عزیزانِ من! اس ذرۂ ناچیز کی بھی ہے۔ صدیوں کے بعد یہ حسین اور تابناک تصور ہمارے سامنے آیا تھا۔ کوئی شخص جس کی نگاہوں میں قرآنی بصیرت اور سینے میں دردِ اسلام سے لبریز دل ہے، اس تصور کو یوں برباد ہوتے دیکھ نہیں سکتا۔

کے تو انم دید ز اہد حجاب صہبائش کند
می پر درنگم حبابے گہ بدر یا بشکند

آخر میں، میں پھر اس امر کی وضاحت کر دوں کہ اسلامی نظام کے احیاء اور قیام کے لئے جب بھی کہیں کوششیں شروع ہوں گی تو اس کا قیام ایک دن میں عمل میں نہیں آسکے گا۔ یہ بتدریج رفتہ رفتہ متشکل ہو سکے گا۔ علامہ اقبالؒ کے ذہن میں یہی نقشہ تھا اور میں بھی اس کی وضاحت کرتے جا رہا ہوں کہ امت مسلمہ کی مختلف موجودہ مملکتوں کے وجود اور تشخص کو برقرار رکھنے دیا جائیگا لیکن ان میں ایک ایسا مرکز ہی مطلق قائم کیا جائیگا جس کی بنیادی شرط یہ ہوگی کہ یہ مملکتیں باہم دگر کبھی آمادہ جنگ نہیں ہوں گی۔ ان کے اختلافی امور کے فیصلے اس آفاقی مرکز کی رُو سے ہوں گے، اور جہاں تک ان کی خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، ان میں سے کسی ایک کا دشمن، ان سب کا دشمن قرار پائے گا۔ ان کے آئین اور قوانین کی سند اور جہت خدا کی کتاب قرآن کریم ہوگی۔ اس کی حدود کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین مرتب کریں گے۔ ایسا کہنے میں ظاہر ہے کہ اس وقت جتنے قوانین شریعت کے نام سے رائج ہیں تہذیبی قوانین کے سلسلہ میں وہ ان سے استفادہ کریں گے۔ ان کے اس طرح مدد اور نافذ کردہ قوانین کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ اس طرح مذہبی پیشوائیت کی اتھارٹی ختم ہو جائے گی۔ اور اگلی شرط یہ کہ ان مملکتوں کے ارباب اقتدار کی ستیرا سوتہ محمدی کے رنگ میں رنگی ہوگی۔ اس طرح آغاز کار ہوگا تو پھر رفتہ رفتہ ایک دن یہ امت، امت واحدہ بن جائے گی۔ ان کا ایک ہی صابطہ قوانین ہوگا۔ ایک ہی مملکت اور اس مملکت کی ایک ہی سنٹرل اتھارٹی، جس کی اطاعت، خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے بمنزلہ قرار پائے گی اور یہی وہ وحدت ہوگی جو آخر الامر وحدتِ انسانیہ کے اجتماعی نظام پر منتج ہوگی۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ جب تک ایسا نہ ہو، مذہبی ارکان کی ادائیگی (نماز، روزہ وغیرہ) کے سلسلہ میں امت جن طریقوں پر چلی آ رہی ہے۔ ان میں کسی قسم کا رد و بدل یا حکم و اضافہ نہ کیا جائے۔ البتہ ان میں جو امور قرآن کے خلاف ہوں، ان کی نشاندہی کی جائے۔ اور آخری بات یہ کہ یہ امت، بڑی بھلی جیسی بھی ہے، اس کے ساتھ دابستہ رہا جائے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کہیں ان دلوز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ :

کہن شلخے کہ زیر سایہ اُرد پر بہ اُرد سی !
چو بر گش ریخت از دے اشیاء بر آشتن نمک است

اور کہیں ان حسین اور سادہ الفاظ میں کہ :

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور
جو لغم زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
شاخ ہمدرد سے سبقت اندوز ہو کہ تو
ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

(بلنگب دراز)

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اس پر مطمئن ہو کہ نہ بیٹھ جائیں کہ یہ زندگی، اسلامی زندگی ہے۔ ایسا سمجھنا فریبِ نفس ہوگا۔ سمجھا یہی جانا چاہئے کہ یہ ہماری اضطراری حالت ہے جس سے نکل کر، دین کے نظام کے لئے ہر ممکن کوشش کہنا ہمارا فریضہ حیات ہے۔ یاد رکھئے۔ جن کوششوں کو اس وقت "اسلامی خستہ" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ سب "مذہبِ اسلام" کی تقویت اور شروع کی کوششیں ہیں نہ کہ دینِ اسلام کی۔ اور اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کیجئے کہ مذہب جس قدر آگے بڑھنا جائے گا، دین اسی قدر پیچھے ہٹنا چلا جائے گا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے، خدا آپ کو توفیق دے تو آپ (ارمغانِ حجاز میں) اقبالؒ کی مایہ ناز نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ بات سمجھ میں آجائے گی۔ اس میں ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا یہ ہے کہ :-

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
اس اُمت کو بدستور سلائے رکھنے کی تدبیر یہ ہے کہ :-
مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کہ دو مزاجِ خائف ہی میں اسے

اس وقت، اسلام کے فروغ کے نام سے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ اس اُمت کو مزاج نہایت ہی میں پختہ
ترک کرنے کا ذریعہ ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! ذکرِ اقبالؒ کے سلسلہ میں میرا آج کا پیغام۔ **والسلام!**

تتمہ خطاب

اس خطاب کے سلسلے میں بعض حضرات نے کچھ سوالات دریافت کئے اور بعض نے اس کے چند
ایک نکات کی وضاحت چاہی۔ میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے۔ لہذا اس وقت
کو اس تتمہ کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔

سوال :- آپ نے کہا ہے کہ تھیا کر لسی کی بدترین شکل انفرادی آمریت ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے مرزا
غلام احمد اور مودودی صاحب کو ایک ہی پلٹے میں دکھا ہے۔ اس کی مزید وضاحت کی ضرورت
ہے۔

جواب :- میں نے مرزا صاحب اور مودودی صاحب کو ایک ہی پلٹے میں نہیں دکھا، جہاں تک ان کے دھاگے
کا تعلق ہے ان کا پلٹا بے شک ایک ہی ہے۔ لیکن جہاں تک ان کی تحریکوں کا تعلق ہے، مودودی
صاحب کی تحریک، تحریک ”احمدیت“ سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

آپ پہلے انفرادی آمریت کو لیجئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرشد و ہدایت کا سلسلہ اس طرح رہا ہے کہ
ایک رسول آتا، لوگوں تک دینِ خداوندی پہنچاتا اور اپنے دائرے کے اندر سے قائم بھی کر دیتا۔ ازاں بعد جب
وہ دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تو پھر ایک اور نبی آجاتا، اور وہ اپنی دعوت و تبلیغ کے ذریعے مذہب کو دین
میں بدل دیتا۔ یہ سلسلہ انفرادی تھا۔ یعنی یہ فریضہ ایک فرد سرانجام دیتا تھا، جسے نبی یا رسول کہا جاتا تھا حضور
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر پہنچنے کے بعد مشیتِ خداوندی نے اپنے اس پر وگدگام میں تبدیلی کی۔
افراد کا سلسلہ ختم کر دیا اور اس کی جگہ نظام نے لے لی۔ یہی ختم نبوت کی اصل و اساس اور اہم اور غایت تھی۔
حقیقت یہ ہے کہ یہ تبدیلی خود نوعِ انسان کی تاریخ میں ایک بہت بڑے انقلاب کا آغاز تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے تشریف براری کے بعد یہ نظام بدستور قائم رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود
اس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے رکھوا دی گئی تھی جہاں تک وحیِ خداوندی
کا تعلق تھا اس میں نہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر کا کوئی دخل تھا، اور نہ ہی کسی سے کوئی مشورہ لینے کا

سوال۔ لیکن جہاں تک وحی خداوندی کی رو سے عملی نظام کا تعلق تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم دیا گیا کہ
 وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۲۸۱) ”تم، معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو“ اسی حکم کی پابندی
 جانشینان رسولؐ کے لئے بھی لازم قرار دی گئی اور ان کے متعلق کہا گیا، وَأَصْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۲۸۲)
 ”ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے“ لہذا اس نظام میں، جہاں تک وحی کا تعلق تھا، وہ
 قرآن کریم کی شکل میں موجود تھی اور جہاں تک نظام کے عملی مسائل کا تعلق تھا اس کے لئے اُمت کے باہمی
 مشورہ کا حکم تھا۔ لہذا اس نظام میں، فرد کی دینی حیثیت کچھ نہیں تھی۔ خود خلیفہ الرسولؐ کی طرف سے جو احکام و
 قوانین نافذ ہوتے تھے وہ بھی اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کی حیثیت سے ہوتے تھے۔ اس فرد کی ذاتی حیثیت
 کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا نہ وہ مامور من اللہ ہوتا تھا اور نہ ہی دین میں سند قرار پاتا تھا۔

جب اس نظام کا سلسلہ منتشر ہوا تو دین کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اس مذہب میں اگرچہ مختلف
 فرقوں کی نسبت مختلف ائمہ (افراد) کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن ان ائمہ میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ
 دین میں سند میری ذات ہے۔ یہ دعویٰ مرزا غلام احمد نے کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام وہی اسلام ہے جسے میں
 اسلام قرار دے دوں۔ جو لوگ اس اسلام کو، اسلام مانیں، وہ مسلمان ہیں۔ جو ایسا نہ مانیں وہ مسلمان نہیں خواہ
 وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتے رہیں۔ (ان امور کی تفصیل میری کتاب ”ختم نبوت اور تحریک احمدیت
 میں ملے گی) مرزا صاحب نے کہا کہ اتباع محمدؐ سے میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں دوح محمدی میرے اندر
 حلول کر چکی ہے۔ اس لئے میں رسول اللہ کا ظل اور بروز ہوں۔ چنانچہ (جیسا کہ میں نے خطاب میں کہا ہے) اہو
 نے کہا کہ رسول اللہ کی احادیث میں سے جسے میں صحیح قرار دوں اُسے صحیح سمجھا جائے، جسے میں مسترد کر دوں
 اسے مسترد کر دیا جائے۔ بعینہ یہی پوزیشن مودودی صاحب

مرزا غلام احمد اور مودودی صاحب | نے اختیار کی اور احادیث کے سلسلے میں کہا:۔

”جس شخص کو اللہ تعالیٰ توفیق کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس کے اندر قرآن اور
 بصیرت رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ جو شخص
 اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت
 رسولؐ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج
 شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ

ان میں کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنت نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح، روح محمدی میں گم، اور اس کی بصیرت، بصیرت نبویؐ کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔

(تفہیمات حصہ اول)

آپ غور کیجئے کہ کیا مرزا صاحب کے دعویٰ اور مودودی صاحب کی اس حیثیت میں کوئی فرق ہے؟ فرق اتنا ہی ہے کہ مرزا صاحب نے کھلے الفاظ میں دعویٰ کر دیا اور مودودی صاحب نے اس کی احتیاط برتی۔ اور یہ اس لئے کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ کھلے طور پر دعویٰ کا اعلان کرنے کے خلاف جمہور مسلمانوں کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔

جس طرح مرزا صاحب نے موجودہ مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک وہ جو ان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیں اور دوسرے وہ جو ان کے اس دعویٰ کا انکار کر دیں۔ انہیں وہ دائرۃ اسلام سے خارج قرار دیتے تھے۔ مودودی صاحب نے بھی مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی موجودہ مسلمانوں کو انہوں نے ”پیدائشی مسلمان“ قرار دیا اور کھلے بندوں کہہ دیا کہ:-

”ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟“

(ترجمان القرآن - ذوالحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۴۱۵)

ان کے برعکس، بھرے، پتے اور سکہ بند مسلمان انہیں قرار دیا جو ان پیدائشی مسلمانوں میں سے تجدید ایمان جماعت اسلامی میں داخلہ کی شرط | اپنے خطاب میں بتایا ہے کہ انہوں نے اگست ۱۹۴۱ء

میں اپنی جماعت کی بنیاد رکھی۔ و مناحت کے طور پر یہ سن لیجئے کہ انہوں نے اس جماعت میں داخل ہونے کے لئے شرط کیا قرار دی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا:-

علی شکل کب دی تھی ؟

جواب : وہ جب دسمبر ۱۹۳۷ء کے اواخر یا شاید ۱۹۳۸ء کے شروع میں، پٹھانکوٹ گئے ہیں تو اس وقت حضرت علامہ اقبالؒ حیات تھے۔ ان کی زندگی میں مودودی صاحب اس قسم کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس انہوں نے اُس وقت اعلان کیا تھا کہ اسلام کی رُو سے اُمت کے اندر کوئی الگ جماعت بنانا جائز نہیں۔ انہوں نے فروری

جماعت سازی ممنوع ہے

۱۹۳۸ء میں، ماہنامہ ”پیغام حق“ میں اپنا ایک مقالہ شائع کیا تھا۔ جس میں یہ لکھا تھا کہ :-

”یہ قوم تو پہلے ہی ایک جماعت ہے۔ اس جماعت کے اندر کوئی الگ جماعت، الگ نام

سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وروی یا کسی ظاہری علامت

یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں

میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا، دراصل

مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پرازی

اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جماعت سازی کے یہ طریقے اہل غر

سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں

وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آسکتیں۔“

ضمنی اس زمانے میں خاکساروں کی تنظیم ایک مؤثر جماعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ مودودی صاحب کے

مقالہ میں ”ورہی“ یا ظاہری علامت سے خاکساروں کی طرف اشارہ تھا۔ علامہ مشرقی (مرحوم) کو آپ

جانتے ہیں، وہ کسی کو نکتے و لے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے اخبار ”الاصلاح“ میں مودودی صاحب

کو سخت ڈانٹ پلائی، جس کا عنوان تھا :-

”پٹھان کوٹ میں مذہبی بد معاشی کا نیا اڈہ !“

پھر حال، مودودی صاحب نے اقبالؒ کی زندگی میں تو اس کی جرأت نہ کی، لیکن (ان کی خوش قسمتی اور قوم کی

بد نصیبی کہ) حضرت علامہ کا انتقال وہی ماہ بعد (اپریل ۱۹۳۸ء میں) ہو گیا اور اس کے بعد انہوں نے اپنے پروگرام

کی طرح دہلی شروع کر دی۔ میں نے اپنے خطاب میں بتا لیا ہے کہ قائد اعظمؒ جہاں یہ کہتے تھے کہ مطالبہ پاکستان

کا مقصد ایک ایسے خطہ زمین کا حصول ہے جس میں قرآنی نظام قائم کیا جائے، اس کے ساتھ ہی اس کی وضاحت

بھی کئے جاتے تھے کہ اس مملکت میں تھیا کہ لسی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔
(مثلاً، جب وہ ۱۹۳۱ء میں) حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے تو انہوں نے

تھیا کہ لسی کے خلاف

عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے اس سوال کے جواب میں (کہ مذہب اور مذہبی حکومت کے لازم کیا ہیں) فرمایا:-

”جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامعالم میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قرآن میں اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوششیں کی ہیں۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور انسانی حقوق کا جو حق ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔“

اس کے بعد طلباء کی طرف سے پوچھا گیا:-

”جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہ وہاں اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور بروہ ترقی لاسکیں تو پھر اس میں کون سا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے؟“

سوال آپ نے سُن لیا۔ اب قائد اعظم کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ انہوں نے کہا:-

”وقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بلا اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو چند مولویوں کا اجارہ خیال کہہ لیتی ہے اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے

باد و جھڑ میں یا آپ میں (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ انہیں میں، ان مولوی صاحبان میں (الآ ماشاء اللہ) نہیں پاتا (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

اسی حقیقت کی انہوں نے، قیام پاکستان کے بعد، اہل امریکہ کے نام اپنے ایک براڈ کاسٹ میں (فروری ۱۹۴۸ء میں) ان الفاظ میں وضاحت کر دی کہ:-

”کچھ بھی ہو۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیکا کر لسی رائج نہیں ہو گی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں سے دی جاتی ہے کہ وہ (بزرگ خدیش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ (تعاریر بحیثیت گورنر جنرل مئی ۱۹۵۷ء)

یہ بھی وہ وارننگ، جس سے مودودی صاحب نے سیمو لیا کہ مجوزہ پاکستان میں، اقتدار میں ان کا کوئی حق نہیں ہو سکتا۔ اس سے انہوں نے قائد اعظمؒ اور تحریک پاکستان کی مخالفت شروع کر دی۔ اس سلسلے میں طلوع اسلام میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ دو ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مودودی صاحب نے لکھا کہ:-

”افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے پرکھتا ہو۔۔۔۔۔ ان کے خیالات، نظریات اور طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خود بین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جاسکتی۔“

تحریک پاکستان کے متعلق کہا کہ:-

”جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہوں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔“

یہ تمام عبارتیں ان کی کتاب۔ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ میں موجود ہیں۔

اس تحریک کے ماحصل کو کافرانہ اور اس کی قیادت کو فاسقانہ اور فاجرانہ کیوں قرار دیا جا رہا تھا؟

محض اس لئے کہ نہ یہ تحریک ان کی جماعت کی پیدا کردہ تھی اور نہ ہی اس کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس لئے وہ کہتے تھے کہ :-

”مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ سوال میرے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان

کو انگریزی امپریلزم سے آزاد کرایا جائے۔۔۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس

مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت

قائم ہو جائے۔۔۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت

نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔“ (ایضاً)

انہیں مجوزہ پاکستان میں دلچسپی اس لئے نہیں تھی کہ اس میں زمام اقتدار ان کے ہاتھ میں نہیں رہتی تھی۔

سوال ۳:- مودودی صاحب نے تحریک پاکستان کی مخالفت اس زمانے میں کی تھی جب یہ واضح نہیں تھا کہ

پاکستان میں کس قسم کی حکومت قائم ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے ”سیاسی کش مکش، حصہ سوم میں کہا

تھا کہ :-

”اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں

کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی

نظام حکومت قائم کرنا ہے۔“

اسی بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ ”میرے نزدیک

جو سوال سب سے اہم اور اقدم ہے وہ یہ ہے

مودودی صاحب کو سب کچھ معلوم تھا

کہ آپ کے اس ”پاکستان“ میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ

جمہوریت کے مطابق؟ عوام کی حاکمیت پر؟ اگر یہ بات واضح ہوتی تو وہ کبھی اس کی مخالفت نہ کرتے۔

جواب :- جماعت اسلامی کی طرف سے یہ بات اکثر دہرائی جاتی ہے اور یہ، کذب بافی اور مغالطہ افزائی

کی بدترین مثال ہے۔ یہ شوشہ بھی مودودی صاحب ہی کا چھوڑا ہوا ہے۔ جنوری سنہ ۱۹۷۹ء کی بات

ہے کہ مسٹر بھٹو نے کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے دوران، مودودی صاحب کی کتاب -

”مسلمان اور سیاسی کش مکش، حصہ سوم“ - کے وہ اقتباسات پڑھ کر سنائے جن میں پاکستان

کی مخالفت اور قائد اعظمؒ کی شان میں گستاخیاں کی گئی تھیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے

بیان دیا جس میں کہا کہ :-

”اس کتاب کے مضامین ۲۰-۱۹۳۹ء میں لکھے گئے تھے جب ہنوز قرارداد پاکستان منظور نہیں ہوئی تھی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کو ایک قومی ریاست کی بجائے اسلامی ریاست کے نصب العین کی طرف موڑ دیا جائے۔“

(روزنامہ امروز و مشرق - مودعہ ۱۰ جنوری ۱۹۴۷ء)

آپ دیکھئے کہ اس میں کس چابکدستی سے مغالطہ آفرینی اور فریب دہی کی کوشش کی گئی ہے۔ ”سیاسی کشمکش“ کے موضوع پر مقالات کا یہ سلسلہ بے شک ۱۹۳۹-۴۰ء سے شروع ہوا ہے۔ لیکن تحریک پاکستان اور قائد اعظم کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ان کے رسالہ ”ترجمان القرآن“ کی فروری ۱۹۴۱ء و مارچ ۱۹۴۱ء کی اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ یعنی قرارداد پاکستان کے منظور ہونے کے ایک سال بعد۔ بعد میں یہ مضامین کتنا مشکل میں بھی شائع کئے گئے اور قائد اعظم اور تحریک پاکستان کے خلاف مقالات اس کی تیسری جلد میں شائع کئے گئے۔۔۔۔۔ اس جلد پر یہ تو نہیں لکھا گیا کہ وہ کب شائع ہوئی تھی لیکن اس میں جماعت اسلامی کے پہلے اجتماع کا ذکر موجود ہے۔ جو اگست ۱۹۴۱ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس شہادت سے واضح ہے کہ یہ کتاب کم از کم اگست ۱۹۴۱ء کے بعد شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں لیکن کسی میں ان باتوں کی تردید نہیں کی گئی جو تحریک پاکستان اور قائد اعظم کی مخالفت میں کہی گئی تھیں۔

لیکن یہ بات دکر مودودی صاحب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مطالبہ پاکستان ایک ایسے خطرہ زمین کا حصول ہے جس میں اسلامی نظام حکومت قائم کیا جائے گا، اس سے بھی بہت پہلے کی بات ہے۔ ذرا غور سے سنیے۔ جماعت اسلامی کے ترجمان - ایشیا - کے ۲۵ اگست ۱۹۴۸ء کے ادارہ میں غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی مختلف تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ :-

”۱۹۳۶ء تک یہی حالت رہی۔ لیکن **فَقِوْا إِلَى اللَّهِ** کی پکار کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان

ان سب نصب العینوں سے مایوس ہو کر یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کی نجات اسلام میں ہے۔۔۔

مسلم لیگ نے اس نصب العین کو اپنا لیا ہے۔ اس کے لیڈروں نے ایک خالص اسلامی سلطنت

کے قیام کے خواب کی تصدیق کی اور دیکھتے دیکھتے پوری مسلمان قوم اس کے علم تلے جمع ہو گئی۔“

اس سے واضح ہے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد سے مسلمان ہند نے ایک اسلامی مملکت کا نصب العین اپنے سامنے

رکھ لیا تھا اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے اسے اپنا کمر ایک خالص اسلامی سلطنت کے قیام کے خواب کی تصدیق کر دی تھی۔

یہ سلسلہ کی بات ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب نے سلسلہ میں لاہور میں منعقد اقبال ڈٹے میں شرکت کی۔ (جہاں تک مجھے معلوم ہے انہوں نے تشکیل پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ ایسا کیا تھا اور یہ شاید اس لئے کہ اس وقت الیکشن قریب آ رہے تھے، بہر حال، اس تقریب میں انہوں نے اپنی تقریر میں کہا:-

”اقبالؒ نے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ اس سے سیاسی آزادی مقصود نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت مقصود ہے۔ اقبالؒ نے آپ کو نظریہ دیا۔ اور قائد اعظمؒ نے اس نظریہ کی بنیاد پر ایک وطن حاصل کیا۔“

(ایشیا - مورقہ ۲۶، اپریل ۱۹۳۸ء)

علامہ اقبالؒ کی وفات اپریل ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ لہذا ان کی مذکورہ بالا وضاحت بہر حال اس سے پہلے کی بات ہے۔ اس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کو کم از کم ابتداء سلسلہ میں اس کا علم تھا کہ مطالبہ پاکستان سے کیا مقصود تھا۔ اور ”سیاسی کش مکش“ کا سلسلہ مضامین دلیقول مودودی صاحب، اس کے بعد شروع کیا گیا تھا۔ اور آگے بڑھئے۔ نوائے وقت کی گیارہ ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں، ایک رنگین چوکھٹے میں، مودودی صاحب کا ایک بیان شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ:-

”قائد اعظمؒ کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت، بقا اور نشرو نما کا اصل سرچشمہ

اسلام ہے۔ اس لئے انہوں نے بار بار اس کا اعلان کیا کہ پاکستان میں، اسلامی جمہوری

نظام قائم کیا جائے گا۔“

ایشیا کی ۲۰ اگست ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کا ایک بیان شائع ہوا، جس میں انہوں نے کہا کہ

”اگر تحریک پاکستان کے آغاز میں وہ نہ کہا جاتا کہ پاکستان اسلامی شریعت کے نفاذ اور

اسلامی نظام زندگی قائم کرنے کے لئے بنانا مطلوب ہے تو اس تحریک کو کبھی مسلمانوں کی تائید

حاصل نہ ہوتی اور نہ ہی یہ ملک وجود میں آتا۔“

خود، مودودی صاحب کے رسالہ - ترجمان القرآن - کی جون ۱۹۶۵ء کی اشاعت کے ”اشارات“ ان الفاظ

سے شروع ہوتے ہیں:-

”بر عظیم ہند کے سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ کہ وڑوں باشندے اور پوری دنیا کا پرہیز اس حقیقت پر گواہ ہے کہ تحریک پاکستان کے پیچھے نہ کوئی سیاسی غرض کارفرما تھی اور نہ معاشی مصلحت۔ اس کا محرک صرف ایک ہی جذبہ تھا کہ مسلمانوں کو ایک ایسا الگ خطہ ارض مل جائے جس میں وہ بڑی آزادی کے ساتھ اسلامی نظام حیات نافذ کر سکیں۔“

ذرا آگے چل کر لکھا ہے۔

”یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ نظریہ پاکستان کے بانی اور تحریک پاکستان کے قائد ہر موقع پر مسلمانوں کو یہی کہتے رہے کہ اس ملک کے قیام کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ یہاں اسلام کی ایک ایسی تجربہ گاہ قائم کی جائے جس سے مادی تہذیب سے ستائی ہوئی انسانیت آرام اور سکون حاصل کر سکے۔“

آپ مودودی صاحب کے ان بیانات کو دیکھئے مگر میں کہا گیا ہے کہ تحریک پاکستان کے آغاز سے آخر تک اس کے قائدین واضح الفاظ میں یہ کہتے رہے اور بار بار کہتے رہے کہ اس تحریک اور مطالبہ کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس قطعہ زمین میں اسلامی نظام قائم کیا جاسکے۔ اور اس کے مقابلے میں مودودی صاحب ہی کا ۱۹۴۱ء کا یہ بیان دیکھئے کہ ”لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں یہ بات آج تک واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب کا یہ بیان کہ انہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت اس زمانے میں کی تھی جب ہنوز لیگ کی سلسلہ کی قرارداد منظور نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس قرارداد کے پاس ہونے کے بعد انہوں نے اسے غیر اسلامی تحریک کہہ کر اس کی مخالفت نہیں کی تھی لیکن اس کا کیا جواب کہ ان کی مخالفت کا یہ سلسلہ تشکیل پاکستان تک جاری رہا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو یعنی قیام پاکستان سے کوئی چار مہینے پہلے اعلان پاکستان پاکستان سے صرف دو مہینے پہلے) کوٹک میں اسلامی جماعت کا ایک اہم جلسہ ہوا جس میں مودودی صاحب سے مسلم لیگ کے بارے میں سوالات پوچھے گئے۔ انہوں نے جواب میں کہا :-

”اے تو سائل صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی ہے۔۔۔۔۔ جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں

کہ وہ اس کا ساتھ دے۔“

(ترجمان القرآن - جلد ۳۰ - عدد ۶ - بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر ص ۳۳)

سوال ۱۲۹: جب مودودی صاحب تحریک پاکستان کے آغاز سے لے کر اس کے آخری مرحلے تک اسے غیر اسلامی قرار دیتے رہے تو پاکستان آنے کے بعد وہ بار بار کیوں کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اس کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں اسلامی نظام قائم ہو؟

جواب: اس سوال کا جواب ظاہر ہے۔ مودودی صاحب کی اس زمانے میں ساری کوشش یہ تھی کہ لوگ قائد اعظم سے مغرب ہو کر انہیں اپنا قائد تسلیم کر لیں اور مسلم لیگ کی بجائے ان کی جماعت کا ساتھ دیں۔ اس کے لئے یہ کہا گیا کہ مسلم لیگ کی تحریک غیر اسلامی ہے اور اس کی قیادت میں اسلامی ذہنیت کا چھٹا ٹک نظر نہیں آتا۔

اب اسلام، اسلام کیوں؟

اس کے برعکس اسلام کے داعی اجارہ دار ہم ہیں۔ جب یہ اس مقصد میں ناکام رہے اور پاکستان بن گیا تو انہوں نے یہاں آئے ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو۔ اور ہم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اسلامی نظام کی الف ب سے بھی واقف ہو۔ اسلامی نظام کیا ہوتا ہے، یہ ہم جانتے ہیں۔ اس لئے زمام اقتدار ہمارے ہاتھ میں دوتا کہ ہم وہ مقصد پورا کر دکھائیں جس کے لئے یہ خطہ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۴۸-۴۹ء سے یہ راگ اپنا شروع کر دیا کہ:-

”کسی قوم کی اور ملک کی انتہائی بد قسمتی یہی ہو سکتی ہے کہ نااہل اور اخلاق باختہ قیادت

اس کے اقتدار پر قابض ہو جائے۔۔۔۔۔ ایسے حالات میں غیر صالح قیادت کو ایک منسلک

کے لئے بھی گواہ کرنا خلافت مصلحت ہے۔ ایک غلط قیادت کی بقاء کے لئے اس طرح کی

کوشش کہ نامک اور قوم کے ساتھ، سب سے بڑی عذاری، اور غلط قیادت سے نجات

دلانے کی فنکارانہ، اس کی سب سے بڑی خیر خواہی ہے۔“

(ترجمان القرآن - جون، جولائی ۱۹۴۹ء)

یہ ہے مقصد مودودی صاحب کے سامنے پاکستان بننے کے بعد۔ اور یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے انہوں نے اس منصوبہ ملک میں ایک دن بھی ایسا نہیں آنے دیا کہ لوگ اطمینان کا سانس لے سکیں۔ اور یہی کچھ کہہ رہیں گے جب تک اقتدار ان کے ہاتھ میں نہ آجائے۔ جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے گا تو پیدائشی

مسلمانوں کا حشر کیا ہوگا۔ اس کے لئے ان کا کتابچہ - مرتد کی سزا - ملاحظہ کیجئے جس میں واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے کہ انہیں ایک سال کا نوٹس دیا جائے گا اور اگر وہ اس دوران میں ان کا مقرر کردہ اسلام قبول نہیں کریں گے تو انہیں قتل کر دیا جائیگا۔

سوال ۱۵: آپ نے کہا ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب نے مودودی صاحب کو لکھا کہ وہ ”خود مرکزیت“ کے خناس کو اپنے دماغ سے نکال دیں۔ مودودی صاحب کی طرف سے اس کا کوئی جواب دیا گیا۔۔۔۔۔

جواب: جی ہاں جواب دیا گیا۔ یعنی حسب معمول گالیوں کی بوچھاڑ۔ مودودی صاحب کی تکنیک یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو خود گالیاں نہیں دیتے بلکہ خود کو خاموش رہتے ہیں اور اپنے مصاحبوں سے انہیں گالیاں دلوانے رہتے ہیں۔ اس سے (حقیقت سے بے خبر) لوگ یہ تاثر لیتے ہیں کہ دیکھئے! مودودی صاحب کس قدر بلند ظرف کے انسان ہیں کہ مخالفین ہزار کچھ کہیں، یہ کبھی زبان درازی نہیں کرتے۔ ان کی جماعت سے جو حضرات ۱۹۵۶ء میں الگ ہوئے تھے اور جن کے سرخیل مولانا اصلاحی تھے۔ ان کی شان میں، اس جماعت کے لٹریچر میں جو کچھ کہا گیا وہ درکنار رہا۔ (مولانا) عبدالرحیم شمس نے اپنے جریدہ ”المنبر“ کی اشاعت بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا کہ خود مودودی صاحب ان اختلاف کرنے والوں کو یہ کچھ ثابت کرتے رہے۔

”بخوی کے مرکب، ضعف ارادہ و نفرت کے مریض۔ یک رُخ، تحریک اسلامی کے نادان دوست۔ جماعت کے غدار۔ اقامت دین کی جدوجہد کے روڑے۔ خدا کے خوف سے ریا۔ خائن۔ انتشار پسند۔“

سوال ۱۶: آپ نے کہا ہے کہ جماعت اسلامی والے، مودودی صاحب کو اسلام میں سب سے سمجھتے ہیں۔ اس کی کوئی عملی مثال دیں گے۔

جواب: اس کی عملی مثال تو اس جماعت کی ساری تاریخ ہے۔ آپ اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتے کہ مودودی صاحب نے کسی مسئلہ کے متعلق یہ کہا ہو کہ وہ اسلام کے مطابق یا اس

لے اگرچہ بعض اوقات منسوب الغضب ہوا یہ بھی کچھ نہیں کرتے لیکن بالعموم یہ خود خاموش رہتے ہیں۔

کے خلاف ہے اور ان کی جماعت کے کسی رکن نے اس سے اختلاف کیا ہو۔ مودودی صاحب نے کہا کہ انتخابات میں حصہ لینا اسلام کی رو سے قطعاً جائز نہیں، تو ان کے متبعین نے کہا کہ آئنا وقتاً۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ انتخابات میں حصہ لینا عین مطابق اسلام ہے اور جماعت والوں نے کہا کہ بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ مودودی صاحب نے کہا کہ اسلام کی رو سے عزت کو دوڑ دینے تک کا بھی حق حاصل نہیں اور ان کے معتقدین نے کہا کہ بالکل درست۔ پھر انہوں نے کہا مقررہ فاطمہ جناح (مرحومہ) منصب صدارت کی امیدوار ہیں۔ ان کی مدد کمزور نا عین تقاضائے اسلام ہے۔ جماعت نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ مودودی صاحب نے کہا کہ زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی صوبندی قطعاً اسلام کے خلاف ہے۔ جماعت نے کہا۔ بالکل بجا ارشاد ہوا۔ پھر انہوں نے کہا کہ ملکیت اراضی کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہونی چاہئے اور جماعت نے ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ "نیشنلائزیشن" کا نظریہ ابلیس کی ایجاد ہے۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ جماعت نے کہا، بالکل بجا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ کلیدی صنعتیں قومپائی جاسکتی ہیں۔ جماعت نے کہا بالکل درست۔

غرضیکہ کہاں تک مثالیں پیش کی جائیں۔ اس جماعت کے نزدیک اسلام ہے ہی وہی جسے مودودی صاحب اسلام قرار دے دیں۔

سوال: جب رسول اللہ کی احادیث کے مجموعے مرتب کر لئے گئے تو پھر ان کی رو سے اطاعت رسول اللہ کیوں نہیں کی جاسکتی۔ اس میں کیا حرج واقع ہوتا ہے۔

جواب: سچ تو بالکل واضح ہے۔ اُمت میں جس قدر فرقے پائے جاتے ہیں وہ سب اپنے اپنے مسلک کی تائید میں احادیث رسول اللہ پیش کرتے ہیں اور کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جو یہ فیصلہ کر سکے کہ کون سا مسلک سنت رسول اللہ کے مطابق ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں ارشادات رسول اللہ موجود تھے۔ اگرچہ وہ مرتب شکل میں نہیں تھے

احادیث کی اطاعت

اس وقت ان ارشادات (احادیث) کی بنا پر کوئی فرقہ و جد میں نہیں آیا تھا کیونکہ زندہ سنٹرل اتھارٹی موجود تھی۔ جب یہ نہ رہی تو مختلف گروہ اپنے اپنے طور پر فیصلے کرنے لگ گئے۔ اس طرح اُمت فرقوں

میں بٹ گئی۔ اُمت کا یہ تفرقہ مٹ نہیں سکتا جب تک اس سنٹرل اتھارٹی (خلافت علی منہاج نبوت) کے نظام (کو پھر سے قائم نہ کر لیا جائے۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ خدائی کتاب کے ساتھ رسول کی بعثت کی ضرورت یہ تھی کہ تنہا کتاب کی اطاعت ممکن نہیں تھی۔ آپ سوچئے کہ جب زندہ تھائی کے بغیر خدائی کتاب پر عمل ممکن نہیں تھا تو اس اتھارٹی کے بغیر احادیث کی کتابوں پر عمل کس طرح ممکن ہے؟ اس اتھارٹی کے نہ ہونے سے کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ کے باوجود اُمت کی وحدت ختم ہو گئی اور جب اُمت کی وحدت ختم ہو گئی تو دین باقی نہ رہا۔

سوال ۸: کیا آپ کے نزدیک خلافت راشدہ کے نہج کا اسلامی نظام پھر سے قائم ہو سکتا ہے؟
 جواب: اگر اس نظام یعنی دین کا قیام ممکن نہ ہوتا تو قرآن مجید کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا فائدہ کیا تھا؟ علاوہ بریں خدا کا فیصلہ ہے کہ دین خداوندی تمام نظام ہائے عالم پر غالب آکر رہے گا۔ (لِیُظْهِرَهُ عَلَى الدِّینِ كُلِّهِ) اس نظام کا احیاء ممکن نہیں تو پھر خدا کا یہ وعدہ پورا کس طرح ہوگا؟ یہ نظام قائم ہوگا اور تمام نظام ہائے عالم پر غالب آکر رہے گا کہ ۱۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْعِۤہَادَ (۲۸) "خدا کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔"
 سوال ۹: جب آپ بھی یہ کہتے ہیں کہ اس وقت اسلام دین نہیں، مذہب ہے اور مسلمان دین پر کاربند نہیں۔ اور مودودی صاحب بھی یہی کہتے ہیں تو پھر آپ دونوں میں فرق کیا ہے؟ اور آپ ان کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

جواب: مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ موجودہ اسلام دین نہیں مذہب ہے۔ دین اس اسلام کو سمجھا جائیگا۔ جسے وہ اسلام کہہ دیں۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ ختم نبوت کے بعد کسی فسر د کو حق حاصل نہیں کہ وہ اسلام میں سند بن بیٹھے، میرا اپنا کوئی دعویٰ نہیں۔ نہ میری کوئی پارٹی، عجمت یا فرقہ ہے۔ نہ میں کسی جماعت کا امیر یا فرقے کا امام ہوں۔ میری حیثیت قرآن کریم کے ایک طالب علم اور مبلغ کی ہے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ اس فکر کو عام کرتے جائیں کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ نظام حیات ہے، جس کے لئے ایک مملکت کی ضرورت ہے۔ اس مملکت کا جملہ کاروبار، قوانین و احکام خداوندی کی چار دیواری میں رہتے ہوئے سرانجام پائے گا۔ اس میں ارباب اقتدار وہ ہوں گے جن کی سیرت، سیرت محمدیہ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہوگی۔ قرآن، حدیث، فقہ، سب ان کے سامنے ہوں گے۔ اس

مملکت کی سنٹرل اتھارٹی یا مرکز ملت کی وساطت سے اس کے فیصلے قانونی حیثیت سے نافذ ہوں گے اور ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ یہ سارا نظام امت کے مشورے سے طے پائے گا اور اس میں کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اسلام میں مسند بن بیٹھے اور اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے قائم مقام بن جائے۔ میں اس قسم کے نظام کو خلافت علی منہاج رسالت کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہوں۔ بانی رہے اس وقت کے مسلمان، تو ایسے کچھ وہ ہیں، ویسے ہی ہم ہیں۔ جو حالت ان کی، وہی ہماری۔ یہ حق تو ایک رسول کو ہی پہنچتا ہے کہ وہ اگہ کہے کہ تم سب دین سے منحرف ہو۔ دین لے کر میں آیا ہوں۔ جو میری بات مانے گا وہ دین کا پیر و کہلائے گا۔ جو اسے تسلیم نہیں کرے گا، اسے دین سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسا کہنے والا ختم نبوت کی ہر کوڑ دیتا ہے خواہ وہ "مرزا غلام احمد" ہو یا "سید ابوالاعلیٰ مودودی" جنہیں ان کے متبعین "اللہ کا شاہکار" قرار دیتے ہیں۔ میں تو اس کے تصور تک سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے جسے سادہ لوح مسلمان پہچانتا نہیں۔

سوال (۱)۔ جماعت اسلامی کے زیر اہتمام، حال ہی میں، ملک بھر کے ماہرین قانون و وکلاء صاحبان کا ایک بہت بڑا کنونشن بدیں غرض منعقد ہوا ہے کہ ملک میں قانون شریعت کا نفاذ ہو۔ ان سے کہا گیا ہے کہ وہ قانون شریعت مدون کریں اور یہ بتائیں کہ اس کے نفاذ کی عملی شکل کیا ہونی چاہئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ جماعت (یعنی مودودی صاحب) قانون شریعت کی تدوین اور نفاذ کے خواہشمند بھی ہیں اور اس کے لئے کوشاں بھی۔

جواب ۱۔ میں نے اس کنونشن کی کارروائی اخبارات میں پڑھی ہے اور اس سے مجھے بے حد افسوس ہو رہا ہے۔ افسوس جماعت اسلامی پر نہیں کیونکہ یہ تو ان کے پیرو بگنڈہ کی ایک کڑی ہے۔ افسوس وکلاء حضرات پر ہے جو کنونشن میں شریک ہوئے۔ ہماری قوم کے عوام سادہ لوح بھی ہیں اور جذباتی بھی۔ لیکن قوم کے دانشور طبقہ سے کم از کم یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ معاملات پر جذبات سے الگ ہو کر حقائق و لبصا کی روشنی میں غور و فکر کریں۔ ان میں وکلاء حضرات کا نام سرفہرست آتا ہے۔ کیونکہ ان کا اور ٹھکانا بھجوا قانون ہوتا ہے اور قانون میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر یہ طبقہ بھی عوام کی سطح پر اتار آئے تو اس سے بڑھ کر مقام تأسف اور کون سا ہو سکتا ہے؟

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ یہ کنونشن اس جماعت کی طرف سے منعقد کیا گیا جس کا بانی، وکالت کے پیشہ ہی کو حرام قرار دیتا ہے۔ مودودی صاحب نے ایک متفسر کے سوال کے جواب میں کہا تھا :-

”وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانون الہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشے میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہر حال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں یہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے اور کم از کم اس درجہ میں تو حرام نہیں ہیں جس درجہ کی یہ وکیلا نہ بغاوت حرام ہے۔۔۔۔۔ دکیل کے محرک کا کام بھی حرام ہے۔۔۔۔۔ وکلاء کے ہاں کے کھانا کھانے میں بھی پرہیز ادلی ہے۔“

(ترجمان القرآن، جنوری فروری ۱۹۴۴ء)

مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ وکلاء حضرات کے اس جرمِ غیر میں سے کسی ایک کی حقیقت نے بھی مودودی صاحب سے اتنا دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ جن لوگوں کے پیشے کو آپ قانون خداوندی کے خلاف کھلی بغاوت اور جن کی روزی کو آپ حرام قرار دیتے ہیں انہیں آپ قانونِ شریعت کی تدوین و تنفیذ کے لئے دعوت کس طرح دے رہے ہیں؟ ان میں سے کسی نے بھی ان سے یہ نہیں پوچھا!

۲۔ اب آگے بڑھئے۔ کنونشن کے مقررات میں سے ہر ایک نے، اور خود مودودی صاحب نے، تدوین قوانینِ شریعت کے ضمن میں ”کتاب و سنت“ کے الفاظ دہلے اور کہا کہ یہی قانونِ شریعت کی اساس بنیاد ہیں۔ بہت اچھا! لیکن مودودی صاحب تو خود اعلان کر چکے ہیں کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جاسکتا، جو پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو اور ان پر اس کا اطلاق یکساں طور پر کیا جاسکے۔ ان وکلاء حضرات میں سے کسی نے مودودی صاحب سے یہ نہ پوچھا کہ جب ”کتاب و سنت“ کی رو سے ایسا ضابطہ شریعت مرتب نہیں ہو سکتا تو جس ضابطہ کے مرتب کرنے کے لئے آپ نے ہمیں دعوت دی ہے، اس کی بنیاد کیا ہوگی۔ کتاب و سنت تو خود مودودی صاحب کے الفاظ میں، اس کی بنیاد ہو نہیں سکتی۔ پھر اس کی اور کون سی بنیاد ہوگی۔

ان میں سے کسی نے اتنا نہ پوچھا اور کتاب و سنت کے الفاظ دہراتے چلے گئے۔ اسی سے آپ انداز لگا لیجئے کہ یہ حضرات اور انہیں دعوت دینے والی جماعت اسلامی، نظام شریعت کے مسئلہ میں کس قدر (SERIOUS) ہیں۔

۳۔ اب آئیے ٹیپ کے اس بند کی طرف، ادیدہ دیکھئے کہ اس کنونشن کے انعقاد کی غرض کیا تھی اور مودودی صاحب کے نزدیک نفاذ شریعت کا عملی طریق کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا: ”اسلامی قانون کے نفاذ کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے انہیں اقتدار سے ہٹا دیا جائے اور ان لوگوں کو اقتدار سونپا جائے جو اسلام جانتے اور مانتے ہوں اور اسے دل سے نافذ کرنا چاہتے ہوں۔“

(نوائے وقت، ۳ مئی ۱۹۷۶ء)

فرمائیے! کچھ میں کہتا چلا آ رہا ہوں، اس کے لئے اس سے بڑھ کر کسی اور مہر تصدیق کی ضرورت رہ جاتی ہے؟
سوال ۱۱۔ آپ کہتے ہیں کہ مودودی صاحب آج ایک بات کو مطابق اسلام قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد اس کے خلاف بات کو اسلام کہہ کر پیش کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب فکھ انسان، مزید غور و فکر کے بعد اپنی سابقہ رائے بدل سکتا ہے۔ اس میں کیا ہرج ہے؟

جواب:۔ ایسا کرنے میں کوئی ہرج کی بات نہیں۔ لیکن ایسے ”صاحب فکر“ کے لئے یہ تو ضروری ہے کہ وہ اپنی رائے بدلنے پر اعلان کرے کہ میری رائے غلط اور خلاف اسلام تھی۔ میں نے اب اس سے رجوع کر لیا ہے۔ (جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے) آپ مودودی صاحب کے ہاں اس قسم کے اعتراضات کی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتے حالانکہ بعض مقامات ایسے تھے جن میں ایسا کہنا نہایت ضروری تھا مثلاً مودودی صاحب نے انتخابات (الیکشن) کے سلسلہ میں فیصلہ دیا کہ:-

”ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ (یاد رکھئے) امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نا اہل ہونے کی پہلی اور کھلی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب اور جہاں سامنے

آئے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے؟ (ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۵۷ء)

اس پر ان کے خلاف یہ اعتراض ہوا کہ اگر کسی منصب کے لئے امیدوارین کو اٹھنا خلاف اسلام ہے، اور یہ اس شخص کے غیر صالح ہونے کی دلیل، تو حضرت علیؑ نے اپنے آپ کو منصب خلافت کے لئے بطور امیدوار کیوں پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ حضرت علیؑ کا یہ عمل خلاف اسلام تھا۔

”اور آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ، بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف، تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسولؐ سے مختلف ہو، وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔“

(ترجمان القرآن - اکتوبر ۱۹۵۷ء)

اسی کے چند ہی سال بعد مودودی صاحب کی مصطلحات کا تعلق ہوا کہ انتخاب میں حصہ لیا جائے تو انہوں نے فیصلہ فرمادیا کہ ایسا کرنا عین مطابق اسلام ہے۔ انہوں نے لکھا کہ:

”ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی؟“ (ترجمان القرآن - مئی ۱۹۵۸ء)

آپ دیکھیے کہ مودودی صاحب نے یہ نہیں کہا کہ ان کی پہلی رائے غلط اور خلاف اسلام تھی، اور اب یہ رائے اسلام کے مطابق ہے، لیکن بات اس سے بھی آگے چلتی ہے۔ انہوں نے اپنی رائے کی بنیاد پر حضرت علیؑ کی شان میں جو گستاخی کی تھی، اس حقیقت کے انکشاف کے بعد کہ حضرت علیؑ کا وہ عمل، خدا اور رسولؐ کے ارشادات کے خلاف لغزش نہیں تھا، انہوں نے اس کی ضرورت بھی نہ سمجھی کہ خدا سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لیتے۔ لیکن غلطی کی معافی تو وہ مانگے جو یہ سمجھے کہ اس سے غلطی کا امکان ہے۔ مودودی صاحب اپنے آپ کو اس سے بہت ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ (بقول ان کے بھادر گلاں سید ابوالخیر مودودی صاحب) وہ اپنے آپ کو ”بعد از خدا بزرگ“ کے مقام پر فائز تصور کرتے ہیں۔ (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ)

سوال: (۱۳) مودودی صاحب جب اس قسم کا ہرآن بدلنے والا اسلام پیش کرتے ہیں تو علماء حضرات کی طرف سے اس کی مخالفت کیوں نہیں ہوتی؟

جواب: آپ یہ سوال تو ان علماء حضرات سے پوچھئے۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ اس کی دوجوہات ہیں۔ ہیں، جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت۔ مودودی صاحب جب دارالاسلام پٹھانکوٹ، گئے ہیں تو ان

کے پاس کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے علامہ اقبالؒ کی وفات پر لکھا تھا کہ ان کا وہی ایک مادی سہارا تھا جو تر رہا۔۔۔۔۔ اور آج اس جماعت کی یہ حالت ہے کہ سیم دزر کا سیلاب اُٹے چلا آ رہا ہے۔ اس وقت پاکستان ہی میں نہیں، دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں میں اس کی شاخیں اور مراکز ہیں جن پر ظاہر ہے کہ لاکھوں روپے صرف آ رہے ہیں۔ مجھے انگلینڈ سے ایک دوست نے، وہاں سے شائع ہونے والے روزنامہ ملت کی ۲۳ فروری ۱۹۶۶ء کی اشاعت کا ایک تراشا بھیجا ہے جس میں سلمان روڈ لا پر مرکزی جماعت کے زیر تعمیر مرکز (منصورہ) کی تفصیل درج ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ۶۲ کنال اراضی پر زیر تعمیر، اس مرکز پر ابھی تک چالیس لاکھ روپیہ صرف آچکا ہے۔ اس ایک مثال سے ان کی دولت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دولت کے بل بوتے پر بہت سی مخالفتوں کا منہ بند کیا جاسکتا ہے (مولانا) عبدالحکیم اشرف نے لکھا تھا کہ ۱۹۵۶ء میں اس جماعت کے کل ارکان کی تعداد (۱۳۰۰) کے قریب تھی اودان میں (۱۲۰) تنخواہ دار ملازم تھے۔ (۱ المنبر، اکتوبر ۱۹۶۶ء) آج کا حال خدا جانے۔ ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ ان کی پراپیگنڈہ مشینری مخالفت کرنے والوں کا جو حشر کرتی ہے، اس سے ڈر کر بھی لوگ اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ان سے الجھنا نہ جائے۔ حتیٰ کہ جو لوگ ۱۹۶۵ء میں ان سے الگ ہوئے تھے، انہیں بھی کھل کر ان کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔

پرویز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقریباً اقبال

اپریل ۱۹۷۷ء

اسلامی مملکت کا تصور

اقبالؒ کے نزدیک

بیاساتی بگمرواں ساتگیں را بیفشال بردو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ زندے فاش کر دند کہ ملام شناسد رمزدیں را

دین کی تاریخ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم، بصیرت افروز حقیقت بیان کی ہے۔ جب کہا کہ:-
وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّيَ
الْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ
يُخَكِّمُ اللَّهُ آيَاتِهِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۲۲۱) "اے رسول! تجھے
پیشتر کوئی صاحبِ وحی ایسا نہیں ہوا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گذر ہو کہ (اس کی وفات کے بعد) دین کے مخالفین
نے اس کی وحی میں آمیزش نہ کر دی ہو۔ اس کے بعد خدا ایک اور نبی بھیج دیتا اور اس کی طرف وحی کے ذریعے اس
آمیزش کو زائل کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا صاحبِ حکمت ہے" رسول۔۔۔
... کی وحی میں آمیزش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خدا کا دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ دین نام تھا احکام و اقدارِ خداوند
کو ماسٹر میں قانونی حیثیت سے نافذ کرنے کا۔ اس کے برعکس، مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ایک پل پر
تعلق تھا۔ جہنگلی، پرستش، یا مختلف رسوم کی مڑ سے انفرادی طور قائم ہو جاتا تھا۔ دنیا میں جتنے مذاہب پائے
جاتے ہیں ان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ ابتداء میں دین ہی تھے۔ (قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے ہر قوم میں
رسول بھیجے تھے) مگر وہ پرست گروہوں نے جن کے مرکز وہ مذہبی پیشوا تھے، انہیں مذہب میں تبدیل کر دیا۔ ان
مذہب پیشواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ

يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ
اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (۱۹)

”یہ خود شریعت وضع کرتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ شریعت خداوندی ہے اور ایسا کچھ پیسے کمانے کے لئے کہتے تھے۔ مذہب ان کا پیشہ بن جاتا تھا۔“ خدا نے رسول اللہ کی طرف جو دین بھیجا اس کے متعلق کہہ دیا کہ :

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (۱۹)

”خدا نے اس وحی کی رُو سے اپنے قوانین کو عدل و صداقت کی بنیادوں پر مکمل کر دیا ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔“

اس لئے کہ :-

إِنَّمَا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۱۹)

”ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔“

ظاہر ہے کہ اس کے بعد وحی کی ضرورت نہ تھی، اس لئے یہ ختم نبوت کا اعلان تھا۔ کلام اللہ کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ انسانوں کے ساتھ خدا کے مزید کلام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب خدا کے بندوں کے ساتھ کلام کرنے کا ذریعہ جس کا یہی کلام (قرآن مجید) ہو گا۔

لیکن جو کچھ دین کے ساتھ اس سے پہلے ہوتا رہا وہی کچھ اس دین کے ساتھ بھی ہوا جو قرآن میں دیا گیا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کیا قرآن محفوظ نہ رہا؟ کیا اس میں بھی آمیزش ہو گئی؟ اگر ایسا ہو گیا تو خدا کی اس ذمہ داری کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اس نے اسے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے اوپر لی تھی؟ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کا متن تو بالکل محفوظ رہا۔ اس میں نہ ذرا سا تغیر و تبدل ہوا، نہ کسی قسم کی آمیزش — لیکن ہوا۔۔۔۔۔ یہ کہ خارج از قرآن متعقد عناصر کو وحی کا وجود دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا اور خارج از قرآن عناصر نے اس کی جگہ لے لی اور

اسلام مذہب بن گیا

اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اب جو کچھ اسلام کے نام سے دنیا میں متعارف ہے وہ دین نہیں بلکہ یہی مذہب ہے۔ دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کی سب سے پہلی محسوس علامت یہ ہوتی ہے کہ اُمت میں وحدت نہیں رہتی۔ وہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے، اور ہر فرقہ کی شریعت کی آخری

سند خدا کے بجائے، کوئی نہ کوئی شخصیت قرار پاجاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (۲۱)

(جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جانا تھا تو خدا ایک اور نبی بھیج دیتا تھا جو وحی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیتا تھا۔ لیکن ختم نبوت کے بعد، بیوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اسے جاری رکھنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ رسول اللہ کے بعد، خدا کی وحی (قرآن مجید) میں آمیزش نہیں ہو سکتی تھی جسے الگ کرنے کے لئے نبی کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ خدا کی آیات (قرآنی قوانین) اپنی مزہ شکل میں موجود تھیں۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ ان آیات کو (قرآنی الفاظ میں) ”محکم“ کیا جائے۔ ثُمَّ يُحْكُمُ اللّٰهُ اٰیٰتِہٖ (آیات قرآنی کو محکم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں دین کی اساس قرار دیا جائے۔ انہیں حق باطل، جائز و ناجائز، صحیح اور غلط کا معیار تسلیم کیا جائے۔ لیکن یہ فریضہ انفرادی طور پر سرانجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ یہ اُمت کا اجتماعی فریضہ تھا جس کے لئے ضروری تھا کہ ایک مملکت قائم کی جائے جس کا کاروبار قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ کتب سماوی کے نزول کا مقصد یہی تھا۔ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِیْمَا اُخْتَلَفُوْا فِیْہٖ ط... ۵ (۲۱۳) کہ لوگوں کے اختلافی امور میں ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ رسول اللہ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ فَاَحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۲۱۴) تم لوگوں میں

احکام آیات اللہ کا عملی طریق

کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو۔ اس اُمت سے بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ :-

وَمَا اُخْتَلَفْتُمْ فِیْہٖ مِنْ شَیْءٍ فَحْكُمُوْا اِلَی اللّٰهِ (۲۱۵)

”اگر کسی معاملہ میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب کی روش سے کر لیا کرو۔“

حتیٰ کہ حتیٰ طور پر یہ اعلان کر دیا کہ :-

وَمَنْ لَّمْ یَحْكَمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاولٰئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۲۱۶)

”اور جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔“

لہذا آیات اللہ کو محکم کرنے کے لئے خدا کی طرف سے کسی کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ (خواہ اس کا نام کچھ ہی ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) اس فریضہ کو اُمت نے خود سرانجام دیا تھا۔ یعنی خارج از قرآن عناصر کو شریعت خداوندی قرار دینے کے بجائے، کتاب اللہ کو مملکت کا غالبہ نظام قرار دینا، اُمت کا فریضہ تھا۔ اس کے لئے کسی امور میں اللہ

کی ضرورت نہیں تھی۔ خدا کی طرف سے جس نے اُنہیں اتنا تھادہ آخری مرتبہ آکر اور خدا کی مکمل و محفوظ کتاب دے کر چلا گیا تھا۔ (علیہ التحیۃ والسلام)

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اسلام، صدیوں سے دین کے بجائے مذہب بن چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اُمت کو تیار کیا جائے کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو، وہ دینِ خداوندی نہیں۔ اسلام اسی صورت میں الدین کی شکل اختیار کر سکے گا جب اپنی ایک آزاد مملکت ہو اور اس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ ہمارا زمانہ اس اعتبار سے انتہائی خوش بخت ہے کہ اس میں ایک ایسا دیدہ و پردہ ہوا جس نے اس فحاشی کو وہ عظیم حقیقت کو اُمت کے سامنے پیش کیا۔ یہ تھے حکیم الامت، علامہ اقبالؒ جن کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اقبالؒ نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مامورِ من اللہ ہیں، یا انہیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ ایسا دعویٰ ختم نبوت کے منافی اور کبریا باطل تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ قرآنِ کریم پر غور و تدبیر اور اُسوۂ رسول اللہ کے گہرے مطالعہ سے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہے جسے وہ اپنی بصیرت کے مطابق قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آپ ان کے کلام کو شروع سے اخیر تک دیکھ لیجئے، اس میں روش روشن پر آپ کو عظمتِ قرآنی کے پھول بکھلے دکھائی دیں گے۔ ان کا پیام، قرآنی حقائق ہی کی تشریح و توضیح ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب سابقہ انبیاء کرامؑ دین کو اس کی حقیقی شکل میں پیش کرتے تھے تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے دینی مملکت کا تصور پیش کیا اور قائد اعظمؒ نے اس تصور کی عملی شکل کے لئے تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا۔ نیشنلسٹ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت لازمی تھی کیونکہ ان کے پیش نظر تو اسلام کا وہی تصور تھا جس میں اعتقادات، عبادات اور شخصی قوانین کی آزادی ہو اور پبلک لاز، مغرب کے جمہوری انداز سے وضع کئے جائیں۔ ان کا اسلام کے متعلق یہی تصور تھا جس پر، جامع انداز میں تنقید کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ :

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
اسلام تو اسی صورت میں آزاد ہو سکتا ہے کہ جملہ قوانین مملکت، کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے متعین
کئے جائیں اور یہ، اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلامی نظام کا یہ تصور، اُمت کی نگاہوں سے صدیوں سے
اوجھل ہو چکا تھا۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ :

منزل و مقصود قرآن دیگر است رسم و آئین مسلمان دیگر است
قرآن کا نصب العین۔ اس کی منزل۔ اس کا منتہی۔ اس کا مقصود کچھ اور ہے اور مسلمانوں کا اسلام کا تصور، ان کے
رسوم و مناسک، ان کا شعار زندگی، ان کا آئین حیات کچھ اور۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔
بندۂ مومن زقرآن بر بخور د در ایام او تہ مے دیدم، نہ درد

اصل یہ ہے کہ امت مسلمہ نے قرآن کریم کے نخل حیات کا پھل کھایا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس کے ساغر زندگی
میں، قرآن کی شراب طہور تو ایک طرف، اس کا تر جرم تک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ حقیقت انتہائی تعجب
انگیز اور حیرت افزا نہیں کہ :

خود طلسم قیصری د کسری شکست خود سر تخت ملوکیت نشست
وہ قوم جس نے قیصر و کسری کی ملوکیت کو نیست و نابود کر دیا۔ اس کے بعد، وہ خود تخت ملوکیت بچھا کر اس
پر سنا نشین ہو گئی اور پھر :

تہا تہا سلطنت فوت گرفت دین او نقش از ملوکیت گرفت
جب نظام ملوکیت محکم ہو گیا تو دین، تمام تر اسی کے رنگ میں رنگا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ — افریدی شرع و
آئینے دگر — اسلام کی جگہ ایک مذہب، ایک نئی شریعت وجود میں آگئے۔ اب اس کا علاج یہ ہے کہ
— اند کے یا نور قرآن در نگر —

یہی تھا وہ ”نور قرآن“ جس کی روشنی میں علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی تصورات نہایت
واضح الفاظ میں پیش کئے۔ آج کی نشست میں۔ میں اس کے مختصرے خط و خال آپ کے سامنے پیش کر رہا
گا۔ اس ضمن میں، ان کے سات لیکچروں کے مجموعہ میں سے چھٹا خطبہ، اور ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے سالانہ
اجلاس منعقدہ الہ آباد کا خطبہ صدارت، خاص طور پر قابل توجہ ہیں، میری یہ تصریحات بیشتر انہی کے اقتباسات
پر مشتمل ہیں۔

آپ نے ۱۹۳۰ء کے خطبہ صدارت کا آغاز ان الفاظ سے کیا :

”آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے
ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے

الہ آباد کا خطبہ صدارت

اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو انسانی نگاہ کو جزا و نینا کی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذنِ مال کشتائی دے گا۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دین، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین قوت کا حامل ہے اور جسے اس کا حکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیر الہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی، اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویہ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز نہ خیال فرمائے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ کوئی نظر مسئلہ ہے۔ نہیں۔ یہ تو ایک زندہ اور علی مسئلہ ہے جو خود نفس اسلام پر بحیثیت ایک نظام حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے۔

اس تمہید کے بعد انہوں نے، مذہب اور دین کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا۔ فرمایا :-
 ”حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظام حکومت ہے جس کی ہیئت ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عمل خیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رُو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابگل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطہ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ وہ ایک فعال مشینری کا پُر زہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔“

اس نظری بحث کے بعد وہ اس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا :-

”ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔“

مسلمانان ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں، کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (بادجو دیکھ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں تلجھا دے گا۔
اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:-

”تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزند ان توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گہاں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملت اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطہ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالم اسلام پر کیا اثر ہوگا۔“

ان کی بصیرت نے یہاں تک کہ دیا کہ:-
”مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔“
سچ کہا تھا اس دیدہ ور نے، اگر:-

عادی وہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینہ اوداک میں ہے
اس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ:-

پاکستان کا بیرونی
”میری آندو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔۔۔۔۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔“
اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؟ فرمایا کہ:-
”اس سے اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے

سے اب تک اس پر قائم ہیں اس جوہر کو توڑ ڈالنے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے خطبات تشکیل جدید کے چھٹے خطبہ میں سعید حکیم پاشا (مرحوم) کی مہنوائی میں، ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ :-

”اندریں حالات ہمارے لئے کشادہ کاری کی ایک ہی راہ ہے۔ اور یہ کہ آئینہ اسلام پر غیر اسلامی رنگ کی جو سخت بعد درشت نہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکت کیا جاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھترج کھترج کر الگ کیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سر نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیل جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔“

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے مملکت پاکستان کا جو نظریہ اور تصور پیش کیا تھا اس کی غرض و غایت اور منہا مقصود کیا تھا؟ بوں نے یہ تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا۔ اگرچہ خطبات تشکیل جدید اس سے بھی دو سال پہلے دیئے گئے تھے، حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کا سارا کلام اور پیام انہی تصورات کی توضیح و تشریح ہے۔

اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک، واحد اور غیر منقسم اُمت ہوتی ہے جو دین کے اشتراک کی بناء پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں نہ مذہبی فرقے ہوتے ہیں، نہ سیاسی پارٹیاں اس مملکت یا اُمت کا ایک ضابطہ قوانین ہوتا ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تمیز و تفریق ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی گروہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی الگ فقہ کی پیروی کرے گا۔ ایک مملکت کے اندر الگ الگ ضوابط قانون کی پیروی تو مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہوتی ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن جب مملکت کی تشکیل کا نظریہ علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا، ظاہر ہے (اور انہیں اس کا علم تھا) کہ اس میں مسلمانوں کے متعز

واحد ضابطہ قوانین

فرمے ہوں گے۔ سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطہ قوانین مرتب کس طرح ہو سکے گا جس کا اتباع تمام مسلمان یکساں طور پر کریں۔ سیکولر حکومت میں تو یہ مسئلہ بڑا آسان ہوتا ہے اس میں مختلف مذاہب یا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے پیروں کو، اپنے اپنے پرسنل لاز کی آزادی ہوتی ہے اور مملکت کے پبلک لاز کے وضع کرنے میں کسی مذہب کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت تو سیکولر نہیں ہوتی۔ اس میں اس قسم کی تفریق کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ بنظر غائر دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان کے نیشنلسٹ علماء کے مریخیل (مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ کے درمیان مشہور معرکہ مملکت کے اسی (دو) جداگانہ تصورات کا پیدا کردہ تھا۔ نیشنلسٹ علماء سیکولر حکومت کے مؤید تھے اور علامہ اقبالؒ اسے اسلام کے بحیر خلافت قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کو خلافت اسلام سمجھتے تھے۔ ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آگئی ہو گی کہ علامہ اقبالؒ نے جب اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا تو ان کے سامنے بنیادی اور اہم ترین سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطہ قوانین کس طرح مرتب ہوگا جس میں پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق نہیں ہوگی اور جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ انہوں نے اپنے خطبات تشکیل جدید کے چھٹے خطبہ میں اس نہایت اہم اور نازک ترین مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں اس خطبہ کے ضروری اقتباسات پیش خدمت ناظرین کو کرنا چاہتا ہوں۔

•x•

لیکن کسی مملکت میں قرآنی قوانین و احکام کو میکانیکی طور پر نافذ کر دینے سے وہ مملکت اسلامی نہیں بن جاتی۔ مملکت کے اسلامی بننے کی اولیں شرط یہ ہے کہ اس کے افراد میں حکمت قرآنی کے مطابق نفسیاتی تبدیلی واقع ہو۔ ان کے قلب و دماغ میں قرآنی خطوط پر تغیر رونما ہو۔ یہ شرط خود قرآن مجید کی عاید کردہ ہے جب وہ کہتا ہے کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۱۱)

نفسیاتی تغیر شرط اول | کسی قوم کی حالت کو، کوئی اور تو ایک طرف، خود خدا بھی نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تغیر نہ پیدا کر لے۔ علامہ اقبالؒ کا سارا پیغام، اسی تغیر نفس کی شرح ہے جسے وہ تعمیر استحکام خودی سے تعبیر کرتے ہیں یہ وہ موضوع ہے جس پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ وہ (حاجویدنامہ میں کہتے ہیں کہ:۔

فانش گویم آنچه در دل مفسر است ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است
 چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود
 چوں بجاں در رفت سے مراد۔ قرآنی حکمت کے مطابق نفسیاتی تبدیلی ہے۔ خارجی تبدیلی اسی داخلی تبدیلی کے مطابق
 نمودار ہوتی ہے۔ اسی کو وہ فانش تر الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:۔
 تیرے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب گمراہ کشلے نہ رازی، نہ صاحب کشتاف

(بال جبریل)

انسانی ضمیر پر نزول کتاب سے مراد بھی، قرآن کے مطابق تغیر نفس ہے۔ یہ مقصد، قرآنی حقائق کو اس طرح تعلیم و
 تربیت کی بنیاد بنا دینے سے حاصل ہو سکتا ہے کہ اس سے افراد ملت کا قلب و دماغ قرآنی سانچے میں ڈھل جائے۔
 اسی لئے وہ قرآن کے متعلق کہتے ہیں کہ:

آنچه حق می خواهد، اُن سازد ترا
 وہ تجھے ویسا انسان بنا دیتا ہے جیسا انسان خدا چاہتا ہے۔ اور یہ مقصد احکام قرآن پر کو میکانیکی طور پر نافذ کرنے سے
 حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ:

نیت ایں کار فقیہاں اے پسر
 یہ بات قانون سازوں کے بس کی نہیں، جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ مقصد قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہی سے حاصل
 ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُفا ز نبوت ہی سے حضور نبی اکرم کا فریضہ — یُعَلِّمُہُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَہُ
 وَیُزَکِّیْہُمُ — قرار دے دیا گیا تھا۔ یعنی آپ، کتاب و حکمت کی تعلیم سے ان کی تعمیر خودی کرتے تھے۔ شکل
 مملکت کا مرحلہ تو اس سے کہیں بعد جا کر آیا تھا۔ اور قرآنی مملکت قائم بھی انہی افراد کے ہاتھوں ہو سکتی تھی جن میں
 اس قسم کا انفسیاتی تغیر پیدا ہو چکا ہو۔ حضور کی تیرہ سالہ مکی زندگی اسی پر و گمراہ کی پہلی کڑی تھی۔

لیکن مملکت کا کاروبار تو بہر حال قوانین کی رو ہی سے چلتا ہے۔ اس لئے اسلامی مملکت میں قانون ساز
 کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اہل علم و اقبال نے بڑی شرح و بسط سے اس پر گفتگو کی ہے۔ اصولی طور پر وہ
 باصراۃً تحریر اس حقیقت کو دہرائے جاتے ہیں کہ اسلامی مملکت کے آئین و قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہوگا۔ وہ
 اپنی پہلی مثنوی (اسرار و رموز) میں کہتے ہیں کہ:۔

ربیع می دانی کہ آئین تو چیست زیر گمراہ دوں سر تمکین تو چیست

اُس کتاب زندہ مسترآن حکیم حکمتِ اولایزال است و قدیم

لیکن قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) اصول اور حدود متعین کر دیئے ہیں اور جزوی اور تفصیلی قوانین خود ہی مقرر نہیں کر دیئے۔ اسے اس کتاب کی وارث اُمت (یعنی ان کی مملکت) پر چھوڑا ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، تفصیلی قوانین خود وضع کرے۔ یہ حدود و اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر وضع کردہ قوانین میں، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی جاسکے گی۔

قرآن کا انداز

جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لئے ابدی اور غیر متبدل ضابطہ راہ نمائی قرار پانا ہو اسے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ اسلامی مسکت کے لئے قانون سازی کا یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جسے علامہ اقبالؒ نے بڑی شد و مد سے دھرایا ہے۔ وہ خطابِ تشکیلی جدید (کے چھٹے خطبے میں) کہتے ہیں:-

”اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کئی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود

تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہو

ثبات و تغیر کا امتزاج

گا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے۔ ابدی اصول ہی وہ محکمِ سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکاکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی دیر یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی دیر یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حرکت کار فرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی

امول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کئی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”سختی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قابل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن آئمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظام شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے۔ اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہذا آگے بڑھنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانون شریعت کو کبیر منجمد بنا کر رکھ دیا۔“

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ میں ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں :-

”آئیے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے **قانون سازی کے لئے قرآنی اصول**

قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے حقیقت واضح ہو جائیگی کہ ان اصولوں کی رو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہاء نے، قانون شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم اوصاحہ انہی فقہاء کی بالغ نظری کا رہین منت تھا۔ چنانچہ فان کہ میر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ :-

”رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔“

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتیٰ اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مذاہب اربعہ اپنی اپنی جگہ مکمل اور معتتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہاد مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکر انسانی کی نشو و ارتقا سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی و کامل، معتتم اور سہو و خطا سے مبرا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصول اسما کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرز عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقا ہے، اس کا مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ ۱۔ "قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ ۱۔

"تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔"

تیرہویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جاہد

اور متصالب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

”اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افترقی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو انسان سمجھنے کے بجائے معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس ”افتراق“ کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ مہر خسی (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں :-

اگساں افترار کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سرسراہٹ ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔“

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تغیر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں از بس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ :-

”بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔“

لیکن انہوں نے کہا کہ :-
”باایں ہمہ، میں مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جرات ضرور کروں گا۔“

سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قرآن اقل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ کی یہی جرات تھی جس کی وجہ سے وہ ارباب دانش کی نگاہوں میں اس قدر واجب التکریم و تحکیم بن گئے تھے۔ خود اہی کے الفاظ میں :-

آئین جواں مرواں، حق گوئی و بے باکی اللہ کے شیریں کو آتی نہیں روباہی

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاء حضرات کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن جب بات ان ارشاد و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہ کی طرف جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبداء فیض کی یہ انتہائی گہرے گسٹری تھی کہ اس نے علامہ اقبالؒ کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں :-

”احادیث کی دوسمیں میں۔ ایک وہ جن کی حیثیت

احادیث کی قانونی حیثیت

قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرمادی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور معلوم کیا جائے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو)۔ انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرنا ہوں۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص

طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں اپنے والی نسلوں پر من و عن نفاذ نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطہ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوین فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعہ مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر متقن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرز عمل کے ہم آہنگ ہوگا۔

جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔“

احادیث کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرز عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضور نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، بذریعہ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکم خداوندی تھا کہ :-

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۱۵۸) ”ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو۔“

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا۔ اور حضورؐ کے بعد جماعت مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ :-

وَأْمُرْهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۱۵۸) ”یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔“

یہ طریق عمل دو خلافت راشدہ میں جاری رہا۔ اُس وقت تک یہ بات کسی کے حیطہ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصور خلافت راشدہ کے باقی نہ رہنے کے بعد پیدا ہوا۔

احادیث رسول اللہؐ اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصور امام مالکؒ اور ان سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا۔ اس مسلک پر امام ابو حنیفہؒ نے کڑی تنقید کی اور قیاس کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رُو سے اس سے ملنے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔ علامہ اقبالؒ ان کی اس نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :-

”انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہد رسالتؐ اور عہد صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے ایک خاص دور (کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملنے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہب حنفیہ کے لیے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔“

اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصول قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعائی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبہ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصول فقہ میں بالکل آزاد سم اور دیگر مذاہب فقہ و شریعت کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :-

”لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبہ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اعدان کے رفتار کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہد رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔“

ان تصریحات سے، عزیزان من! یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل، قرآنی احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے، یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے، ان میں تغیر و تبدل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہوگی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ :-

”وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (مترکی کے) اور جو زو و یا بدید و گجیر مسلم اقام کے سامنے آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرہ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرہ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ :-

روح عمریؐ

حُبُّنَا كِتَابُ اللَّهِ
ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں :-

”اسلام کا بنیادی نخبیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے نئے نئے آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت کے) اس بنیادی نخبیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیل جدید کرے۔ اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل وفایت ہے، لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔“

ان کے نزدیک اس سوال کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ انہوں نے اپنے خطبات سے بھی پہلے، امرِ سر کے حلقہ اہل قرآن کے متعلق ذکر کرتے ہوئے صوفی غلام مصطفیٰ اقبیس کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ :-

”ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے ”جو رس پروڈنس“ یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، یا تو امینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروزہ فردا یہ سؤل پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا نو زمانہ کے میلانِ طبیعت

سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہاؤ اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظریہ ناممکن ہے۔ غلطیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔“

انہوں نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں بھی اس اہمیت کو دھراتے ہوئے لکھا کہ:-

”قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیاسیات انسانیہ کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔“
(طلوع اسلام - اپریل ۱۹۷۰ء صفحہ ۵)

علامہ اقبالؒ جو عمر بھر اسی پیغام کو عام کرتے رہے۔ اور ان کی وفات کے بعد، اس پیغام خداوندی کی نشر و اشاعت کی سعادت اس بیچ میرزے کے حصہ میں آئی۔ اقبالؒ کی زندگی میں اس مسئلہ کی حیثیت ہنوز نظری تھی۔ یعنی انہوں نے اس مملکت کا یہ نظریہ تو پیش کر دیا تھا لیکن اس مملکت کے وجود میں آنے کا دیکھا نہیں کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا، اس لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے ان خیالات و تصورات کو نہ کوئی خاص اہمیت دی گئی اور نہ ہی ان کی خصوصیت سے مخالفت کی گئی۔ لیکن اب جب کہ یہ مملکت وجود میں آچکی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قانون سازی کے اس تصور کی بڑی شدت سے مخالفت ہو رہی ہے۔ میرے خلاف ایک ہزار علماء کا کفر کا فتویٰ اس مخالفت کی زندہ شہادت ہے۔ لیکن قرآن مجید تو ایک ابدی حقیقت ہے۔ اس کا سرشتہ نہ علامہ اقبالؒ کی طبعی عسکر و ابستہ تھا، جان کی وفات سے یہ ٹوٹ جاتا۔ نہ ہی یہ میری زندگی تک محدود ہے۔ اور نہ ہی اسے مخالفین کی کاوشیں اور کوششیں ناکام بنا سکتی ہیں۔ اسے دنیا کے ہر نظام پر غالب اگر رہنا ہے کہ:

لِيُعْلَمَهُ عَلَى الدِّينِ صَلَاحًا - اس خدا کا فیصلہ ہے جس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ لہذا ایسا بالآخر ہو کر رہے گا۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۳۱)

اور قوانین خداوندی کے ساتھ

دیگر قوانین طانے والوں کی تمام کوششوں کے علی الرغم ایسا ہوگا۔

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، مناسب سمجھتا ہوں کہ آخر میں اُسے مختصر الفاظ میں سمجھا کر آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

۱۔ حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے ایک ضابطہ قوانین وائین عطا ہوتا تھا۔ جو قوم اس ضابطہ کی قوت کو تسلیم کر لیتی تھی اس کا قرینہ ہوتا تھا کہ وہ اسے عملاً نافذ کرے۔ چونکہ یہ پوری قوم ایک ضابطہ کے تابع زندگی بسر کرتی تھی اس لئے اس میں کسی قسم کے اختلاف اور فرقہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ رسولؐ کے چلے جانے کے بعد، وہ قوم اس ضابطہ میں آمیزشیں کر دیتی تھی اور اس طرح ان میں اختلافات نمودار ہو جاتے تھے۔ اس طرح وہ دین مذہب بن جاتا تھا۔ یہ جو دنیا میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں، یوں سمجھئے کہ یہ دین میں پیدا شدہ مختلف فرقے ہیں کیونکہ دین تو شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ دین کی اطاعت کہنے والوں میں فرقہ پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔

۳۔ یہ دین آخری مرتبہ، مکمل اور غیر متبدل شکل میں نبی اکرمؐ کی وساطت سے ملا۔ جن سعادت مند افراد نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا وہ ایک قوم (یا امت) بن گئے۔ اس امت نے، اس دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک مملکت کی تشکیل کی جس کا ضابطہ وائین قرآن کریم تھا۔ اس مملکت کی مرکزی اتھارٹی امت کے مشورہ سے اس دین پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرتی اور انہیں قوانین مملکت کی حیثیت سے نافذ کرتی۔ ان کا اطلاق تمام امت پر یکساں طور پر ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں، امت میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ مختلف فرقوں کے معنی تو یہ تھے کہ مختلف گروہ، مملکت کی طرف سے نافذ کردہ قوانین کے بجائے، اپنے اپنے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرتے۔ ایک مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس قسم کا طرزِ عمل تو مملکت سے بغاوت کے مرادف ہوتا ہے یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ (۲۴۱) یعنی ایک اتھارٹی (حکومت قرآنی) کی اطاعت کرنے کے بجائے مختلف اتھارٹیز کی اطاعت کرتا۔ رسول اللہؐ سے فرمایا کہ جو لوگ فرقہ پیدا کر لیں تیرا اُن سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ (۲۴۱) یعنی جو مملکت اسلامیہ کی مرکزی حیثیت ہی کو تسلیم نہ کریں، ان کا اس مرکز سے تعلق کیا؟ وہ تو اس کے باغی قرار پاتے ہیں۔ چونکہ مرکز ملت کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے تھے، اور

فروق میں فیصلے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوتے ہیں، اس لئے کہہ دیا کہ جو لوگ — مَا أُنْزِلَ
اللّٰهُ — (قرآن مجید) کی دوسے فیصلے نہیں کرتے انہیں مومن نہیں کہا جاسکتا۔ (۱۴۱)

۴۔ ہمارے ساتھ ہوا یہ ہے کہ امت کی مرکز سی اتھارٹی (حکومت خداوندی یا خلافت علیٰ منہاج رسالت) کے باقی درجے سے دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے، اس لئے اس میں مختلف فرقے پیدا ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان فرقوں کو باقی رکھتے ہوئے اسلامی نظام (یعنی دین خداوندی) قائم ہو سکتا ہے تو وہ یا تو دین اور مذہب میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور یا پھر امت کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرقوں کی موجودگی میں دین کا نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ دین کا نظام قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ ایک ایسی مملکت کا قیام عمل میں آئے جو قرآنی اصولوں کو مملکت کا آئین قرار دے امت کے مشورے سے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور پر وضع کرے۔ انہیں قوانین حکومت کی حیثیت سے تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ کرے — اس میں نہ اس فرقے یا اس فرقے کی کوئی تیز ہوا دین ہی پسند اور پسند لازم کی تفریق — اس طرح ایک خدا — ایک مضابطہ قوانین اور ایک امت کی تشکیل سے، دین کا نظام قائم ہو گا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو احیاء اسلام کی ہر کوشش رائیگاں جائے گی۔

یہ تھی خلافت راشدہ کے بعد اسلامی مملکت کے قیام کی وہ ممکن العمل شکل جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اور جس کے مطابق ایک خطہ زمین کے حصول کے لئے قائد اعظمؒ، تحریک پاکستان کو وجود میں لائے۔ وہ علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ بنیادی اصول کو کس طرح واضح طور پر سمجھ چکے تھے، اس کی تفصیل میں اپنے اس خطاب میں پیش کر چکا ہوں جسے میں نے سابقہ یوم پاکستان (مارچ ۱۹۷۷ء) کی تقریب پر پیش کیا تھا۔ (وہ الگ شائع ہو چکا ہے) انہوں نے ان تمام تفصیل کو ان چار لفظوں میں جامع طور پر سمیٹ کر رکھ دیا تھا کہ :-

”قرآن کریم کے احکام ہی ہماری سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے

حد و متعین کرتے ہیں؟“

یہ وہ حدود ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں، اودان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ملت اسلامیہ اپنی مملکت کے لئے قوانین و مضابطہ وضع کرتی ہے۔ جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی مملکت وجود میں نہیں آسکتی، اور اگر وجود میں آجائے تو مستحکم نہیں رہ سکتی، جب تک اس میں ایک (واحد) ضابطہ قوانین نافذ نہ ہو۔ جس مملکت میں مختلف گروہ اپنے لئے الگ الگ قوانین و ضوابط وضع کر لیں، اس میں انارکی پھیل جاتی ہے۔ سیکولر سٹیٹ میں قانون سازی کا مسئلہ آسان ہوتا ہے اس میں مختلف مذہبی گروہوں کو ان کے اپنے شخصی قوانین پر عمل پیرا ہونے کی آزادی دے دی جاتی ہے اور پبلک لاز کا ضابطہ، بلا تیز مذاہب، آزادانہ وضع کر لیا جاتا ہے جس کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے لیکن اسلام میں نہ تو پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے پبلک لاز بلا حدود و قیود جس طرح جی چاہے وضع کئے جاسکتے ہیں۔ یہ سب قرائنی حدود کے اندر رہتے ہوئے وضع کئے جاتے ہیں۔

لیکن اس وقت صورت یہ ہے کہ مسلمان مختلف فرقوں میں بیٹے ہوئے ہیں اور ہر فرد اپنی اپنی فقہ پر شدت سے جما بیٹھا ہے۔ ان کی فقہ کا دائرہ، شخصی قوانین تک محدود ہے۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں انہیں شخصی قوانین کی آزادی تھی اور پبلک لاز سیکولر انداز سے وضع ہوتے تھے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت اس میں مطمئن تھی۔ جسے ہندوستان کی تحریک آزادی کہا جاتا ہے، اس سے مراد انگریزوں کی جگہ، اہل ہندوستان کی اپنی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس تحریک میں، وہاں کی اکثریت، ہندوؤں نے، اس امر کی ضمانت دے دی تھی کہ حصول آزادی کے بعد، قوانین مملکت کی شکل وہی رہے گی جو انگریزی عملداری میں رائج تھی۔ یعنی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے شخصی قوانین اپنے اپنے ہوں گے، اور ملک کے پبلک لاز سیکولر انداز سے وضع ہوں گے۔ وہاں کے علماء کی اکثریت کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے تھا۔ وہ جس طرح انگریزی عمل داری میں اس بیچ حکومت سے مطمئن تھے اور اسے قطعاً اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے، اسی طرح وہ ہندوؤں کے پیش کردہ بیچ حکومت کو اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے اس لئے وہ اس تحریک میں بہ ہیئت مجموعی شامل تھے۔ اصل یہ ہے کہ فرقہ دارانہ گروہ بندی میں، ہر فرقہ کے نزدیک اس کے اپنے معتقدات، مسائل، رسوم، اور شخصی قوانین کا نام اسلام ہوتا ہے۔ اگر اسے ان کا تحفظ حاصل ہو جائے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسلام محفوظ ہے۔ اور اگر ان پر کوئی زور پڑتی ہو تو وہ چلا اٹھتا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ اس سے زیادہ اسلام کا کوئی تصور ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ یہ شکل سیکولر نظام حکومت ہی میں قائم رہ سکتی ہے۔ اس کے برعکس، اسلامی نظام مملکت میں فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس میں (واحد) اُمت مسلمہ ہوتی ہے جو ایک ہی ضابطہ قوانین کے تیلج زندگی بسر کرتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ فرقہ بندی کو اسلام قرار دینے اور اس پر مطمئن ہو جانے والے علماء سیکولر انداز حکومت ہی کے مؤید ہو سکتے

ہیں۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ ہندوستان کے نیشنلسٹ اخبار مدیتہ (بجنور) کی ۱۷ اپریل ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں مولانا اسرار احمد آزاد (دیوبندی) کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:-

”یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

انہی علماء کے مرخیل، مولانا، حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے جن کا مسلک یہ تھا کہ:-

”ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصولوں کے عین مطابق اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔“

(زمزم - مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

اس کے برعکس، قائد اعظمؒ، علامہ اقبالؒ کے تصور کے مطابق اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے مشرفِ عہدِ جدید تھے۔ ظاہر ہے کہ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت فطری امر تھی۔ یہ ان کے ”تصورِ اسلام“ کے خلاف تھی۔ یہ بھی ہندوستان میں، تحریکِ پاکستان اور علماء کے درمیان کھلی ہوئی جنگ کی حقیقی وجہ۔ پاکستان وجود میں آگیا اور علماء کا یہ گروہ ادھر آگیا۔

یہاں بھی ان کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے تصور کی اسلامی حکومت قائم نہ ہونے پائے کیونکہ اس سے ان کے فرقہ وارانہ اسلام کی اجارہ داری باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہر فرقہ کے پرسنل لازماً کی آزادی کا چرچا تو ہر جگہ کرتے ہیں لیکن پبلک لائف کے ضابطہ کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ یہ یہاں اسی انداز کی سیکولر حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے داعی (مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور ان کے ہم نوا حضرات تھے۔ اس قسم کی حکومت میں اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو، تو یہ اسے اسلامی حکومت قرار دیں گے۔ اگر اقتدار کسی اور کے ہاتھ میں ہو تو وہ غیر اسلامی حکومت ہوگی۔

✱

ان کے علاوہ تحریکِ پاکستان کے خلاف ایک اور عنصر بھی کار فرما تھا۔

یعنی جماعت اسلامی۔

مطالبہ پاکستان کی بنیاد دو اصولوں پر تھی۔ ایک یہ کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر، غیر مسلموں سے ایک الگ قوم ہیں۔ اور دوا ہمارے دین کا تقاضا ہے کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس میں اسلام ایک زندہ حقیقت بن سکے۔

اس جماعت کے بانی، ابوالاعلیٰ، مودودی صاحب کی کوشش تھی کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ دونوں دعویٰ باطل ہیں، انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، محض پیدائشی مسلمان ہیں، حقیقی مسلمان نہیں۔ لہذا ان کا، اسلام کی بنیاد پر جدا گانہ قومیت کا دعویٰ ہی باطل ہے۔ دوسرے مطالبہ کے متعلق انہوں نے کہا کہ یہ لوگ جس حکومت کے قیام کے لئے پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ اسلامی حکومت نہیں بلکہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ بلکہ اس سے بھی بدتر، لہذا، اس بنا پر بھی ان کا دعویٰ باطل ہے اور یکسر غیر اسلامی۔

ان کی اس جدوجہد کے باوجود پاکستان وجود میں آگیا تو یہاں انہوں نے یہ کوشش شروع کی کہ مسلمانوں کی نئی نسل کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ ”اسلام ایک چلا ہوا کائنات ہے“۔ اس نمانے میں اسلامی حکومت کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اسلامی مملکت کے قیام کی شرط اولیں یہ ہے کہ اس میں پبلک لاز کا ایسا ضابطہ وضع کیا جائے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اسے ناممکن کرنے کے لئے مودودی نے ایک خاص انداز اختیار کیا۔ بیس پچیس سال تک وہ یہ کہتے رہے کہ اسلامی حکومت کی بنیاد ”کتاب و سنت“ پر ہے۔ یہ بڑا معصوم اور مقدس نعرہ تھا جس کی لم کو سادہ لوح مسلمان سمجھ نہ سکا۔ جب وہ کتاب و سنت کی اہمیت اس طرح ثبت کر چکے تو اس کے بعد فرمایا کہ ”کتاب و سنت“ کی دوسری پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جاسکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ کھٹے الفاظ میں اس کا مفہوم اس کے ہوا کیا ہے کہ اب دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ان کے پیش کردہ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل، اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکی ہے۔ ان نوجوانوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ جب اسلامی حکومت قائم ہی نہیں ہو سکتی تو پھر پاکستان کی جدا گانہ مملکت کی ضرورت کیا تھی! ہماری نئی نسل کے دلوں میں ان خیالات نے پروش پانا شروع کر دیا ہے۔ یہ خیالات دماغ پر دان چڑھے تو یہاں یہ تحریک ابھرے گی کہ ہمیں ہندوستان کے ساتھ مل جانا چاہئے تاکہ دو دروز کے درمیان سے چٹکارا حاصل ہو۔ مودودی صاحب ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کے ایک حصہ میں مملکت پاکستان قائم کرنے کے خلاف تھے اور اپنے اس نظریہ کی تائید میں کہا کرتے تھے کہ :-

”یہ لوگ ہندوستان کے ایک فدا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے۔“

(دروید اور جماعت اسلامی - حصہ پنجم - ص ۶۵)

صرف ایک سوال

آپ ان حضرات سے صرف ایک سوال پوچھتے۔ اور وہ یہ کہ :-
”کیا کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جاسکتا ہے جسے یہاں کے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں؟“
مردودی صاحب تو واضح الفاظ میں کہہ چکے ہیں کہ ایسا کیا جانا ناممکن ہے۔ لیکن اگر دیگر علماء حضرات اسے ممکن سمجھتے ہوں تو ان سے کہئے کہ ان کا اولین دینی فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر دیں۔ اس سے وہ تمام مسائل حل ہو جائیں گے جو گذشتہ تیس برس سے ساری قوم کے لئے سوہان روح بن رہے ہیں۔

مرغین (ملک خداداد)

میں نے اس خطاب کو قانون سازی کے اصولوں تک محدود رکھا ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ جس خطہ ارض میں اسلامی مملکت قائم ہوگی وہاں کے معاشرہ کا نقشہ کیا ہوگا۔ یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ علامہ اقبال نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن ان تمام تفصیل کو انہوں نے جاوید نامہ میں، فلک مرتع پر مرغین کے نام کے مثالی خط میں سمٹا کر رکھ دیا ہے اور وہ یہ ہیں :-

ساکنانش در سخن شیریں چو پوشش خوب رومے و نرم خورے و سادہ پوشش خوش کلام، خوش گل، نرم طبع، سادہ پوشش، تسخیر قوائے فطرت میں اتنی بلندیوں پہ پہنچے ہوئے کہ اپنے کاروبار کے لئے تمام توانائی (ENERGY) حرارت (آفتاب) سے براہ راست حاصل کرنے والے

فکرِ شاں، بے درد سوزِ اکتساب باز وہاں کیمیئے آفتاب
 ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور چون ملک گیریم ما از آبِ شور
 وہاں علم و ہنر کا مقصد، نوعِ انسانی کی خدمت ہوگا نہ کہ حصولِ زر و سیم۔ سکھوں کا اس میں رواج ہی نہ ہوگا۔
 خدمتِ آمدِ مقصدِ علم و ہنر کار ہمارا کس نئی سنجیدہ زور
 کس ز دنیا و دہم آگاہ نیست ایں بتاں را در حرما راہ نیست
 نہ وہاں ایسی مشینیں ہوں گی جو بھوتوں کی طرح انسان کے سر پر سوار ہوں گی۔ نہ فیکرِ ملیوں کی چیمبیاں فضائے آسمانی کو دھمکیاں
 دھامکتا رہی ہوں گی۔ مشینیں خدمتِ گنہگار۔ دھویں کی جگہ آفتابی حرارت سے
 بر طبیعت و یو ماشیں چہر نیست آسمانہا از دغا نہا تیرہ نیست
 وہاں کا کسان نہایت مرقہ الحال اور خوش و خرم ہوگا نہ زمیندار کی سلب و نہب (EXPLOITATION) اس کا
 خون چوسے گی نہ اس کی محنت کا حاصل کوئی اور چھین کر لے جائے گا۔
 سخت کش و ہتھکاں، چراغش روشنی است از نہابِ دہِ خدایا ایمن است
 کشت و کاوش بے نزاع ابھو است حاصلش بے شرکتِ غیر سازوست
 چونکہ وہاں سلب و نہب (EXPLOITATION) کا تصور ہی نہ ہوگا اس لئے باہمی مفاد کے تصادم (CLASH
 OF INTERESTS) کا بھی سوال پیدا نہ ہوگا اور جب مفاد کا تصادم نہ ہوگا تو پھر کشت و خون بھی نہ ہوگا۔
 ہر طرف امن ہی امن ہوگا اس لئے وہاں بے کار فوجیں (STANDING ARMIES) رکھنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔
 اندیاں عالم نہ شکر نے قتل نے کئے روزی خود از کشت و خون
 وہاں کے اہل قلم بھی پروپیگنڈے کی دروغ بازفوں میں مصروف نہ ہوں گے۔
 نے قلم و مرغیں گیر و فروغ از فن تحریر و تشہیر دروغ
 نہ وہاں کوئی بیکار ہوگا نہ گداگر۔
 نے بازاراں زبے کاراں خروش نے صلاہائے گلباں در دگوش
 دو لفظوں میں یہ سمجھئے کہ نہ وہاں کوئی سائل ہوگا نہ محروم۔ نہ کوئی کسی کا آقا نہ کوئی غلام۔ نہ کوئی کسی کا حاکم نہ کوئی کسی کا محکوم۔
 کس عدیں جاسائل و محروم نیست عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اس کے بعد حکیم مرتضیٰ نے بتایا کہ تمہارے ہاں معاشرہ میں جو اس قدر ناہمواریاں اور فساد انگیزیاں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اشیاء کو افراد کی ملکیت تصور کر رکھا ہے۔ ملکیت کا تصور، تمام فسادات کی جڑ ہے۔ یہاں ہر شے خدا کی ملکیت ہے اور انسانوں کے سپرد بطور امانت کی جاتی ہے۔

اے کہ می گوئی متاعِ مازِ ماست مرزا داں ایں ہمہ ملکِ خداست
زمین خدا کی ہے اور افراد اس کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ یہ قرآن کے حکم کی صریح مخالفت ہے۔
ارض حق را ارض خود دانی بگو! چیت شرحِ آیہ لا فسادوا
لہذا صیح نظام یہ ہے کہ ہر شے ”خدا کی ملکیت“ میں دے دی جائے۔

کس امانت را بکار خود۔۔۔۔۔ نبرد اے خوش اُل کو ملک حق با حق سپرد
ملک یزداں را بہ یزداں باز دہ تاز کا بد خویش بکشائی گہ !
یہ تمام محنت جی اور غریبی، افلاس اور زبوں حالی اس لئے ہے کہ خدا کی ملکیت کو انسانوں نے اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے۔

ذیرِ گمردوں فقر و مسکینی چراست آنچہ از مولا ست می گوئی ز ماست
جب تم اپنی نگاہ میں یہ تبدیلی پیدا کر لو گے تو تمہاری خارجی دنیا خود بخود بدل جائے گی۔
فہج دیگمہیں، جہاں دیگمہ شود ایں زمین و آسماں دیگمہ شود
یہ تھا اقبالؔ کے نزدیک اسلامی مملکت میں معاشرہ کا نقشہ اور اسلامی نظام کا حاصل۔ یعنی
کس نباشد در جہاں محتاج کس نکتہٴ شرع مبہین، این است دلیل

والسلام
پیروز

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فکر اقبال کا سرچشمہ

(یتقریباً یوم اقبال ۲۱ اپریل ۱۹۶۸ء)

علامہ اقبالؒ کو ان کی زندگی ہی میں جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، شاید ہی کسی اور مفکر یا شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے (یوں) کیے گویا اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اکہا کہ:

۱۹۹ چورخت خویش بستم ازین کجا ہم گفتند بابا آشنا بود
ولیکن کس ندانست این مسافر چہ گفت، باکہ گفت، از کجا بود (ارمنان حجاز)

اس وقت تو اسے عام طور پر شاعرانہ گھڑاوی پر محمول کیا گیا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور گہم و تاجارہا ہے، یہ بات سامنے آرہی ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا، شاعری نہیں تھی ایک حقیقت تھی جس کا انہوں نے بعد درود و سوز اظہار کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد، ان کی فکر اور شعر، ان کے کلام اور پیام کے متعلق ہزاروں مقالات لکھے گئے اور سینکڑوں کتابیں شائع ہوئیں۔ گزشتہ قریب چالیس برس کے طول طویل عرصہ کو تو چھوڑیے، ۱۹۶۶ء کے ایک سال میں، جسے ان کی پیدائش کے صد سالہ جشن کے طور پر منایا گیا۔ ان موضوعات پر جس قدر کہا، لکھا اور شائع کیا گیا وہ اعداد و شمار کے احاطہ میں بشکل سما کے گا لیکن ارباب فکر و نظر اس کی تصدیق کریں گے کہ اس کے باوجود، اقبالؒ نے اپنے آخری وقت میں جو کہا تھا وہ آج بھی اسی قدر مبنی بر حقیقت ہے جس قدر ان کی وفات کے وقت تھا۔ مطالعہ اقبالؒ کے سلسلہ میں بنیادی طور پر یہ متعین کیا جانا ضروری تھا کہ ان کی فکر کا سرچشمہ کیا تھا۔ اس موضوع پر بھی آپ دیکھیں گے کہ کچھ کم نہیں لکھا گیا۔

اس کے ڈانڈے کہیں ”مغرب کے سیاروں سے“ ملائے گئے، کہیں ”مشرق کے ثوابت“ سے۔ لیکن اصل حقیقت کی طرف کسی کی نگاہ نہ اٹھی۔ حالانکہ اسے حضرت علامہؒ نے اپنی سب سے پہلی تصنیف —

مثنوی اسرار و رموز ————— میں واضح الفاظ میں بتا دیا تھا۔ انہوں نے کتاب کے آخر میں ”عرض حال مصنف بجنور رحمۃ اللعلین“ کے زیر عنوان کہا تھا:۔

گم و لم آئینہ تبے جو ہر است	در بحر فہم غیر قرآن مضمر است
پردہ ناموس فکرم چاک کن	ایں خیاباں راز خاتم پاک کن
تنگ کن رخت حیات اندر برم	اہل ملت را نگہ راز شدم
سبز کشت ناب با نام مکن	بہرہ گیر از ابر نیام مکن
خٹک گمداں باد در انکور من	زہر ریز اندھے کا فور من

اور اس کے بعد اپنے لئے وہ بددعا کہ جس سے زیادہ جگر پاش اور قلب سوز بددعا، اقبال اپنے حق میں کر نہیں سکتا تھا (اور میں تو اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اس بددعا کی ان میں ہمت کیسے پیدا ہو گئی) اور ان الفاظ کو وہ زبان بہک کیسے لے آئے!) کہ:۔

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسہ پاکن مرا

”بے نصیب از بوسہ پاکن مرا“ کی درو انگیزی اور جگر دوزی کا اندازہ وہ حضرات بخوبی لگا سکیں گے جنہیں اس کا علم ہے کہ حضور نبی اکرم کی ذات اقدس و اعظم کے ساتھ اقبال کے عشق کی کیفیت کیا تھی۔ اقبال کا بجنور رحمۃ اللعلین یہ عرضداشت پیش کرنا کہ، جو کچھ میں نے کہا ہے اور جو کچھ میں کہوں، اگر اس میں غیر قرآن کچھ بھی مضمر ہو تو ————— بے نصیب از بوسہ پاکن مرا، اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس منفیانہ انداز کے بعد، انہوں نے مثبت طور پر کہا کہ:۔

گم و اسرار قرآن سفتہ ام	با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
ایکہ از احسان تو ناکس، کس است	یک مہابت مزد گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدا نے عروجِ سل	عشق من گم دو ہم آغوشِ عمل
دولت جانِ حنزیں بخشیدہ	بہرہ از علم دیں بخشیدہ

در عمل پائندہ تر گمداں مرا
آبِ نیسانم، گہر گمداں مرا

اسی حقیقت کو وہ دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ :-

برخور از قرآن اگر خواہی ثبات در ضمیرش بیدہ ام آب حیات
از تب و تابم نصیب خود بگیر بعد ازین ناید چمن مرد فقیر
گوهر دریائے قرآن سفتہ ام شرح رمز صغۃ اللہ گفتہ ام (مسافر ص ۳)
وہ، ارمغان تجازیں، شعرائے عرب کو ایک پیغام دیتے ہیں کہ :-

بگوا ز من نواخوان عرب را بہلئے کم نہاد م لعل لب را
ازاں نورے کہ از قرآن گرفتہ ام سحر کردم صدوسی سالہ شب را (مکمل ۱۱)
جاوید نامہ میں ”نوائے سروش“ کے زیر عنوان کہتے ہیں :-

بچوں سرمہ رازی را از دیدہ فروستم تقدیر ایم دیدم - پنہاں بکتاب اندر (ص ۳۳)
اقبال کے ہاں، کتاب سے مراد، کتاب خداوندی، قرآن مجید ہی ہوتی ہے۔ بال جبریل میں کہتے ہیں :-
تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر (ص ۴۸)
وہ بعد حسرت کہتے ہیں کہ :-

کس نمی داند اسرار کتاب شرقیاں ہم غربیاں در بیج و تاب (جاوید نامہ ص ۸۶)
وہ انقلاب روس کے بانیوں سے پہلے پوچھتے ہیں کہ :-
اے کہ می خواہی نظام عالمے جستم اور اساس مے
اور اس کے بعد انہیں کہتے ہیں کہ :-

داستان کہنہ شستی باب فکر را روشن کن از اتم الکتاب (جاوید نامہ ص ۸۸)
ان کی نگاہوں میں قرآن کریم کی عظمت کس قدر تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب
وہ شاہ افغانستان - نادر شاہ (مرحوم) کی دعوت پر کابل تشریف لے گئے تو ان کے لئے
ایک ہی تحفہ اپنے ساتھ لے کر گئے۔ وہ تحفہ کیا تھا، فرماتے ہیں :-

در حضور آن مسلمان کریم ! ہدیہ اودوم زقرآن عظیم
گفتم ایں سرایہ اہل حق است در ضمیر او حیات مطلق است
اس کے جواب میں شاہ مرحوم نے کہا :-

عظیم تحفہ

گفت ”نادر در جہاں بے چارہ بود از غم دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطراب بے خبر از غم بے حساب بے خبر
غیر قرآن عم گسار من نہ بود !
توتش ہر باب را بر من کشود“

(مسافر ص ۱۵-۱۴)

وہ جب ستمبر ۱۹۳۱ء میں، راؤ ڈیٹیل کانفرنس میں شرکت کے لئے عازم لندن ہوئے تو راستے میں کچھ وقت کے لئے دہلی رُکے۔ اہل دہلی نے ان کی خدمت میں بہت سے سپانسلے پیش کئے۔ آپ نے جامع مسجد دہلی کے امام، شمس العلماء مولانا سید احمد (مرحوم) کے سپانسلہ کے جواب میں فرمایا:-

”جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے جو میرے لئے ضروری مواد فراہم کرے، نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر میں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں۔ میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآن پاک) ہے جس کی روشنی میں، میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔“

(گفتارِ اقبال، از محمد رفیق افضل۔ ص ۱۳۲)

اپنے مسلک کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ اور جس کو آپ نے آیت شریفہ کے حوالے سے بتایا ہے: (اقبال نامہ۔ حصہ اول ص ۱۳)

ان چند تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ اقبالؒ اپنی فکر اور پیغام کا سرچشمہ قرآن کریم بتاتے ہیں اس کے بعد آپ سوچئے کہ ہمیں ان کی فکر کی اساس کی تلاش میں ماسے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے انہوں نے اس حقیقت کو الیہ و افصح انداز سے واضح کیا ہے کہ اس میں نہ کوئی ابہام ہے نہ التباس نہ شک ہو سکتا ہے نہ ریب۔ یہ صیح ہے کہ اقبالؒ بالآخر ایک انسان تھے ادا اس جہت سے، قرآن کریم کے سمجھنے میں بعض اوقات ان سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور ہو بھی۔ انہوں نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا۔ میں نے قرآن مجید کے صیح طبع پر سمجھنے کا طریق خود حضرت علامہ سے سیکھا ہے۔ میرے دل میں ان کی جس قدر عظمت اور احترام ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے لیکن اس کے باوجود بعض مقامات پر ان کی فکر قرآن سے میں بھی اختلاف رکھتا ہوں۔ اور اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دیگر قرآنی ذوق رکھنے والے حضرات بھی ان سے اختلاف

کریں۔ لیکن اس کے باوجود، یہ حقیقت اپنے مقام پر محکم ہے کہ انہوں نے اپنی فکر کا سرچشمہ قرآن کریم ہی قرار دیا ہے اور وہ ساری عمر قرآن ہی کے حقائق اور پیغام عام کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ ہماری جرمال فیسی ہے کہ وہ قرآن مجید کے حقائق سے متعلق نثر میں کوئی کتاب نہ لکھ سکے۔ وہ مقدمۃ القرآن کے عنوان سے ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ان کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی۔ وہ جب علاج کی غرض سے بھوپال تشریف لے گئے ہیں تو انہوں نے (۲۲ جولائی ۱۹۳۰ء کو) تاثیر (مجموعہ) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:-

”اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت درد مندی سے میرا علاج کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ جب ان کو سر راس مسعود سے معلوم ہوا کہ میں ایک کتاب مقدمۃ القرآن لکھنا چاہتا ہوں تو اس امداد سے کئی تکمیل کے لئے مجھے انہوں نے تاحیات پانچ سو روپیہ ماہوار کی طریری پیش عطا فرمائی ہے۔ آپ کو شاید اس کا علم اخباروں سے ہو گیا ہوگا۔ اب ذرا صحت اچھی ہوئے تو انشاء اللہ اس کتاب کو لکھنا شروع کر دوں گا۔“

(انوار اقبالؒ - بشیر احمد ڈار - ص ۲۵)

قوم کی بد قسمتی کہ ان کی صحت نے اجازت نہ دی کہ وہ اپنی اس آرزو کو پورا کر سکے۔ اگر وہ اس کتاب کو لکھ جاتے تو وہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایسی متاع گہراں بہا ہوتی جس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے زبان شعر میں بہت کچھ کہا ہے لیکن اس سے قرآنی حقائق مربوط شکل میں سامنے نہیں آسکتے۔ دوسرے شاعری میں تضاد بھی واقع ہو جاتا ہے۔ لطائف میں تو اس سے چنداں ہرج نہیں ہوتا لیکن حقائق کی صورت میں تضاد بہت بڑا نقص ہوتا ہے۔ قرآنی حقائق - مربوط شکل میں - بلا تضاد، نثری تخلیق ہی میں بیان کئے جاسکتے تھے لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا اور یہ ایک ایسا خلا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لئے ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ :-

آئے عشاق، گئے وعدہ فردا لے کر اب انہیں ڈھونڈھ چرغِ مرغِ زیبا لے کر (باگب) اس مقام پر اس جرأتِ عرض کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس مردہ پرست قوم نے جس قدر اقبالؒ کے مزار کی تعمیر اور ان کے جشنِ پیدائش منانے پر صرف کیا ہے۔ اگر اس کا عشرِ عشر بھی ان کے علاج اور سفرِ یورپ کے لئے مہیا کر دیتی۔ تو نامعلوم وہ کس قدر گہرے نائیدار سے اس کی جھولیاں بھر دیتے۔ انہوں نے سچ

کہا تھا کہ :-

مرا سبوجہ غنیمت ہے اس زمانہ میں کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

(بال جبریل - ص ۹۱)

بہر حال، اس سے واضح ہے کہ فکرِ اقبال کا حلقہ سمجھ میں نہیں آسکتا تا دقتیکہ اس فکر کے سرچشمہ (قرآن مجید) پر گہری نظر نہ ہو۔

تلاوتِ قرآن پاک

حضرت علامہؒ، قرآنی حقائق پر غور و فکر میں تو ہر وقت مستغرق رہتے ہی تھے، لیکن اس کے ساتھ انہوں نے تلاوتِ قرآن پاک کا بھی عمر بھر التزام رکھا۔ فطرت نے انہیں لمن داودی عطا فرمایا تھا اس لئے ان کی قرأت میں بڑا سوز و گداز ہوتا تھا اور اس سے وہ خود بھی کیفیتِ یاب و مرشار ہوتے تھے۔ عمر کے آخری دور میں، ان کا گلا (قریب قریب) بند ہو گیا۔ اس کا انہیں ایک ہی صدمہ تھا اور وہ یہ کہ

در نفس سوزِ جگر باقی نماند لطفِ سحرِ آن سحر باقی نماند

(پس چہ باید کرد۔۔۔۔۔ ص ۶۸)

لیکن ان کی یہ تلاوت، لفظی نواخوانی نہیں ہوتی تھی۔ وہ رموز و دغا مضی قرآن کی گہرائیوں میں اترتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ بیان کیا جو انتہائی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہوائیوں کے انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیرِ اہتمام (۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو) منعقد ہونے والے، اقبال ڈسے کی تقریب میں شرکت کے لئے "اجالیین" دہلی کا ایک قافلہ، زیرِ قیادت، علامہ حافظ اسلم حیراج پوری لاہور آیا۔ اس میں میرے علاوہ شیخ سراج الحق صاحب - اسد ملانی (مرحوم) اور قاضی محمد اشرف (مرحوم) شامل تھے۔ ۱۰ جنوری کی صبح حضرت علامہؒ نے ہمیں شرفِ باریابی عطا فرمایا۔ اس محفل کی یاد میرے لئے سرمایہٴ حیات ہے۔ محترمی سید تندر نیازی نے اس کی روداد، اپنی کتاب "اقبالؒ کے حضور" میں بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ واقعہ زیرِ نظر کے سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے :-

"حضرت علامہؒ نے فرمایا) میرا معمول تھا کہ ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دور

میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آئے اور مجھے تلاوت کرتے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے۔ والد ماجد حسب معمول مسجد سے واپس آئے۔ میں تلاوت میں مصروف تھا۔ مگر وہ، جیسے کسی خیال میں میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا اشارہ فرماتے ہیں کہنے لگے، تم کیا پڑھا کرتے ہو۔ مجھے ان کے اس سوال بہت تعجب ہوا۔ بلکہ ملال بھی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہر حال میں نے مؤدبانہ عرض کیا۔ قرآن پاک۔۔۔۔۔ کہنے لگے تم جو کچھ پڑھتے ہو، سمجھتے بھی ہو۔ میں نے کہا۔ کیوں نہیں۔ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ انہوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ آخر اس سوال سے ان کا مطلب کیا ہے۔ کچھ دن گزر گئے ادبیہ بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ کا چھٹا روز تھا کہ میں صبح سویرے حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انہوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے۔ بیٹا! قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے۔ جس پر اس کا نزول ہو۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالت کا بعد قرآن پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے۔ کہنے لگے۔ تمہیں کیسے یہ خیال گذرا کہ اب قرآن مجید کسی پر نازل نہیں ہوگا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے وہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ اس کے بعد اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے، حضرت علامہ مکے والد ماجد نے فرمایا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوہ حسنہ کاملہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لئے حجت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگنا چلا جائے گا۔ اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآن مجید اس کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔“ (ص ۶۱-۶۰)

مطلب یہ تھا کہ قرآن مجید کو محض ذہنی طور پر نہ سمجھا جائے بلکہ اس کے مقصود و منہی کو دل کی گہرائیوں میں بیوست کیا جائے۔ اس سے انسانی ذات میں عجیب تغیر واقع ہوگا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ تغیر کس حد تک پیدا ہو چکا ہے اور اس کی سمت کس طرف کو ہے۔ یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ حضور نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کے کس حد تک مطابق

ہے۔ قرآن نہیں کے اسی مقصود کے متعلق حضرت علامہ نے کہا ہے کہ قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ :-
 بچوں بجاں درفت، جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود (جہادِ نامہ) ۹

نزولِ کتاب

اسی کو آپ نے ”نزولِ کتاب“ سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ :-
 تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
 گرہ کشا ہے نہ رازسی نہ صاحبِ کشف (بالِ حیریل ۱۲)

دوسری جگہ کہا کہ : ۱۰

خود نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
 اس میں ایک یہ نکتہ بھی پنہاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے، نزولِ قرآن کے سلسلہ میں، قرآن کا مہبط، قلب
 نبوی قرار دیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ : **فَاَنزَلْنَاهُ عَلَىٰ قُلُوبِنَا** (۲۴/۱) ”جبریل نے اسے
 تیرے قلب پر نازل کیا“ لہذا جب قرآنی حقائق انسان کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں تو اس وقت کہا جا
 سکے گا کہ قرآن گویا اس پر نازل ہو رہا ہے۔ یعنی اس کے ذہن سے اس کے قلب پر اتر رہا
 ہے اس وقت انسان کے افکار و کردار، قرآن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ وہ ”مردِ مسلمان ہے“ جس کے
 متعلق اقبال نے کہا ہے کہ : ۱۰

یہ راز کسی کو نہیں معلوم، کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
 (مضربِ کلیم - ص ۵)

پھر یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے کہ قرآن کریم کے ذریعے، خدا اور بندے کے درمیان، عجیب و غریب تعلق
 پیدا ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کو وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی، حضرت انبیاءِ کرام کے لئے نقص
 تھی اور اس کا سلسلہ حضور کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ وحی کو خدا کی طرف سے ہمکلامی کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ جہاں
 کہا ہے :- **وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا** (۲۰۴/۲) اور اس نے قرآن مجید کو بھی **كَلَامَ اللَّهِ** (۲۰۴/۲) کہا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ (قرآن مجید میں) **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا**
 بلکہ **يَا أَيُّهَا النَّاسُ** کہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا بندے سے

خدا سے ہمکلامی

ہمکلام ہوتا ہے۔ دوسری طرف انسان جب خدا سے کوئی سوال کرتا ہے تو وہ قرآن مجید کے ذریعے اسے اس سوال
 کا جواب دیتا ہے۔ **أَجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَا** (۲۰۴/۲) کا یہی مطلب ہے۔ لہذا قرآن کے ذریعے

انسان کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے اور یہ شرف بڑا عظیم ہے۔

واضح رہے کہ ختم نبوت کے بعد، خدا، انسان سے صرف قرآنِ کریم کے ذریعے ہم کلام ہوتا ہے اس کے سوا، خدا سے ہم کلامی کا کوئی طریق نہیں۔ کشف اور الہام وغیرہ کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔

بہر حال، علامہ اقبالؒ قرآن کی تلاوت اس انداز سے کرتے تھے کہ وہ شعور کے رستے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ بایں ہمہ انہیں کشف والہام کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ چونکہ کائناتی حوادث قوانینِ خداوندی کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں اور قرآنِ کریم میں غور و تدبر سے انسان ان قوانین کی کار فرمائی کو سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اس لئے اسے قرآن و شواہد سے لئے والے واقعات کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کو تدبر فی القرآن سے اسی قسم کی بصیرت حاصل تھی اسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

حادثہ وہ جو ابھی پردہٴ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینہٴ اوداک میں ہے
یہاں انہوں نے ”آئینہٴ اوداک“ کہا ہے یعنی فکر و شعور، کشف والہام یا علم باطنی نہیں کہا۔

اب یہ دیکھیے کہ حضرت علامہ، قرآن مجید کا تعارف کس کس انداز سے کرتے ہیں۔ اس باب میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے بادیً اتعش یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ کارگر فکر میں ڈھلے ہوئے الفاظ نہیں جن کی نمودینا کی طور پر ہوجاتی ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والے گہر تابدار ہیں جو جذب و کیف کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے، وجہٴ تابانی و قلوب و اذہان ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پہلی تصنیف ”اسرار و رموز“ میں کہتے ہیں:-

تو ہی دانی کہ آئین تو چیست؟	زیر گردوں، شرمگین تو چیست؟
آل کتاب زندہ تر آن حکیم	حکمت اولایزال است قدیم
نسخہٴ اسرار تو کون جیات	بے ثبات از تو تش گیشیات
حرف اور اریب نے، تبدیل نے	آہ اشش شرمندہٴ تاویل نے
بہ نغمہٴ ترسودائے خام از زور او	درفتد با سنگ جام از زور او
نوع انسان را پیامِ آخریں	حاصل او جمستہٴ للعالمین

قرآنی آئین و نظام کے اتباع سے انسان کے اندر جو تبدیلی واقعہ ہوتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے

کہتے ہیں :-

خستہ باشی! استوارت می کند پختہ مثل کوہ سارت می کند

گر زمینی! آسماں ساز و ترا آنچہ حق می خواهد آں ساز و ترا

• آنچہ حق می خواهد آں ساز و ترا ————— اس ایجاز میں جس قدر لطافت، پوشیدہ ہیں، ان کا

اندازہ اربابِ نظر ہی لگا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قرآنی تعلیم کے اشعار و نتائج کے متعلق اس سے بہتر اور برجستہ شاید ہی کچھ اور کہا جاسکے۔ اس میں، مشیتِ خداوندی کے مقصود و مطلوب کی پوری دنیا سمٹ کر آگئی ہے (آنچہ حق می خواهد آں ساز و ترا)۔

گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

”اسرارِ رموز“ ہی میں دوسری جگہ کہتے ہیں :-

قلب مومن را کناش قوت است حکمتش جل الوردی ملت است (ص ۱۱۴)

قرآن، انفرادی طور پر کس قسم کی قلبی مابینیت پیدا کرتا ہے اور امت کی اجتماعی زندگی میں کس قدر حکمت کا ضامن بنتا ہے۔ اس ایک شعر میں دونوں خصوصیات سمو کر رکھ دی گئی ہیں۔

وہ، مثنوی مسافر میں رقمطراز ہیں :-

برخیز از قرآن اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

می دهد مارا پیام لا تخف می رساند بر مقام لا تخف (ص ۱۲۳)

حضرت انبیاء کرامؑ، عظیم آسمانی انقلاب کے داعی ہوتے تھے۔ ان کی انقلابی دعوت کے خلاف، مفاد پرست قوتیں ہجوم کر کے اٹھ آتی تھیں۔ ان کے ساتھ تمام دشمنوں کی ہنگامہ آرائیاں بڑھی ہمت طلب اور صبر آزما ہوتی تھیں۔ ان مقامات پر انہیں خدا کی طرف سے سکینت و طمانیت کے اس قسم کے پیغامات موجب حوصلہ افزائی ہوتے تھے کہ : لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی (۱۸۱) ”تم خوف زدہ مت ہو، آخر الامر تم

ہی غالب آؤ گے۔“ کم و بیش یہی الفاظ قمانِ کریم نے جماعتِ مومنین کے لئے کہے ہیں۔ ان سے کہلے کر ہجوم مشکلات سے گھبراؤ نہیں۔ لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمْ اَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ جب تمہارا قرآن کی صداقتوں پر ایمان ہے تو پھر گھبرانے اور خوف کھانے کی کون سی بات ہے۔ تم ثابت قدم

رہو۔ آخر الامر تمہیں غالب آؤ گے۔

انہوں نے جاوید نامہ میں، قرآنِ کریم کی حقیقت و عظمت کو بڑے وجد
آفریں انداز میں بیان کیا ہے۔ ۷

قرآن کی عظمت

فانش گویم آنچه در دل مضمر است ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است
قرآن مجید کے تفصیلی تذکرہ کے لئے اگر ضخیم تصنیفات بھی قلمبند کی جائیں تو جو بات ”چیزے دیگر است“
میں کہی گئی وہ ان ضخیم مجلدات میں بھی سمانہ سکے۔ اس جامعیت میں تو حقائق درموز کی ایک دنیا جھل جھل کر
رہی ہے یہ وہ آنکھ کی پتلی (مردم دیدہ) ہے جس میں آسمان سمٹ کر آجاتا ہے۔ امیر خسروؒ نے اپنے محبوب
کے متعلق کہا تھا کہ :-

آفاقہا گمیدہ ام، مہربتاں، درنیدہ ام بسیار خبان دیدہ ام، اما تو چیزے دیگر
اقبالؔ نے یہی الفاظ قرآن کے متعلق کہہ کر، بتا دیا کہ اس کا محبوب کون ہے اور کیا ہے ؟ اس شعر کو
پڑھئے کیونکہ اس کا مفہوم اس شعر کو ساتھ ملانے سے نمایاں ہو سکے گا جو اس کے بعد آیا ہے :-
فانش گویم آنچه در دل مضمر است ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است (۹)
جوں بجوں در رفت، جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

”جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود“ قرآنِ کریم کے ایک عظیم فلسفہ حیات و لائحہ انقلاب کی تفسیر
ہے۔ اس نے قوموں کی زندگی میں انقلاب آفرینی کا راز یہ بتایا ہے کہ : **اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى
يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ** (۱۳) یاد رکھو ! (تم خود لوگ) خدا بھی کسی قوم کے احوال و ظروف میں تبدیلی پیدا نہیں
کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ قوم کی خارجی دنیا میں انقلاب آ نہیں سکتا
جب تک وہ اپنی داخلی دنیا میں ————— انقلاب نہ پیدا کر لے۔ جب تک کسی قوم کے قلب و
دماغ، اس کی فکر و نظر، اس کے تصورات و تخیلات، اس کی اقدار حیات، اس کے نصب العین زندگی میں
تبدیلی نہیں پیدا ہو جاتی، اس کی خارجی دنیا میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ قوموں کی خارجی دنیا، ان کی داخلی دنیا کے سانچے
میں ڈھلتی ہے۔ جس قسم کی ان کی داخلی دنیا، اسی قسم کی ان کی خارجی دنیا۔ علامہ اقبالؒ پر پیامِ مشرق کے دیباچہ میں
لکھتے ہیں کہ ”زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں
میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر

میں مشکل نہ ہو۔ بنا بریں جب قرآنی اقدار کسی قوم کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں، تو اس کی خارجی دنیا میں انقلاب آجائے۔

بچوں بچاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود
اندر و تقدیر ہائے عذب و شرق سرعت اندیشہ پیدا کن چو بر قس (۹۱)
قرآن کی بیان کردہ "تقدیرات" کے سمجھنے کے لئے سرعت اندیشہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ہے۔
جہاں تازہ کی، انکار تازہ سے ہے نمود کہ سنگ و خشت سے ہونے نہیں جہاں پیدا
جاوید نامہ ہی میں دوسری جگہ کہتے ہیں :-

برجوں مسلماناں اگر داری حبلہ در ضمیر خویش و در سراں نگر
صد جہاں تازہ در آیاتِ اوست عصر با پیچیدہ در آیاتِ اوست
یک جہاںش عصر حاضر را بس است گیر، اگر در سینہ دل معنی رس است
بنده مومن ز آیاتِ خداست ہر جہاں اندر برادر چوں قباست

بچوں کہن گر دوجہاں در برش

می دھد قرآن جہاں دیگرش (۹۲-۹۳)

ان آیات میں جس حسن کارانہ اور معجزانہ انداز سے قرآن کی ابدیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ جوں جوں انسان اس پر غور کرتا ہے، اس کی روح و جد میں آجاتی ہے۔ یہ نکتہ ذرا تشریح کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فصیح انسان کو منزل انسانیت تک لے جانے والے راستے کی طرف راہ نمائی اپنے فتملی اور اس کے لئے حضرت انبیاء کرامؑ کی وساطت سے سلسلہ رشد و ہدایت جاری کیا۔ جب نوری انسان عالم طفولیت میں بھی تو اس پر وگرام کی صورت یہ بھی کہ اس میں اصولی ہدایات کم ہوتی تھیں اور عملی جزئیات زیادہ۔ اس

زمانے میں تو حالت یہ بھی کہ حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا طریق بھی بذریعہ وحی بتانا پڑا۔ جوں جوں نوری انسان عمر میں بڑھتی گئی اور

آسمانی ہدایت کی ابدیت

اس کا شعور بچتہ ہونا شروع ہوا تو اس پر وگرام کی جزئیات میں کمی اور اصولوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ تاہم جب وہ عالم شباب تک پہنچ گئی اور مشیت نے دیکھ لیا کہ اب انسان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود مرتب کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ تو اس نے ان تمام اصولوں کو جن کی انسانی لگائی کے

لئے ضرورت تھی، مشکل شکل میں، وحی کے آخری ضابطہ، قرآن کریم میں محفوظ کر دیا اور سلسلہ وحی اختتام تک پہنچ گیا۔ (ختم نبوت کے یہی معنی ہیں)۔ اب انسانوں کے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن میں خود کریں کہ اس نے، ان کے حل کے لئے کیا اصول دیا ہے اور اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے خود وضع کریں۔ اس طرح یہ کتاب ہدیٰ قیامت تک انسانی راہ نمائی کا فریضہ ادا کرتی رہے گی۔ یہ کہیں نہیں کہے گی کہ مجھ میں راہ نمائی دینے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے اس طریق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ :- **سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمُ الْآثَرُ الْحَقُّ**۔ (ہم انہیں دور انسان کو بخارجی کائنات اور خود ان کی داخلی زندگی میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے۔ تا آنکہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ صداقت پر مبنی ہے۔) یعنی جوں جوں علم انسانی آگے بڑھتا جائے گا۔ قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ ایسا ہو سکتا ہے (اور ہوتا ہے) کہ عقل و فکر اور تجربہ اور مشاہدہ کی دوسری جن حقائق کا ادراک ہو۔ انسان انہیں قرآن کے حوالے سے پیش نہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہوں گے قرآنی حقائق ہی۔ اس لئے کہ یہ ہوں نہیں سکتا کہ عالم انفس و آفاق سے کوئی حقیقت بے نقاب ہو اور وہ قرآن کے خلاف جائے ہماری اس ملاقات میں جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کو بڑے لطیف اور دقیق انداز سے ارشاد فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ :-

”قرآنی حقائق کے دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب ہے حقائق کا ادراک، علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں۔ حقائق کا ادراک ہمیشہ سے جاری تھا۔ کبھی ایک حقیقت سمجھ میں آئی کبھی دوسری، کبھی جزئ کبھی تمام۔ اب اگر انسان وہ سب حقائق جو اس نے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں حاصل کئے ہیں۔ یا جن تک عقل اور فکر کے ذریعے اس کی رسائی ہوئی باہم فراہم کر لے اور ایک مربوط و منظم شکل میں پیش کرے تو ان سے قرآن پاک ہی کے ارشادات کی تصدیق اور ترجمانی ہوگی۔“

اس کے بعد قدرے توقف سے فرمایا :-

حقائق کا ادراک ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ قرآن مجید ان سب حقائق کا جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آپکے ہیں اور ان کا بھی جن کا ادراک باقی ہے۔ خواہ یہ حقائق سنو سی کی زبان سے ادا ہوں، خواہ لہسن

کی، حقائق بہر حال حقائق ہیں۔ ان کو سمجھنے کی جس طرح بھی کوشش کی جائے اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ مقصد ان کا سمجھنا ہے اور قبول کرنا ہے۔ لہذا، انہیں جس طرح بھی سمجھیں یہ قرآن پاک ہی کا سمجھنا ہوگا۔ اس کی تعلیم سے بہرہ ور ہونا ہوگا۔“
(اقبالؒ کے حضور۔ ص ۵۸-۵۷)

اسی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان معنی الفاظ میں بیان کیا ہے کہ :-
ہر کجا بینی جہان رنگ و بو آنکہ از خاکش بر وید آرزو !
یاز نور مصطفیٰ اور ابہاست یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است
یاز نور مصطفیٰ وہی ہے جو حضور نبی اکرم کی وساطت سے دنیا کو ملا اور اب تہذیب قرآنی میں محفوظ ہے۔
یٰ ہدی اللہ لنورہ من یشاء... (۲۵)
ان تشریحات کی روشنی میں، جاوید نامہ کے ان اشعار کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ جنہیں میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے کہ :-

صد جہان تازہ در آیاتِ اوست عصر ہا پیچیدہ در آفاتِ اوست
چو کہن گم دو جہانے در برشش می دھد قرآن جہانے دیگرشش
اس طرح قرآن کے اصول و حقائق، ہر زمانے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کرتے اور انسانی زندگی کے ہر مشکل مسئلہ کا حل بتاتے، کاروان انسانیت کے راہ نمائے چلے جاتے ہیں۔ یہ کسی مقام پر اس کی راہ گائی سے عاجز نہیں آتے۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے، گوشتے نے ایک مرتبہ کو ان الفاظ میں سمجھایا تھا کہ :-
”اسلام کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام نہیں رہتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے حیات کے ساتھ، اس سے اگے نہیں جاسکتے اور اصل تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے اگے نہیں جاسکتا۔“
(خطبات اقبالؒ - ص ۱)

یہ ہے قرآن کی ابدیت !

یہاں تک تو قرآنی حقائق سے بحث تھی۔ اب یہ سوال ہے کہ ان حقائق، یا قرآنی اصول حیات سے نوع انسان

کو حاصل کیا ہوا؟ ان کے اتباع سے نتیجہ کیا مرتب ہوا، اور کیا مرتب ہوگا؟ اس اہم

سوال کا جواب، علامہ اقبالؒ نے دو لفظوں میں نہایت جامعیت سے دیا ہے

قرآنی انقلاب

جہاں کہا کہ :-

چیت قرآن، خواجہ راہ پیغام مرگ دستگیر بندہ بے سازد برگ (جاوید نامہ ص ۸۹)
 ”خواجہ راہ پیغام مرگ“ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے، انسانوں پر دوسرے انسانوں کی ہر قسم کی بالادستی کا خاتمہ
 کر دیا۔ اسی حقیقت کو انہوں نے، ”ابلیس کی مجلس شرعی“ میں ابلیس کی زبان سے ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ :-
 موت کا پیغام ہر نفع غلامی کے لئے
 نے کوئی فقہور و خاقان نے فقیر نہ نہیں
 کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک نہ
 ممنوع کو مال و دولت کا بنانا ہے میں
 اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
 پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے بیڑ میں

(ارمغان حجاز - ص ۲۲۵)

اب آگے بڑھتے۔ حضرت علامہ اس حقیقت کو شرح و بسط سے واضح کرتے ہیں کہ صدرِ اول کے مسلمانوں
 نے جس قدر قوت و حشمت، دولت و ثروت، شوکت و مملکت، رفعت و عظمت اور ان سب کے ساتھ
 شرف و مجد انسانیت کے مقامات بلند حاصل کئے تو وہ سب اتباع قرآن کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد اس قوم
 نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر ”عجمی اسلام“ اختیار کر لیا تو اس کی وہ حالت ہو گئی جس کا ہم سب رونما ہونے
 ہیں۔ اقبالؒ کو اُمتِ مرحومہ کے ساتھ والہانہ محبت تھی۔ اس محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ اس کی نجات و زبوں حالی
 پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر اس قدر شدت و زحمت سے لکھا ہے کہ اس سے ایک
 مستقل تصنیف وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن میں اس وقت ان میں سے صرف وہ مقامات پیش کروں گا جن
 میں انہوں نے براہِ راست قرآن کے حوالے سے بات کی ہے۔ وہ پہلے کہتے ہیں

اُمت کی تاریخ

کہ برے

نقش قرآن نا دریں عالم نشست
 نقش ہائے کاہن و پاپا شکست (جاوید نامہ ص ۹۰)
 اس کے بعد کیا ہوا، غور سے سنئے۔ پہلے اس حقیقت کو بامدحرت پیش کرتے ہیں کہ :-
 منزل و مقصود قرآن دیگر است
 رسم و آئین مسلمان دیگر است
 درویش و آتش سوزندہ نیست
 مصطفیٰ در سینہ آؤزندہ نیست
 بندہ مومن ز شدہ آں بہ نورد
 در یارب آؤندہ می دیدم نہ دُرد
 اس کے بعد کہتے ہیں کہ کس قدر مقام حیرت و تأسف ہے کہ :-
 خود طلسم قیصر و کسری شکست
 خود ہر تخت ملکیت نشست

تاناہاں سلطنت قوت گرفت دین او نقش از ملکیت گرفت

از ملکیت نگہ گرد و دگر

(جاوید نامہ ص ۸۷)

عقل و ہوش و رسم و راہ گرد و دگر

اس قوم میں اس بحر العقول تبدیلی کا راز، اس حکمت میں پنہاں ہے کہ ان کی خلافت ملکیت میں بدل گئی۔

خلافت نے انہیں، ہر نوع غلامی سے رستگاری عطا کر دی تھی۔ ملکیت نے ان کی آزادی کو سلب کر لیا۔

بچوں خلافت رشتہ از قرآن گیسخت حریت را فہر اندر کام ریخت (امر اور موزن ص ۱۲۷)

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

مومن و غداری و فک و نفاق!

مومن و پیش کساں بستن نفاق

ہم متاع خانہ و ہم خانہ سوخت

با پیشینے دین و ملت با فروخت

نازہ اندر نیازش بود و نیست

لا الہ اندر نمازش بود و نیست

بلوہ در کائنات اُونمساند

فرد در صوم و صلابت اُونمساند

فردنا ہموار و ملت بے نظام

روح چون رفت از صلوٰۃ و از صیم

از چنین مرداں چہ اُمید بہی

سینہ ہا از گدے می قرآن ہے

ناقہ مابے زمام و ہرزہ رو

ہر کے بر جادہ خود کشند رو

واحد تاکہ ہے

العجب۔ ثم العجب۔ ثم العجب!

صاحب قرآن دے ذوق طلب

(جاوید نامہ ص ۳۴-۳۵)

وہ کہتے ہیں کہ یہ بات کس قدر ناقابل فہم ہے کہ جس قوم کے پاس ایسی کتاب زندہ موجود ہو، وہ قوم

مردہ ہو! وہ بعد حیرت کہتے ہیں کہ

یا مسلمان مرد یا قہاں بمر دے (جاوید نامہ ص ۸۷)

رفت سوز سینه و تاناہاں دگر د

وہ مسلمان سے کہتے ہیں۔

دگر گوں گشتہ! از خویش بگمیز

ز قرآن پیش خود آئینہ آویند

قیامت ہلے پیش را برا بگمیز! (ارمغان حجاز ص ۱۰۲)

ترا از دے بنہ کردار خود را

تحریکِ پاکستان کے دوران ایک عجیب حیرت افزا اور دل خراش حقیقت سامنے آئی۔ ہندوؤں کا سب سے بڑا لیڈر (مہاتما) گاندھی تھا جس کی تمام ننگ تاز کا مقصد قدیم ہندو دھرم کا احیاء تھا اس کے مقابلے میں قومیت پرست مسلمان لیڈروں کی حالت یہ تھی کہ وہ اسلام کے ایک ایک بنیادی عنصر کو خیر باد کہتے چلے جاتے تھے۔ کہیں ڈاکٹر سید محمود اور آصف علی خاں لیڈر تھے جو مذہب کو داستانِ پارینہ قرار دیتے تھے، کہیں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جیسے ماہرینِ تعلیم تھے جو مہاتما گاندھی کے تجویز کردہ خطوط پر واردہ کی تعلیمی اسکیم "مرتب فرما رہے تھے۔ کہیں امام الہند، مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو اسلام کا برہمن سماجی ایڈیشن پیش کر رہے تھے۔ کہیں شیخ الحدیث، مولانا حسین احمد مدنی جیسے علماء کرام تھے جو متحدہ قومیت اور سیکولر ازم کو عین مطابق اسلام قرار دے رہے تھے۔ یہ تھی وہ سینہ سعد حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ نے با صد نالہ و فغاں کہا تھا کہ :

درِ صدقتہ را بر خود کشا دی دو گلے رفتی داز پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود اراست تو قراں را سر طاقی نہادی
اور یہ کہ :

ننگہ دارد برہمن کارِ خود را نمی گوید بکس امر را بر خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر بدوش خود بردز تا بر خود را
(ارمغانِ حجاز) (۱۳۴۷ھ)

مُلا اور قرآن | میرے نزدیک، حضرت علامہ کا سب سے بڑا اور معرکہ آرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بحالِ جرأت و جسارت اس حقیقت کو طشتِ اذہان کیا کہ امت کو قرآن سے برگشتہ کرنے کی بنیادی ذمہ داری ہماری مذہبی پیشوائیت پر عائد ہوتی ہے جسے وہ ملا کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہوں نے ملا کے خلاف جو کچھ کہا ہے وہ کسی خاص ملا یا طبقہ علماء کے خلاف نہیں۔ وہ مذہبی پیشوائیت کی INSTITUTION کے خلاف ہے۔ جس نے اسلام کو کچھ کچھ بنا دیا اور امت کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ عنوان، ایک مستقل موضوع ہے جسے میں کسی دوسری نشست پر اٹھا رکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت میں اس کے اُن دو ایک ضمنی گوشوں کو سامنے لاؤں گا جن کا تعلق براہِ راست قرآن سے ہے۔ وہ جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبان سے کہتے ہیں :-

دین حق از کافر می رسوا تر است
زانکه ملا مومن کافر گداست !
شبم ماورنگاه مایم است
ازنگاه اویم ما شبم است !
از سگر فیہائے آن قراں فروش
زانسوسے گمہ دوں دلش بیگانہ
بے نصیب از حکمت دین نبی
آسمانش تیرہ از بے کو کہی !
کم نگاه و کور ذوق و ہرزہ گرد
ملت از قال و قولش فرو فرو

حدید کہ ۱-۵

مکتب و ملا و اسرار کتاب
کو رہ مادر زاد و نور آفتاب !

دین کافر، منکر و تدبیر جہاد

دین ملا فی سبیل اللہ فاد

(جہادید نامہ ص ۸۲)

وہ، مثنوی "پس چہ باید کرد" میں کہتے ہیں :-

مکتب و ملا سخنا ساختند
مومناں این نکتہ را شناختند

زندہ قوے بود، از تاویل مرد
آتش او در ضمیر او فند

ہر یکے دانائے قرآن و خبر
در شریعت کم سواد و کم نظر

عقل و نقل افتادہ در بند ہوس
منبر شاں، بمنبر کاک است دلبس

اس کلیماں نیست اُمید کشو
آسیں ہا بے ید بیضا چہ سو

(ص ۴۲-۴۱)

ان کی تاویل کے متعلق کہتے ہیں :-

زمین بر صوفی و ملا سلا مے

وے تاویل شاں در حیر انداخت

کہ پیغام خدا گفتند مارا

خدا و جبریل و مصطفیٰ را (ارمغار حجاز ص ۱۰۲)

اس کی تشریح ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

خود بدلتے نہیں قراں کو بدلتے

ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

(ص ۱۰۱)

ان کی ان تاویلات و تغیرات کا نتیجہ ہے کہ :-

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
 "تن بہ تقدیر ہے آج اُن کے عمل کا انداز
 جس نے موسیٰ کو بنایا مہ دیو میں کا امیر
 تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
 تھاجو "ناخوب" بتیکہ وہی "خوب" ہوا
 کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر (ضربِ کلیم)

پیغامِ بہ ملت

ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی قرآن کے خلاف سازش کا تار پود بکھیرنے کے بعد، وہ مسلمان سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں اور اسے دو ٹوک الفاظ میں کہتے ہیں کہ:۔۔۔

اے گم فتنہ رسومِ ایمان تو شیوہ ہائے کافر سی زندان تو
 گم تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن
 قرآنِ کریم نے، کتاب و حکمت - یعنی قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت کو منزلِ من اللہ
 بتایا ہے۔ جو علم و عقل کی دوسے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی قرآن، مجموعہ ہے کتاب و حکمت کا۔ اس حقیقت
 کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے مسافریں کہا ہے:۔۔۔

برگ و سازِ کتاب و حکمت است این دو قوت اعتبارِ ملت است
 اُن فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق این فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
 ہر دو انعامِ خدائے لایزال مومنانِ را آں جمال است این جلال
 اس کے بعد وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں:۔۔۔

برخوراز قرآن اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
 می دھد ما را پیغام لا تخف می رساند بر مقام لا تخف (مسافر ص ۴۲)
 وہ خصوصیت سے مغربِ زدہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔۔۔
 اے بہ تقلیدش اسیرِ آزاد شو دامنِ مسترانِ بگیر، آزاد شو

ص ۱ "اقبال" اور تہذیبِ مغرب الگ موضوع ہے۔ جس پر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

اب ہم اس موضوع کی طرف آتے ہیں جو فکرِ اقبال میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب خلافتِ ملوکیت میں بدل گئی تو اس سے اسلام پر کیا اثر پڑا؟ بظاہر یہ محض سیاسی نظام کی تبدیلی تھی۔ لیکن یہ محض سیاسی نظام کی تبدیلی نہیں تھی۔ اس سے اسلام ہی باقی نہیں رہا۔ اسلام ایک دین ہے (اور دین بھی دین اللہ) ملوکیت سے، یہ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مذہب نام ہے، خدا اور بندے کے درمیان پر ایسی ربط و تعلق کا جو مذہب پرست طبقہ کے عقیدہ کے مطابق) پوجا پاٹ، گیان دھیان، بھگتی اور پرستش کی رو سے قائم ہو سکتا ہے اس کے پھلنے اور مایہ کا کوئی خارجی اور مخصوص معیار نہیں۔ یہ خالص انفرادی احساس کا نام ہے۔ اس کے برعکس۔ دین اس نظامِ حیات کا نام ہے جس میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رو سے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دین کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ امت مسلمہ کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ جس میں احکام و اصول و اقدارِ قرآنی کو قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کیا جاسکے۔ اس مملکت کو قرآنی اصطلاح میں "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے (۲۵) جس کا مخفف "خلافت" ہے۔ قانون محض الفاظ کا مجموعہ ہونا ہے۔ اسے ایک مؤثر حقیقت اور زندہ نظام بنانے کے لئے قوتِ نافذہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قانون کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی لئے کتنا

دین و مذہب

کے ساتھ حدید (فولاد یعنی شمشیر) کو بھی منزل من اللہ کہا ہے۔ سورہ حدید کی آیت ۲۵ بڑی معنی خیز ہے۔ فرمایا: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا بِالْبَيِّنَاتِ۔ ہم نے رسولوں کو واضح دلائل و براہین کے ساتھ بھیجا۔ یعنی ہدایتِ خداوندی کے نافذ العمل کرنے کی پہلی منزل یہ ہے کہ اسے دلیل و برہان کی رو سے پیش کیا جائے۔ جو لوگ، علم و عقل اور غور و تدبر کے بعد اس کی صداقت کو تسلیم کر لیں۔ انہیں ضابطہ قوانین کے تابع لایا جائے۔ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ۔ اور ان رسولوں کے ساتھ ہم نے کتاب (ضابطہ قوانین) بھی نازل کی۔ اس سے مقصد کیا تھا؟ وَالْمُزَيَّنَّ اَنْ لِّيقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے معاملات کو از روئے عدل و انصاف طے کیا جائے۔ لیکن عدل کا قیام اسی صورت میں ممکن ہو گا جب اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے قوت بھی موجود ہو۔ اس کے لئے فرمایا: وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنْفَعَةٌ لِلنَّاسِ۔۔۔۔۔ (۲۶) اور اس مقصد کے لئے ہم نے فولاد (شمشیر)

بھی نازل کی۔ اس میں سختی بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے منفعت بھی اس کی سختی سے ظالم کو ظلم سے روکا جاتا ہے اور مظلوم کی دادرسی ہوتی ہے۔

قرآن اور شمشیر

جو اس کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے امت مسلمہ کو اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد دلائی کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور دین کے معنی ہیں ایسی آزاد مملکت جو قوانین خداوندی کی تنفیذ کے لئے وجود میں لائی جائے۔ انہوں نے پاکستان کا تصور اور مطالبہ اسی مقصد کے لئے پیش کیا تھا۔

مملکت کے لئے دو بنیادی عناصر لاینفک ہیں۔ قوانین اور قوت نافذہ۔ جہاں تک قوت کا تعلق ہے اقبالؒ نے اس سلسلہ میں ایسا پیغام دیا ہے جس میں اسلام کی پوری غرض و غایت سمٹ کر آجاتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ قرآن اور تلوار ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ تیغ کی اس لئے ضرورت ہے کہ قرآن کے قوانین کو عملاً نافذ کیا جاسکے۔ اور قرآن کی اس لئے کہ وہ (تیغ) قوت کو بے باک نہ ہونے دے۔ اسے محدود خداوندی کے اندر رکھ کر استعمال کیا جائے۔ ضربِ کلیم کی وہ مشہور نظم، جس کا عنوان ہی ”قوت اور دین“ ہے، ان کے اس پیام کی منظر ہے۔۔۔

اسکندر و چینگز کے ہاتھوں سے جہاں میں سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ اُم کا یہ پیغام اذلی ہے صاحبِ نظراں! نشہِ قوت، خطرناک
اس سیلِ بک سیرِ زمین گیر کے آگے عقل و نظر و علم دہن نہ ہیں خس و خاشاک

لا دیں ہر توبہ زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر

ہودیوں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا نڈیاک (ص ۲۳)
دوسرے مقام پر اس شمشیر کے متعلق، جو دین کی حفاظت کے لئے استعمال کی جائے، کہتے ہیں کہ یہ
اُس بیت کا یہ مصرعِ اول ہے کہ جن میں پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے امرا (ص ۲۴)
ان کے اس مشہور شعر:۔۔۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ چہرہ کی تماشا ہو جدا ہو دیں سیاسے تو رہ جاتی ہے چنگیز کا

(بالِ جبریل ص ۲۴)

میں، سیاسے مراد، اقتدارِ مملکت ہے اور دین سے مراد، حدودِ خداوندی یا اقدار و اصول۔

لیکن اس قسم کے اشعار کے علاوہ، انہوں نے قرآن اور تیغ کے باہمی رشتے کو جاوید نامہ میں (محرمہ خاتون)۔۔۔ شرف النساء کی زبان سے، جس حسین اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ انہوں نے

لکھا ہے کہ شرف النساء قرآن پاک کی تلاوت کرتیں تو تلوار کو اپنی کمر کے ساتھ پیوست رکھتیں۔ یہ اس کا زندگی بھر کا شعار تھا۔ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو یہ ہے

بر لبِ اوچوں دمِ آخر رسید سوئے مادر دید و شتِ ناز دید
گفت اگر از دامنِ داری خبر سوئے این شمشیرِ اس قرآنِ نگر
ایں دو وقتِ حافظِ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند
وقتِ رخصتِ با تو دارم این سخن تیغ و قرآن را جدا از من ممکن

مومنان را تیغ با قرآن بس است

(جاوید نامہ ص ۸۲-۸۳)

تم بہت ماما ہیں ساماں بس است

انہوں نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں، مومن حکمران کے متعلق کہا ہے کہ :-

حکمرانے بود و ساقا نداشت دستِ او جز تیغ و قرآن نہ داشت (ص ۸)

جاوید نامہ میں انہوں نے ملکِ مظفر کے قصہ کے ضمن میں کہا ہے کہ :-

مردِ مومن را عزیز اے نکتہ رس چیت جز قرآن و شمشیر و فرس؟ (ص ۱۲)

میں اسے دھڑادوں کہ قرآن و شمشیر کے باہمی رشتہ کے متعلق یہ کہہ کر کہ ”ایں دو وقتِ حافظِ یک دیگر اند“ اسلام کی جامع تفسیر بیان کر دی گئی ہے۔ اسلام اسی کا نام ہے! تلوار، قرآن کی حفاظت کرے اور قرآن، تلوار کی۔

ادبِ ہم سورہ حدید کی متعلقہ آیت (۲۵) کے پہلے حصے کی طرف آتے ہیں۔ یعنی کتاب (ضابطہ قوانین)۔ علامہ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو یہ حقیقت ان کے پیشِ نظر تھی کہ اس مملکت میں

سب سے اہم سوال قانون سازی کا ہوگا۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ

قانون سازی

اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ اس قدر مشکل ہو! جس اُمت کے پاس خدا کی

کتاب اپنی حقیقی اور غیر محرف شکل میں موجود ہو۔ اس کے لئے اپنی (اسلامی) مملکت میں قوانین مرتب کرنے

میں کون سی دشواری پیش آسکتی ہے؟ لیکن جاننے والے جانتے ہیں اور پاکستان کی تیس سالہ تاریخ نے اس

حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ بحالاتِ موجودہ، اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا مسئلہ دشوار ترین بلکہ

لایحل ہے۔ یہ اس لئے کہ اُمتِ مختلف فرقوں میں بیٹھ ہوئی ہے اور ہر فرقہ کا ضابطہ قوانین شریعت اپنا اپنا

اور الگ الگ ہے۔ اور کوئی فرق، اپنی فقہ کو چھوڑنا تو ایک طرف اس میں ذرا سے رد و بدل کے لئے بھی تیار نہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی واضح اور مسلمہ ہے کہ ایک مملکت اسی صورت میں مملکت بن سکتی اور قائم رہ سکتی ہے جب اس میں ایک مضابطہ قوانین نافذ ہو جس کا اطلاق تمام افراد مملکت پر یکساں ہو۔ سیکولر حکومتوں نے اس کا حل یہ تجویز اور اختیار کیا کہ مختلف فرقوں کو اس کی اجازت دے دی کہ وہ شخصی معاملات کے لئے اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور پبلک لاز (مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) حکومت مرتب کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام کو کبھی اسلامی نہیں کہا جاسکتا۔ اول اس لئے کہ قرآن کی رو سے پرنسپل اور پبلک لاز میں کسی قسم کی تفریق اور تخصیص نہیں کی جاسکتی۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ جسے پرائیویٹ اور پبلک سیکٹروں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے اس لئے کہ پرائیویٹ سیکٹر ہو یا پبلک۔ اسلامی حکومت اس کی مجاز نہیں کہ وہ بلا حدود و قیود و عام اصطلاح میں، مذہب کی دخل اندازی کے بغیر، قوانین مرتب کر سکے۔ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے ہی قوانین مرتب کر سکتی ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس اہم ترین (اور بظاہر مشکل ترین مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ اسلامی مملکت میں قوانین کی بنیاد خدا کی کتاب، قرآن مجید قرار پاتی ہے۔ جو قوانین اس بنیاد پر مرتب ہوں گے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ ان میں نہ پرنسپل اور پبلک لاز کی تفریق ہوگی، نہ فرقوں کی تخصیص۔ ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ انہوں نے اس سوال پر، نصویر پاکستان پیش کرنے کے بعد ہی غور نہیں فرمایا۔ یہ بہت پہلے سے ان کی فکر و تدبیر کا مرکز تھا۔ (مثلاً امرتسر میں اہل قرآن کی ایک جماعت تھی جس کے سربراہ، خواجہ احمد دین (مرحوم) تھے۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے کہ صوفی غلام مصطفیٰ آیتم نے (جواب مرحوم ہو چکے ہیں) حضرت علامہ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ قرآنی قوانین مرتب کرنے کے سلسلہ میں خواجہ صاحب کے ساتھ تبادلہ خیالات مفید ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں علامہ نے صوفی صاحب کو ایک مفصل خط لکھا، جو (تمہید حذف کرنے کے بعد) درج ذیل کیا جاتا ہے۔ فرمایا :-

”مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعت مجدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں۔ جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملہ کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی اوجھل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت

کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علی ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں۔ اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے، اس میں زیادہ تر زمانہ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کر فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو ”چرچ“ اور ”سٹیٹ“ میں امتیازِ کفر کے ان کو الگ الگ کر دیا ہے اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ (فرقِ اقوامِ اسلامیہ کے لئے باعثِ برکت ہوگا، یا شقاق و بغض کہ مولوی صاحب موصوف یا ان کے رفقا کو جو اسلامی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں، اس طرف توجہ کمرہ فی جاہئے۔ میں اور مجھ جیسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ یقین رہے ہیں کہ قرآن کا مل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ ”بلاغ“ امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت صاحب کے رسالہ ۔۔ ”اشاعت القرآن“ کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو علی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہونا ہے۔ نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے ”جورس پروڈنٹس“ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا احکام بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امر و فرمایہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے ہمارے اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت

امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت علمی کام کا ہے۔ کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(اقبال نامہ - حصہ اول ص ۵۱-۴۸)

اس خط میں، علاوہ دیگر امور، یہ الفاظ کہ ”جس میں صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو“ حضرت علامہؒ کے مرکز سی فکرم کی تین شہادت پیش کرتے ہیں۔ وہ قرآن خالص کو قانون سازی کی اساس قرار دیتے تھے۔ محترم محمد عیسیٰ صاحب نے علامہ سے اپنی ایک ملاقات کے سلسلہ میں کہا ہے :-

میں نے پوچھا: اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں؟ فرمایا ”مفصل کہو“ میں نے کہا: خارج از قرآن ذخیرہ، احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں لیکن نفس اسلام قرآن مجید میں کمال و تمام اچکا ہے۔ خدائے تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ (ملفوظات - مرتبہ محمود نظامی ص ۴۶-۴۵)

اسی طرح ایک اور نشست میں، گفتگو کے سلسلہ میں (عرشی صاحب نے) فرمایا ہے کہ ایک صاحب نے امیر حضرت مسیحؑ کے ضمن میں حضرت علامہ سے کہا کہ آپ لکھ دیجئے کہ آپ حدیث شریف کے مطابق مسیحؑ کی آمد ثانی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا ”میرا اعتقاد نہیں ہے“ انہوں نے کہا - ”کیا آپ کو حدیث کی صحت سے انکار ہے؟“

آپ نے فرمایا ”میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو معلوم ہے کہ یہ کن ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے۔“ (ملفوظات ص ۵۲-۵۱)

اسی طرح انہوں نے ستید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ ”مجھے اس سے انکار ہے کہ حدیث قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے۔“ (اقبال نامہ - جلد اول - ص ۱۳۵)

اس قسم کی تصریحات، حضرت علامہ کے مکتوبات اور ملفوظات میں حبستہ حبستہ مقامات پر بکثرت ملتی ہیں لیکن انہوں نے قانون سازی کے موضوع پر، خطبات تشکیلی جدید کے چھٹے خطبہ میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ چونکہ یہ موضوع بڑا اہم اور بنیادی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ بحث بکمال و تمام آپ حضرات کے سامنے آجائے۔ بنا بریں، میں اس خطبہ کے متعلق مقامات تفصیلاً پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، قرآن کریم نے انسانی زندگی سے متعلق اصول و اقدار عطا کئے ہیں اور اسے اُمت مسلمہ پر چھوڑا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی جزئیات اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، باہمی مشاورت سے خود مرتب کرے۔ حضرت علامہؒ اس باب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

”اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس، ازلی وابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر اور تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد

عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ

ہے۔ ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکاسکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے

ثبات و تغیر کا امتزاج

کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک و لاقع ہوتی ہے۔ یکسر جامد و متصل بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصول حرکت کا فرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔“

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہاد مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد

کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”سنی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا پورا کونا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظام شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے۔ اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانون شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔“

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ میں ان سے دو ایک اہم نکات پر انکشاف کر دوں گا۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں :-

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

”آئیے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے۔ اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہنمائی سے ہمارے قدیم فقہائے، قانون شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم ادھاحقہ انہی فقہاء کی بالغ نظری کا رہیں منت تھا۔ چنانچہ فان کریم اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم

ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ

قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں

حتیٰ اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن فطری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و دلائل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیا کے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و نما سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرا سمجھا، کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کو بنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی تعلیم کہ حیات، ایک ترقی پذیر عمل ارتقا ہے۔ اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیے۔ کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کر لے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:-
”قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا کہ:-

تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی
توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر
سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ
بنا دیا ہو۔

تیرہویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جاد
اور متعصب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا“

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

”اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف (افتراء) ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں استبداد جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو انسان سمجھنے کے بجائے معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس ”افتراء“ کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ مخرسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:-

اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مفسرین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت دشواریاں ہیں تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔“

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تفسیر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں از بس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ:-

”بدقسمتی سے ہمارے ہاں کادامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔

اگر اس قسم کی بحث چھڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔“

لیکن انہوں نے کہا کہ:-

”بابس ہمہ، میں مسئلہ زیر نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جرات ضرور کروں گا۔ سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قرنِ اول سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔“

علامہ اقبالؒ کی یہی جرات تھی جس کی وجہ سے وہ اربابِ دانش کی نگاہوں میں اس قدر واجب التکمیم و تکمیل بن گئے تھے۔ خود انہی کے الفاظ میں :-

آئینِ جواں مرداں، حق کوئی نبیا کی
اللہ کے شیروں کو آئی نہیں رہا ہی

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال ملے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاء حضرات کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن جب بات اُن ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کی جائے تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے۔ بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبداءِ فیض کی یہ انتہائی گرم گسٹری تھی کہ اس نے علامہؒ اقبال کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں :-

احادیث کی قانونی حیثیت

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول

الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض ترمیم فرمادی۔ اُجکل یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے کیونکہ ہمارے متفقین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ اُن کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور

رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو نیا کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے۔ جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی دوسرے رسول کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے، اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطہ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوین فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اقل قویہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مفسر یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا طرز عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرز عمل

کے ہم آہنگ ہو گا۔ جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقتنین میں ہوتا ہے۔
احادیث کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآنِ کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضورِ نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقہ بذریعہ وحی متعین نہیں ہوتے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکم خداوندی تھا کہ :-
”شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ“ (۱۵۷) ”ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کہو۔“
اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا۔ اور حضورؐ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ :-

”وَأْمُرْهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ“ (۱۵۸) ”یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں۔“
یہ طرزِ عمل دورِ خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ اس وقت تک یہ بات کسی کے حیطہ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصور خلافتِ راشدہ کے باقی نہ رہنے کے بعد پیدا ہوا۔
احادیثِ رسول اللہؐ (ادنان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصور امام مالکؒ اور ان سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا۔ اس مسلک پر امام ابو حنیفہؒ نے کڑی تنقید کی۔
اور قیاس کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی روش سے اُس سے ملے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔ علامہ اقبالؒ ان کی اس نذرِ پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :-

”انہوں نے اپنے آپ کو ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ ان سے اُن کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیتِ ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے ایک خاص دور کے ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنیفہ کے لئے (ایک رنگ ہیں) بڑی مفید

ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصول قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی واقعاتی نقل و حرکت اور متوجع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتب فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا اپنے خاص الخاص اصول فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ و تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں:-

”لیکن حکا حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہد رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مفدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔“

ان تصریحات سے ————— یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل قرآن احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے۔ ان میں تغیر و تبدل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہوگی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ

”وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (ترکی کے) اور جو زودیا بدیدہ دیگر مسلم اقوام کے سامنے آئے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرض کی روح کو لے کر آگے

بڑھے وہ عمرض جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے وہ

روح عمری

جسے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:-

حسبنا کتاب اللہ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں :-

”اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بناء پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو انبیائے قبل اناسلام کی روحانی غلامی سے نئے نئے آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے غیر متبادل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالم گیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل دغایت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔“

یہ ۱۹۲۸ء کی بات تھی۔ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، فرمایا :-

”نہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری۔ ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ ادھام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کیا ہے اور ہم بڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان کی اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی اُرزوں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمتگ کو محسوس کرنے لگے۔“

(بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر بابت جنوری - فروری ۱۹۷۸ء)

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تشکیلِ پاکستان کے بعد حضرت علامہ ہم میں موجود ہوتے تو وہ انہی اصولوں کے مطابق مملکتِ اسلامیہ پاکستان کے لئے آئین و ضوابط مرتب کر دیتے یا کر دیتے اور وہ ضابطہ پھر مسلمانوں کی ہر اس مملکت کے لئے جو حقیقی معنوں میں ”اسلامی“ بنا چاہتی، حضرت راہِ نہایت ہوتا۔ اس طرح یہ اُمت ان جکڑے بندوں سے، آزادی حاصل کر لیتی جن میں یہ صدیوں سے محبوس چلی آ رہی تھی۔

اب میں ایک اعتراض کی طرف آ رہا ہوں۔ ظاہر ہے علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور اس لئے دیا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی کسی مملکت میں قرآنی نظام رائج نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا خطہ زمین حاصل کیا جائے جسے قرآنی نظام کی تجربہ گاہ بنایا جائے۔ جب اس خطہ زمین میں قرآنی نظام برگ و بار لائے گا تو اس کے قابل صدر شک و موجب ہزار افتخار نتائج کو دیکھ کر مسلمانوں کی دیگر مملکتیں بھی اس نظام کو اپنے ہاں رائج کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی اور اس کے بعد اس کا بھی امکان ہے کہ اس نظام کے انسانیت ساز اثرات کو دیکھ کر غیر مسلم ممالک بھی اس

کیا یہ ممکن العمل بھی ہے؟

کی طرف چلے آئیں۔ یہ بھی علامہ اقبالؒ کی آرزو اور مطالبہ پاکستان کا جذبہ حرکت۔ لیکن اس میں سال کے عرصہ میں، نہ تو پاکستان میں قرآنی نظام رائج ہوا اور نہ ہی مسلمانوں کی کسی اور مملکت نے اس کی طرف توجہ کی۔ اس سے متعزبین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرت علامہ کی یہ آرزو محض شاعرانہ تخیل پر مبنی تھی۔ قرآن میں کسی زمانہ میں تو اس کی صلاحیت تھی کہ اس کی بنیادوں پر ایک قابل عمل نظام حکومت وجود میں آیا۔ لیکن اب وہ زمانہ گدا گیا۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ میں نے اس قسم کے اعتراضات کا تفصیلی جواب اپنے اس خطہ میں دیا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ ”کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟“۔ اس مقام پر میں صرف حضرت علامہؒ کی تصریحات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآن، سلسلہ رشد و ہدایت خداوندی کی آخری کڑی ہے جس میں تمام نوح انسان کے لئے ابدی حقائق محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ ”تمام نوح انسان کے لئے“ اور ابدی طور پر کے معنی یہ ہیں کہ قرآنی راہ نمائی نہ کسی خاص قوم کے لئے مختص ہے اور نہ ہی کسی خاص زمانے تک محدود۔ اللہ تعالیٰ نے اسے **ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ** (۳۸) کہا ہے۔ یعنی تمام اقوام کے لئے ضابطہ حیات۔ دوسرے مقام پر اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ ”اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ“ جس کی جڑیں پائال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تَوَلَّى اَكْلُهَا كُلَّ حَبٍ مِّنْ دُونِ مَرْقَہَا (۲۵-۲۶) اور وہ قانون خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں اپنے پھل دیتا جائے۔ حضرت علامہؒ کے الفاظ ہیں:۔

یہ نعمت فصل گل و لالہ کا نہیں پائید بہار ہو کہ خزاں لا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ (ضررِ سلیم)

اس لئے قرآن کی یہ صورت نہیں کہ کوئی خاص قوم اس پر عمل پیرا نہ ہو یا اسے ترک کر دے تو یہ اپنے نتائج پیدا

کرنا چھوڑ دے۔ اگر دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہ رہے جو پانی کی دیگی کو آگ پر رکھے تو اس سے پانی اپنی اس صفت کو کھونہیں دے گا کہ وہ ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر بجاپ بن جاتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص اسے آگ پر رکھے گا اس کی مضمحل خاصیت مشہود ہو جائے گی۔ قرآن مجید ایک عالمگیر ضابطہ حیات ہے۔ دنیا کی جو قوم جس زمانے میں بھی اسے اپنا ضابطہ زندگی قرار دے گی اس کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ علامہ اقبالؒ نے قرآنی نظام کے قیام کے لئے ہندی مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت کا مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ انہیں اپنی ملت سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ہزار جان سے چاہتے تھے کہ اس شجر طیب کے حیات اور پھل سب سے پہلے اس کی جھولی میں گریں۔ مسلمانوں سے ان کی عمر بھر یہی تاکید رہی کہ ہر چیز پر امت کی محبت و زبوں حالی کا شک ہے، اس میں بظاہر زندگی کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا، اس میں کوئی کشش اور جاذبیت باقی نہیں رہی، اس کے باوجود، اس کے ساتھ پیوست رہنا ضروری ہے۔ بانگ درا کی وہ نظم بڑی مشہور ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ :-

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ	ممکن نہیں ہری ہو سیلاب بہار سے
ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے	کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ بہار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور	خلی ہے جیب گل زبرِ کامل عیار سے
جو لغتہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور	رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے
شاخ بریدے سے سبق اندوز ہو کہ تو	نا آشنا ہے قاعدہ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ

(بانگ درا ص ۲۸)

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

دوسری جگہ بڑی دلسوزی کے ساتھ کہتے ہیں کہ :-

کہن شاخے کہ زیرِ سایہ او پر برادر دی چون برگش ریخت از مے آشیاں زشتنگ است

اس زوال پذیر امت کے ساتھ ان کی یہ محبت تھی جس کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ قمرانی نظام کی نشاۃ ثانیہ کی آماجگاہ اسی قوم کا حصہ ہو لیکن اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یہ تذکر بھی ان کے سامنے تھی۔ جس میں کہا گیا کہ، وَ اِنْ تَوَلَّوْاْ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اُمَّةً لَّكُمْ (۴۸) ”اگر تم نے اس قرآن سے اعراض برتنا تو خدا تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی“ وہ، اپنی قوم کے لئے

دل کے نازک ترین گوشوں میں انتہائی مجذباتِ محبت اور دوسری طرف خدا کے اس اٹل قانونِ استبدالِ قومی کو جس انداز سے یک جا پیش کرتے ہیں اس کی مثال کم ملے گی۔ میں اسے بادیہٴ پریم پیش کرتا ہوں۔ آپ اسے گوشِ نصیحتِ نبوت کے ساتھ سنئے۔ فرماتے ہیں:-

مخملِ ما، بے مے دے ساقی است	سازِ قرآن را فواہا باقی است
زخمہٴ ما بے اثر افتد اگر	آسمان دارد ہزاراں زخمہ در
ذکرِ حق از اُمتِ سنا آمد غنی	از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذکر جداست	احتیاجِ روم و شام اورا کجا است
حق اگر از پیشِ ما بردار دشت	پیشِ تو مے دیگرے بگزار دشت
از مسلمان دیدہ ام تقلیدِ وطن	ہر زمانِ حبانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند

آتشِ خود بردلِ دیگر زنند

(جاوید نامہ ص ۹۲-۹۱)

عزیزانِ من ! میں اس موضوع پر بہت کچھ اور بھی کہہ سکتا تھا لیکن قلمتِ وقت کی بنا پر اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کلام و پیامِ اقبال کا مرکز بھی قرآن ہے اور محور بھی قرآن۔ اس کی تعلیم کا عام کرنا ان کی زندگی کا مشن اور ان کا نصب العینِ حیات تھا اور اس کو ایک عملی نظام کی شکل میں متشکل کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا۔ بلاشبہ نرید کیا جا سکتا ہے کہ ہمارا سی ہزار سالہ تاریخ میں قرآنی پیغام اور حقائق کو حسن کارانہ انداز سے

پیامِ اقبالؒ

اس جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ:-

از تب و تا بم نصیبِ خود و بگر بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

اس لئے کہ:-

گو ہر دریائے قرآن سفتہ ام	شرحِ رمزِ صفتہ اللہ گفتہ ام
با مسلمانانِ غمِ بخشیدہ ام	کہنہ شاخے دانے بخشیدہ ام
عشقِ من از زندگی دارد سرغ	عقل از صہبائے من روشن یارغ
نکوتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت	با مسلمان حرفِ پر سوزے کہ گفت

ہمچونے نالیدم اندر کوہ و دشت تمام مقام خویش بر من فاش گشت
حرف شوق آموختم داسو خستم آتش افسردہ باز افرود خستم
یا من آہ صبح گاہے دادہ اند سطوت کوہے، بکا ہے دادہ اند
دارم اندر سینہ نور لا الہ در شراب من سرور لا الہ
فکر من گمہ دوں مسیر از فیض اوست جئے، ساحل ناپذیر از فیض اوست
پس بگیر از بادۂ من یک دو حبم

مسافر ص ۳۴-۳۵

تا در خشی مثل یخ بے نیام

انہیں خود اس کا احساس تھا کہ انہوں نے کس قدر پیام حیات بخش قوم کو دیا ہے اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ — اے خاک مردے کہ در عصر من است — (مسافر ص ۳۳) — اس کے بعد سوچئے کہ ہماری شوریہ بختی کس انتہا تک پہنچ چکی ہے کہ ہم نے اس فوائے حیات اور کی بھی کوئی قدر نہ کی اور اسے قوالوں کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ڈھولک کی تھاپ پر گائیں اور اس خوابیدہ قوم پر سکوت مرگ طاری کر دیں۔
”ڈھولک والوں“ سے اُسکے بڑھو کہ ہم، (نام نہاد) دانشوروں کے کوچے میں آتے ہیں تو وہاں ہمیں اس سے بھی زیادہ ناشتہ ایگر۔ صورت حال کا سامنا کہنا پڑتا ہے۔ ان حضرات کی بارگاہ سے حضرت علامہؒ کو جو سب سے بڑا خطاب عطا ہوا وہ شاعر مشرق کا تھا۔ اس خطاب کا اس شد و قند سے چچا کیا گیا کہ وہ اب ساری دنیا میں اسی حیثیت سے متعارف ہیں۔ آپ ذرا سوچئے کہ اگر کوئی مفکر اپنی حاصل فکر کا اظہار نہیں کرے تو ہم اسے نثر نگاروں کی صف میں نہیں گھرا کر سکتے۔ اسے مفکر ہی کہتے ہیں۔ لیکن اگر وہی مفکر، اپنی فکر کو زبانِ شعر میں پیش کرتا ہے تو ہم اسے مفکر نہیں کہتے شاعر کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اسی قسم ظریفی کا شکار ہیں۔ وہ عمر بھر کانوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر پکارتے (بلکہ چلاتے) رہے کہ بابا! میں شاعر نہیں۔ مجھے شاعری سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن ان کے سنائش گم انہیں مھٹلاتے چلے جاتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ تمہیں کچھ علم نہیں۔ تم شاعر ہو۔ اور بہت بڑے شاعر۔ علامہؒ نے اپنے پہلے مجموعہ نظم

میں شاعر نہیں

(پیام مشرق) کے ابتدائیہ میں کہا تھا کہ :

آشنائے من زمن بیگانہ رفت از خستنا تم تہی پیمانہ رفت
من شکوہ خسروی اورا دھسم منحت کسری زیر پائے اُدہم

اودیش دلسری خواہد ز من رنگ داکب شاعری خواہد ز من

کم نظر بے تابئی جا نم ندید

(پیام مشرق ص ۳)

اشکارم دید و پنہا نم ندید

اقبال کے نام لیوا، بالعموم اس کے ”اشکار“ کے گردیدہ رہے۔ اس کے ”پنہاں“ تک کسی کی نگاہ نہ گئی۔ جن کی نگاہ اس کے ”پنہاں“ تک پہنچی تھی انہوں نے برملا کہا تھا کہ :-

پردہ تو از نوائے شاعری است آنچه گوئی مادرائے شاعری است

(غنی کاشمیری - در - جادید نامہ ص ۱۹۵)

حضرت علامہؒ نے خود، سید سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھا تھا :-

”میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا قریب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا

قریب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی — ہاں — بعض مقاصد

خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی موسے میں نے نظم

کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔“ (مکتوبات - حصہ اول - ص ۱۹۵)

دیکھئے ! وہ انہیں شاعر سمجھنے اور کہنے والوں کو کن الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ زبورِ غم میں ہے سے

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم مثال شاعران افسانہ بستم

نہ بینی خیر ازاں مرد فرد دست کہ بر من تہمت شعر و سخن بست (ص ۲۰۴)

اوجہ یہ حضرات اس پر بھی باز نہیں آتے، تو وہ اس بارگاہ میں فریاد لے کر پہنچتے ہیں جس سے بلند بارگاہ ان کے

نزدیک کوئی نہیں۔ دیکھئے وہ کس درد و سوز سے فریاد کرتے ہیں کہ سے

باں راز سے کہ گفتم ، پے نبردند ز شلخ نخل من خرما نخر دند

من اے میرِ غم ! داد اف تو خواہم مرا یاداں غزل نخل نے شمر دند (ارمغان حجاز ص ۵۷)

اور اس کے بعد کہتے ہیں : سے

نہ شعراست اینکہ بروئے دل نہادم گمہ از رشتہ معنی کشادم

بامیہ سے کہ اکیرے زند عشق مس این مفلساں را تاب دادم

اور پھر یہ فریاد کہ : ہ

تو گفتی از حیاتِ مباداں گوستے بگو شش مُردہٴ پیغامِ جاں گوستے
ولے گویند ایں حقِ ناشناساں کہ تاریخِ وفاتِ ایں داکِ گوستے (ص ۵۸)

وہ گفتہٴ اقبالؒ کے متعلق کہتے ہیں کہ : ہ

انچہ گفتم از جہانِ دیگر است ایں کتاب از آسمانِ دیگر است (جہادِ نامہ ص ۶)
اس میں شبہ نہیں کہ اقبالؒ نے جو کچھ کہا وہ ”از جہانِ دیگر“ تھا۔ شاعری نہیں تھا۔ لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چاہے نہیں کہ (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انہوں نے شاعری کو بطور قدیمۃً ابلاغِ اختیار کیا (خواہ اس کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ تھا) اس سے ان کا پیغام وہ نتائجِ مرتب نہ کر سکا جو ان کا مدعا تھا۔ اس کے برعکس قوم نے اس کا غلط استعمال بھی کیا اور اُلٹا اثر بھی لیا۔ یہ اس لئے کہ آپ لاکھ کوشش کیجئے، شاعری ”ڈھولک سے الگ نہیں رہ سکتی اور ان دونوں کا آمیزہ اور عصارہ، افیون بن جاتا ہے۔ یہ وہ آمیزہ ہے جس کے متعلق خود علامہؒ نے (ابلیس کی زبان سے) کہلویا ہے کہ : ہ

طبعِ مشرق کے لئے موزوں ہی افیون تھا ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علمِ کلام (ارمغانِ حجاز ص ۱۶)
اس کے باوجود، پیغامِ اقبالؒ کو اگر اس کی فکر کے سرچشمہ، قرآنِ مجید کی روشنی میں سمجھا جاتا تو اس سے ہماری قوم حیاتِ تازہ سے ہمکنار ہو سکتی تھی لیکن قوم نے ایسا نہ کیا اور اس پر کوتاہی رہا۔ اسے بھی سمجھ لیجئے کہ اگر قوم نے ایسا نہیں کیا تو یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی یہ ایک گہری سازش کا نتیجہ تھا جس کا تانا بانا کہیں اور بُنا گیا تھا۔ (جیسا کہ حضرت علامہؒ نے اپنی مشہور نظم ”ابلیس کی مجلسِ شوریٰ“ میں کہا ہے) جہانِ ابلیس یعنی مغرب کی استعماری قوتیں خوب سمجھتی تھیں کہ اگر دنیا کے کسی خطہ میں بھی قرآنی نظام قائم ہو گیا تو وہ ان کے لئے پیغامِ موت ہو گا۔ اس لئے ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ۔ ہونہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں۔ پاکستان ان قوتوں کو اس نظام کی اولیں اُمجا گاہ بننا نظر آتا تھا کیونکہ یہی علامہ اقبالؒ کے پیغام کا اولین مخاطب تھا۔ اور تجربہ گاہ تھ چنانچہ ان قوتوں نے اپنی انتہائی لطیف فریب کاری سے کام لیتے ہوئے ایسا نظام کیا کہ یہاں قرآن کا نام تو بے شک لیا جائے لیکن اس کا پیغام، عام نہ ہونے پائے اور چونکہ اقبالؒ بھی قرآن کا پیام پر تھا اس لئے یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ اقبالؒ کو بھی اس کا صحیح مقام نہ مل سکے۔ ان کی یہ سازش بڑی کامیاب رہی ہے۔ اقبالؒ یہاں محض ایک شاعر بن کر رہ گیا ہے۔

قرآنی آواز طلوع اسلام کے مرکز سے اٹھتی تھی۔ اس کے خلاف اس قسم کا منتظم پراپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ وہ الحاد اور دیہی کے مرادف قرار پائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں مایوس نہیں اور قرآن کے پیغام اور اس کی روشنی میں، فکرِ اقبالؒ کو عام کے جا رہا ہوں۔ میں محض اپنے قیاس کی بناء پر فیصلہ کیوں کہ لوں کہ قوم اب زندہ ہو ہی نہیں سکتی اور پھر مایوس ہو کہ بیٹھ جاؤں۔ یہ بھی تو قرآن کی روشنی میں، اقبالؒ ہی نے کہا تھا کہ :

مرگ داساماں ز قطع آرزو است	زندگانی محکم از لالتفتو است
تا امید آرزوئے پیسم است	تا امید زندگانی داسم است
زندگی ریا پس خواب اور بود	ایں دلیل سستی عنصر بود
ازدش میرد قوائے زندگی	خشک گردو چشمہ ہائے زندگی

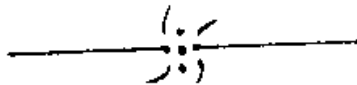
(اسرار و رموز ص ۱۰۸)

قرآن کی یہی اشد جانفزاسی ہے جو اس لبل طویل سفرِ زندگی میں مجھے تھکنے نہیں دیتی اور قدم قدم پر یہ کہہ کہہ میرا حوصلہ جلا کر دیتی ہے کہ :

مسلم استی اسینہ را از آند و آباداد
ہر زماں پیش نظر لا یخلف للمیاداد

والسلام

بہترین



روٹی کا مسئلہ

(اقبال کی نظر میں)

ہمارے نزدیک اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اقبال نے قوم کو پھر سے قرآن سے آشنا کرنے میں مسلسل جدوجہد کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مملکت پاکستان، جس کا اس نے تصور دیا تھا، بھی ایک گمراہی نہمت ہے۔ لیکن اقبال کے الفاظ میں، مملکت ایک کوشش ہوتی ہے (قرآنی) نصب العین اصولوں کو زمان و مکان میں صورت پذیر کرنے کی۔ یہ آرزو ہوتی ہے ان اصولوں کو کسی خاص انسانی ادارہ میں رُو بہ عمل لانے کی یعنی اسلامی نقطہ نگاہ سے مملکت کی اہمیت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند مقاصد کو جنہیں قرآن نے عطا کیا ہے عملی پیکر میں ڈھالنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبال نے قرآن کے ان بلند مقاصد کو قوم کے سامنے بے نقاب کیا اور انہیں بتایا کہ ان کی زندگی اور سرفرازی کا راز انہی مقاصد کی عملی تشکیل میں ہے۔

قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بلند مقاصد کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور ان کی جزیات کو بالعموم غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ قرآن پر عمل کرنے والی قوم ان جزیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں خود متعین کرتی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دور میں زندگی کا کوئی تقاضہ نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تقاضے سے متعلق قرآن کے اصول بھی نمایاں طور پر سامنے آ جاتے ہیں۔ ہمارے دور میں انسانی زندگی کے جس تقاضے نے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کی ہے، وہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی ہے روٹی کا مسئلہ اس کے ساتھ رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ نے ایک عالمگیر تقاضے کی حیثیت سے ہی دور میں اختیار کی ہے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اقبال جو زندگی کے تقاضوں پر قرآن کی روشنی میں غور کرتا تھا، اپنے دور کے لیے اہم تقاضے سے غیر متاثر رہتا اور قرآن نے اس باب میں جو رہنمائی دی ہے اسے پیش نہ کرتا۔ اقبال کا پہلا دور ان بڑھتے ہوئے تقاضوں سے متاثر ہونے کا

ہے۔ دوسرا دور اس حل پر غور و فکر کرنے اور اسے قرآنی روشنی میں پرکھنے کا ہے جو تنہا عقل انسانی نے اس مشکل کے لئے دریافت کیا۔ اور تیسرا دور وہ ہے جس میں اس نے اس مشکل کا قرآنی حل پیش کیا ہے۔ اس دورِ اول کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب ان کی انٹرن میں سب سے پہلی کتاب ”علم الاقتصاد“ کے عنوان سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا تھا :-

” اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سبیل رواں میں، اصول مذہب بھی بے انتہا موثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزِ مرقہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزِ نما کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قوی کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یاویں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی، قلمی، انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ ایسا اوقات انسانی رُوح کے مجملہ آئینہ کو اس قدر رنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے معلّم اول یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلتی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مذہب قومی محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہے، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مغربی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مغربی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کو چوں میں چپکے چپکے کر لہنے والوں کی وگڑاؤں صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا درونِ ناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحہٴ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔“

یہ مسئلہ کی بات ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی مشہور نظم ”حضرتِ راہ“ میں حضرت سے پوچھتے ہیں :-
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟ اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خرچون؟
اس کے جواب میں حضرت کہتا ہے :-

بندہ مزدور کو جاکہ سراپیغام دے
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گم
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیغام کا نکات
شاخ آہر پر رہی صدیوں تک تیری برکت
انہائے مادی سے کھا گیا مزدور مات
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز
اٹھ کر اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
اس کے بعد پیغام مشرق میں دیکھئے وہ صحبت رنگاں کے عنوان میں طالسائی، کارل مارکس، ہیکل، مزدور
کو ہیکن وغیرہ سب کو جمع کرتے ہیں ادا ان کی زبان سے اس اہم تعارض کی ترجمانی مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے
کرتے ہیں۔

طالسائی کہتا ہے

بارکشن اہرن لشکر می شہر یاب
از پئے نان جو میں تیغ ستم بر کشید
داردے بیہوشی است تلج، کلیسا، وطن
جان خرد اواد را خواہ، بجائے حمید

کارل مارکس کہتا ہے

راز دان جزد و کل از خویش نامحرم شد
آوم از سرمایہ داری قابل آدم شد است
ہیکل اپنا فلسفہ اضماد پیش کرتا ہے، اور طالسائی اسے "عقل دور" کی چابک دستی قرار
دے کر اس کی تردید کرتا ہے۔

مزدور اعلان کرتا ہے کہ

دور پر ویزی گزشت اے کشتہ پر ویز خیز
فرانسیسی فلاسفر کوٹلٹ مزدور کو یہ سبق دیتا ہے کہ
نعمت گم کردہ خود را در خسرو باز گیر
نیاید ز محمود کار ایاز

اور مزدور ایک پرمعنی تبسم سے جواب دیتا ہے کہ

حق کو ہیکن دادی اسے نکتہ سنج
یہ پرویز پر کار دنا بدہ رنج

آخر میں "قسمت نامہ سرمایہ دار مزدور" میں وہ ان دولوں کا تقابل نہایت وضاحت اور خوبصورتی

سے کرتا ہے۔ جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ

خونائے کارخانہ آہن گم می زمین
گلابنگ از غنوں کلیسا از ان تو

نخل کے شہ نخل جرمی نہ سزمن بارغ بہشت مسدود و طوبی ازاں تو
 ایں خاک دا نچہ در شکم اواز ایں من در خاک تابہ عرش معلیٰ از آں تو
 اور افس کے بعد "نوائے مزدور" میں کہتا ہے کہ
 بیہ کہ تازہ نوامی تراود از رگ ساز مئے کہ شیشہ گداز و بر ساعز اندازیم
 مغان و دیر مغان را نظام تازہ دہیم بنائے میکہ ہائے کہن بر اندازیم
 زہر بن چسمن انتقام لالہ کشیم بر بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم
 یہی دعوت انقلاب ہے جسے ہم "زبور غبم" میں اس سے تیز انداز میں دیکھتے ہیں، جہاں اقبالؒ
 کہتا ہے کہ

خواہ از خون رگ مزدور سازد لعل نا از جغائے وہ خدایاں کشت دہقان خراب
 انقلاب

انقلاب، اے انقلاب
 من درون شیشہ ہائے عمر حاضر دیدم آہنچناں زہرے کہ ازوے مار با دیر چ و نا
 انقلاب

انقلاب، اے انقلاب
 بال جبریل میں "فرشتوں کا گیت" اسی نظام سرمایہ داری کی تباہ انگیز لوہی کے خلاف صدائے احتجاج ہے، جس میں
 کہا گیا ہے :-

خلیٰ خدا کی گھات میں زند و قید و میر پور تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی
 پیر امیر مال مست تیرے غیر حال مست بندہ ہے کو پر گرد ابھی خواہ بلبند بام ابھی
 یہی وہ احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ
 اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو
 جس کھیت سے دہقان کو میر نہیں رہی اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو
 اسی کتاب میں لیکن کی وہ مشہور درخواست بھی ہے جس میں وہ خدا سے کہتا ہے کہ
 تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تیری منتظر لوم مکافات

یہ ہیں نظام سرمایہ پرستی کے انسانیت سوز نتائج، جنہیں اقبالؒ کی نگہ بصیرت نے بھانپا اور جو اس کے قلب حساس کی گہرائیوں سے نشتروں کی شکل میں سطح سے اُپر اُبھرے۔ یہی وہ اشعار ہیں جنہیں کمیونسٹ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں گاتے ہیں اور ان سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبالؒ بھی کمیونسٹ تھا۔ لیکن اقبالؒ کمیونسٹ نہیں تھا، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کمیونزم کے دو حصے ہیں۔ ایک تو ان کا یہ دعویٰ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کو سمیٹ کر اپنے قبضہ میں لے لے جبکہ عزیز اور اس کے بچے بھوکوں مرنے پڑے ہوں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے۔ اس کا ہر وہ مسلمان ہمنوا ہے جو قرآن سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اقبالؒ بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اسے اس کا ہمنوا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن دوسری چیز ہے کمیونزم کا وہ فلسفہ جس پر وہ اس دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یعنی ہیگل کی جدلیت اور کارل مارکس کی تاریخ کی معاشی تعبیر جس کی ٹوسے، خدا، وحی، رسالت، آخرت سب کا انکار ہوتا ہے۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کی تائید کوئی مسلمان نہیں کر سکتا اور چونکہ اقبالؒ مسلمان تھا اس لئے وہ اس فلسفہ کا سخت مخالف تھا۔

۱۹۲۳ء کا ذکر ہے، شمس الدین حسن نامی ایک صاحب نے (جو کمیونزم کے پُر جوش حامی تھے) اخبار

زمیندار (مورخہ ۲۳، جون) میں ایک مضمون میں لکھا:-

”بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر کسے ملک کا سب سے بڑا شاعر، اقبالؒ قانون کی زد سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ بالٹوزم، کارل مارکس کے فلسفہ سیاسیات کا کتب لباب ہے اور اسی کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ کی نظم - خضر راہ - اور ان کے مجموعہ کلام، پیام مشرق، کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ ہیں۔“

اس کے جواب میں حضرت علامہؒ کا، ۲۴، جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں، خط شائع ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ:-

”میرے افکار کو بالٹوزم منسوب کرنا غلط ہے۔ بالٹویک خیالات لکھنا میرے نزدیک اڑھ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔“

(۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل

قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔

(۳) روسی بالٹوزم یورپ کی ناقابل اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زیر دست رد عمل ہے لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالٹوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے، ۱۹۳۶ء میں، خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں لکھا۔
 ”سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں، اور اسے ایفون تصور کرتے ہیں۔ لفظ ایفون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروتوں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا۔۔۔ جو روحانیت میرے نزدیک معضوب ہے، یعنی ایفونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم سوا سلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے، جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔“
 (اقبال نامہ، حصہ اول ص ۳۱۵)

یہی وجہ ہے کہ اقبال کارل مارکس کو ”کلیم“ تو کہتا ہے لیکن بے تحشی اور ”مسح“ قرار دیتا ہے۔ لیکن بے صلیب حتیٰ کہ وہ جاوید نامہ میں افغانی کی زبان سے یہ کہلاتا ہے۔

صاحب سرمایہ از نسل خلیل	یعنی اُس پیغمبر بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل اومضمحل است	قلب اومومن دماغش کافر است
عزبیاں گم کردہ اند افلاک را	در شکم جویند جان پاک را
دین اُس پیغمبر ناحق شناس	بر مساوات شکم دار و اساس

وہ کہتا ہے کہ جب روٹی کے مسئلہ کو خالص مادی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان حیوانی سطح پر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس کی انسانیت مردہ ہو جاتی ہے۔ لہذا اس قسم کی اشتراکیت ہو، یا مغرب کی ملوکیت، انسانیت کے حق میں دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔

ہر دور اجالِ ناصبور و ناشکیب ہر دور یزدانِ ناشناس آدمِ فریب
زندگی میں راخِ بروجِ آسِ راخِ سراج درمیانِ اس دو سنگِ آدمِ زحجاج
عزقِ ویدم ہر دورِ در آب و گل ہر دورِ راتنِ روشن و تاریکِ دل
زندگانیِ سوختنِ با ساختن
در گنجِ تخمِ وے انداختن

یہی سوختنِ با ساختن ہے جسے اقبالؒ لاء اور الاء سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روس کا اشتراکِ نظام و حقیقت لاء کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی تمام کوششیں تخریبی ہی تخریبی ہیں۔ وہ "ساختن" یعنی الاء تعمیر کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ وہ "پس چہ باید کرد" میں روس کی اسی کشمکش کے بارے میں کہتا ہے۔

روسِ راقب و جبکہ گردِ دیوِ خون از ضمیرش حرفِ لاءِ آمدِ بدول
آں نظامِ کہنہ را بر ہم زو دست تیز نیشتے بر برگِ عالمِ زداست
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ ! لاءِ سلاطین لاءِ کلیا لاءِ اللہ
فسکہ اور تند بادِ لاءِ بساند مرکبِ خود را سرکھے الاءِ نراند

یہاں سے وہ تیسرا دائرہ شروع ہوتا ہے، جہاں اقبالؒ اس اہم تقاضے کے متعلق قرآنی حل پیش کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے "سوختن اور ساختن" کے اصول کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ:

نکتہ می گویم از مردانِ حال اُمّتاں را لاءِ جلالِ الاءِ جمال
لاءِ الاءِ اصحابِ کائنات لاءِ الاءِ فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و لون حرکت از لاءِ زاید از الاءِ سکون
در مقامِ لاءِ نیا ساید حیات سوئے الاءِ می خرامد کائنات
لاءِ الاءِ ساز و برگِ اُمّتاں نفیِ بے اثباتِ مرگِ اُمّتاں

لاء کے معنی ہیں ہر غلط نظام کو تباہ کر دینا۔ اور الاء کے معنی ہیں اس کی جگہ ایک صحیح نظام قائم کرنا۔ یہ صحیح نظام صرف مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کیا جاسکتا ہے، اور مستقل اقدار عقل کی رُو سے کبھی نہیں مل سکتیں یہ اقدار صرف وحی کی رُو سے مل سکتی ہیں اس لئے کہ

عقلِ خود میں غافل از بہرِ دغیر سودِ خود بیند، نہ بیند سودِ غیر

وہی حق بیسندہ سو وہی دنگا شس سود بہبود ہوس

اسی لئے اقبالؒ نے افغانی کی زبانی (جاوید نامہ میں) روس کو یہ پیغام دیا تھا کہ

تو کہ طرح دیگر سے انداختی دل زدستور کہن پر داخستے

کردہ کار خردا ونداں تمام بگزار از لا جانب الا خرم

درگذر از لا اگر جوئندہ تارو اثبات گیری زندہ

ایک می خواہی نظام عالمے جستہ اور اساس محکمے؟

اقبالؒ کے نزدیک نظام عالم کے لئے اس قسم کی محکم اساس قرآن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے روس سے کہا کہ

داستان کہنہ شستی باباب فکراروشن کن ازام الکتاب

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ

چیت قرآن؟ خوابہ را پیغام مرگ دستگیر بندہ بے ساز و برگ

پس خیر از مردک زرکشس مجر لمن تئالوا الیدرحتی شفقتوا

بامسلمان گفت جاں برکت بند ہر مہ از حاجت فزوں داری بد

اقبالؒ کو تخریبی قوت یا تخریبی پروگرام کی نا محکی پر اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ روس زیادہ دیر تک تخریب کے گرداب میں رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی مثنوی ”پس چہ باید کرد“ میں یہاں تک کہہ دیا کہ :-

آید شس روزے کہ از زور جنوں خویش رازیں تند باد آرد برون

چنانچہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں جو انہوں نے سرفرانس یگ ہنزینڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا (اور جو

۳۱ جولائی کے ’سول اینڈ ملٹری گزٹ‘ میں شائع ہوا تھا) لکھتے ہیں :-

”ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرۃً لاد مذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ

روسی عورتیں اور مرد بڑے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں، اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ

باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دہریت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا وقت ملے گا وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے چونکہ بالشویت کے سانحہ خدا پر ایمان اور اسلام قریب قریب ایک ہی چیز ہیں اس لئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا، اگر کچھ زمانے کے بعد روس اسلام کو مضہم کر لے یا اسلام روس کو۔

لیکن اقبالؒ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمیشہ اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یورپ کا فلاں ملک مسلمان ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے اور ہماری بھی قسمت جاگ اٹھے۔ وہ مسلمانوں سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تمہاری قسمت تمہارے اپنے ہاتھوں ہی سے بیدار ہوگی۔ لہذا اس نے مسلمانوں سے کہا کہ اس وقت زمانہ کے تقاضوں سے جو معاشی کشمکش پیدا ہو رہی ہے تم اس کی روشنی میں قرآن پر غور کرو۔ اس سے قرآن تمہیں ایسی راہنمائی دے دے گا جس سے نہ صرف یہ کہ تمہاری قسمت بیدار ہو جائے گی بلکہ تمام اقوام عالم کی قیادت تمہارے حلقہ میں آجائے گی۔ چنانچہ وہ "فرب حکیم" میں کہتے ہیں کہ

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم	بے سود نہیں روس کی یہ گمراہی گنہگار
اندیشہ ہوا شوخی افکار پہ مجھ سبب	قرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر	کھلے نظر آتے ہیں بستہ بیج وہ ہلکار
قرآن میں ہو غلط زن اے مرد مسلمان	اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
جو حوت "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک	اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو در

چنانچہ جب خود اقبالؒ نے زمانہ کے ان تقاضوں کی روشنی میں قرآن کریم پر غور کیا تو اس کے سامنے یہ حقیقت آگئی کہ قرآن کی رو سے رزق کے فطری چشموں پر انداز دی ملکیت کا تصور یکسر باطل ہے۔ خدائے رب العزت نے سامان رزق کو تمام نوع انسانی کی پرورش کے لئے عام کر رکھا ہے۔ اس لئے اسے اس مقصد کے لئے عام ہی رہنا چاہئے۔ رزق کے چشمے زمین سے پھوٹتے ہیں اس لئے زمین کے متعلق اقبالؒ صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ

حق زمین راجز متاع مانہ گفت	این متاع بے بہا مفت است مفت
وہ خدایا نکستہ از من پذیرد	رزق و گور ازوے بگیر آورا بگیر

بذوق خود را از زمین برین راست
ایں "مستلح" بندہ و ملک خداست
باطن "الارض للہ" ظاہر است
ہر کہ این ظاہر نہ بیند کافر است
آب و نان ماست از یک ماندہ
دودۃ آدم کنفیس و احسده

بال جبریل، میں قرآن کی اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، جہاں لکھا ہے ہے
پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون لایا پکھنچ کتہ پتھم سے یاد ساز گار؟
کس نے بھری موتیل سے خوشہ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھائی ہے خورے انقلاب؟
دہ خدا یا یہ زمین تیرا نہیں، تیری نہیں
تیرے آبار کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں

علامہ اقبالؒ، پاک۔ "ان کا حصول بھی اسی مقصد کے لئے چاہتے تھے کہ یہاں خدا کے اس نظام کو رائج کیا
جاسکے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے قائد اعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا کہ :-

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ
گزشتہ دو سال سے ان کی حالت مسلسل گہنی چلی جا رہی ہے۔۔۔ لیگ کا مستقبل
اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش
کرنی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے
کی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے۔
۔۔۔۔۔ شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ
اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم عام معاش
کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں
شکل میں ترمیم، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو، حقیقت میں کوئی
انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔۔۔۔۔ ان مسائل کے

حل کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔“

یعنی اقبالؒ کے نزدیک ایک الگ اسلامی مملکت کی ضرورت اس لئے تھی کہ یہاں قرآن کے معاشی نظام کا نفاذ کیا جاسکے جیسا کہ خود اقبالؒ کو اندیشہ تھا لیکن نے اس باب میں کچھ نہ کیا، جس کا خمیازہ لیگ اور اس کے ساتھ سارا ملک بھگت رہا ہے۔

طلوع اسلام، قرآن کی اس انقلابی دعوت کو جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا تھا، آگے بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ مفاد پرستانہ مذہبیت کی طرف سے قرآن کی اس آواز کو دہانے کے لئے جو کچھ کیا جا رہا ہے، اس سے کون واقف نہیں۔

پرویز

قانون شریعت میں اصول ارتقاء

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ پاکستان میں، اسلامی قانون کی تدوین کے مسئلہ میں دلچسپی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اور اس سلسلہ میں طلوع اسلام کی کوششوں کو سراہا جا رہا ہے۔ اس موضوع پر ہم اکثر و بیشتر علامہ اقبالؒ کے ایک خطبہ کے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ علامہ کے ان خیالات کی اہمیت کے پیش نظر اکثر قارئین کی طرف سے تعلقے موصول ہوئے ہیں کہ ان کا یہ خطبہ پورے کا پورا رکھا کر دیا جائے تاکہ علامہ کے خیالات مربوط شکل میں سامنے آجائیں۔ علامہ اقبالؒ کے خطبات کے مجموعہ کا نام ہے۔

(THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM)

ان میں چھٹا خطبہ اسلام میں قانون سازی کے اصول سے متعلق ہے۔ اس کا عنوان ہے۔

(THE PRINCIPLE OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM)

اس کا دواں ترجمہ، ”قانون شریعت میں اصول ارتقاء“ کے عنوان سے کوئی بیس برس پہلے طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔ جن حضرات نے علامہ اقبالؒ کے ان خطبات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی زبان کس قدر فلسفیانہ، ادق اور ایجاز و ارتکاز کی حامل ہے۔ لیکن مضامین کے ترجمہ میں جو دشواریاں پیش آسکتی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ ہم نے یہ رواں ترجمہ ایسے انداز میں کیا ہے جس سے بات بآسانی سمجھ میں آجائے اس کے لئے بعض مشکل مقامات کی وضاحت فرمیں اور بعض کی حواشی ہیں کی گئی ہے۔ اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ اس خطبہ کو سرسری نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ اس کے ایک ایک فقرہ کو غور سے پڑھا جائے اس طرح آپ کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ قوانین شریعت کی تدوین و تجدید کے متعلق علامہ کا نقطہ نظر کیا تھا۔ اس کے ساتھ، اس بات کو بھی مد نظر رکھیے کہ یہ خطبات آج سے قریب پچاس سال پہلے لکھے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر علامہ آج زندہ ہوتے تو بعض ایسے مقامات جن میں کچھ ابہام یا محسوس ہوتا ہے، زیادہ واضح ہو جاتے، اور پاکستان کے موجودہ حالات کی روشنی میں، وہ اپنے خیالات کے مطابق، ایک جامع قانون شریعت مرتب کر دیتے۔ بائیں ہمارے، علامہ کے خیالات اس باب میں ایسے

واضح ہیں کہ ان کی روشنی میں، قرآنِ کریم کی بنیادوں پر منابطہ قوانین مرتب کرنا مشکل نہیں۔
یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے نزدیک، دین میں سند خدا کی کتاب ہے۔ ہم اگر کسی باب میں کسی انسان کا
قول پیش کرتے ہیں تو وہ محض تائیداً ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اس خطبہ کو بھی ہم اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ جزئیات
سے قطع نظر، اس میں اصولی طور پر حیات کبھی گئی ہے، وہ قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔

علامہ اقبالؒ کا خطبہ

ایک ثقافتی تحریک کی حیثیت سے، اسلام نے کائنات کے متعلق قدیم سکونی تصور کو رد کر کے اس کی
جگہ حرکیاتی تصور اختیار کیا ہے۔ دوسری طرف، ایک جذباتی نظام وحدت کی حیثیت سے وہ فرد کی قدر و منزلت
کا پورا پورا اعتراف کرتا ہے اور نوع انسانی کی وحدت کی بنیاد خون کے رشتوں پر نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ خن کے
رشتے کو انسانی وحدت کی بنیاد قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم مادی علاقے کی زمین گیر سے بلند نہیں ہونا چاہتے۔
وحدت انسانی کے لئے (مادی علاقے سے بلند ہو کر)، ایک نفسیاتی بنیاد کی تلاش و جستجو اسی صورت میں ممکن
ہے جب ہمیں اس کا احساس ہو جائے کہ زندگی کی اصل و بنیاد (مادی نہیں بلکہ روحانی ہے)۔ اس احساس و تصور
سے انسانی وفا شعار و اطاعت پذیر مادی کے فتنے مراکز سامنے آتے ہیں جنہیں زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے مادی
قسم کی رسوم پرستی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہی وہ احساس و تصور ہے جس سے انسان کے لئے مادی زمین گیر
سے رستگاری ممکن ہے۔ شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو، جو ابتداءً ایک خالق ہی نظام کی حیثیت سے منقرض
شہرہ پر آئی تھی، وحدت انسانی کی بنیاد قرار دینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا۔ عیسائیت کی یہی وہ

ح: اس خطبہ میں متعدد مقامات پر روحانی (SPIRITUAL) کا لفظ آئے گا۔ ان مقامات میں SPIRIT

کا لفظ مادہ (MATTER) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ خالق ہی روحانیت کے معنوں میں نہیں۔

م: مادہ سے رستگاری سے مراد یہ نہیں کہ مادی کائنات ایک جمل خانہ ہے جس سے نجات حاصل کرنا مقصود زندگی ہے۔ اس سے

مراد یہ ہے کہ انسان اپنے سامنے صرف طبعیاتی زندگی کو رکھے بلکہ انسانی زندگی کو رکھے جو مادی علاقے سے بلند ہو کر

(حیاتِ اخروی کی شکل میں) اگے چلتی ہے۔

ناکامی تھی جس سے مجبور ہو کر شاہنشاہ جولین کو پھر سے قدیم رومی اصنامیات کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس نے اسے فلسفیانہ تعبیرات کا لبادہ اوڑھادیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کا ظہور ہوا ہے۔ اس زمانے میں مہذب دنیا کی حالت کیا ہو چکی تھی، اس کا نقشہ ایک مغربی مؤرخ تہذیب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

”اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قہر شدید جو چار ہزار سال میں جاگم تعمیر ہوا

ظہور اسلام کے وقت دنیا کی حالت

تھا۔ منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے اور نوع انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جائنا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین اپنی قوت و احترام کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملکیت کے انداز کہن کا سکہ دینا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین و سائیر کو رائج کیا تھا، وہ نظم و ضبط اور وحدت و یکجہتی کے بجائے تشتت و افراق اور ہلاکت و بربادی کا موجب بن رہے تھے۔ مغربیکہ وہ وقت اچکا تھا۔ جب ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز او شاہاد شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور اُردٹ، سائنس اور لٹریچر کے زریں ثمرات سے چہرہ یاب ہو چکی تھیں، اب لٹکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھیں۔ اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلہ حرب و ضرب کے طوفانوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے، اور یہ ٹکڑے صرف رسومات پارینہ کے بدن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلق ہر وقت خطر تھا کہ نہ معلوم کب گم ہو جائیں۔“

ظہور اسلام کے وقت دنیا تہذیب و تمدن کا یہ نقشہ کھینچنے کے بعد یہ مؤرخ سوال اٹھاتا ہے کہ:- ”کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر کہیں سے پیدا کیا جاسکتا تھا جو نوع انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہئے تھے۔ اس لئے کہ پرانی رسومات اور آئین و ضوابط سب مردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔“

اس کے بعد یہ مؤرخ لکھتا ہے کہ اس وقت دنیا کو ایک ایسے کلچر کی ضرورت تھی جو ”نخت و تاج کے کلچر“ اور وحدت انسانی کے ان تمام نظامہائے کہن کی جگہ لے لیتا جن کا دارخون کے رشتوں پر تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ امر موجب حیرت و

استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر سرزمین عرب سے پیدا ہوا۔ اور میں اس وقت پیدا ہوا جب دنیا کو اس کی اشرف صورت تھی۔

لیکن اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں۔ حیات کائنات و جہانی طور پر اپنے تعاضول کا احساس کر لیتی ہے اور نازک ساعتوں میں وہ اپنا نسخہ آپ متین کر لیتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے مذہب کی زبان میں وحی نبوت کہا جاتا ہے۔ یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ اسلام کا خورشید جہان تاب، ایک ایسی سادہ قوم کے افق شعور سے طلوع ہوتا جسے کسی قدیم ثقافت کی ہوا تک نہ لگی تھی اور جو ایک ایسی سرزمین میں بستی تھی جہاں تین بڑے بڑے اعظم انگلیز ہوتے تھے۔ اس جدید ثقافت نے دنیا کو بتایا کہ وحشت انسانیت کی بنیاد صرف اصول "توحید" پر رکھی جاسکتی ہے۔ نظام سیاست کی حیثیت سے اسلام، اس اصول توحید کو، نوع انسانی کی جذباتی اور نکرہ زندگی میں ایک جیتا جاگتا عنصر بنانے کا عملی ذریعہ ہے۔ اس کا مطالبہ تخت و تاج کی اطاعت نہیں۔ صرف خدا کی اطاعت ہے اور چونکہ ذات خداوندی، حیات کلی کی روحانی اساس و بنیاد ہے، اس لئے خدا کی اطاعت سے مفہوم، انسان کا خود اپنی مثالی فطرت کی اطاعت ہے۔ نہ کسی غیر کی محکومیت۔

اسلام کا پیش کردہ تصدیق ہے کہ حیات کلی کی یہ روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود

تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ

کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری

ثبات و تغیر کا امتزاج

ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں مستقل اور تغیر پذیر جیسے تضاد عناصر، میں تطابق و توافق پیدا کرے، اس کے لئے

ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس

لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا

پاؤں ٹکاسکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔

وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔ ————— تو اس سے زندگی

جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے۔ یکسر جامد و متصل بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کے عمرانی اور سیاسی علما

میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔

اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامدادی غیر متوک بن کر رہ گیا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصول حیات کار فرما ہے؟ یہ اصول وہی ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اجتہاد اجتہاد کے لغوی معنی جدوجہد اور پوری پوری کوشش کے ہیں۔ اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں کسی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنے کے لئے جدوجہد کا نام اجتہاد ہے۔ نیز خیال ہے کہ یہ تصور قرآن کریم کی اس آیہ جلیلہ سے مستنبط ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ **وَالَّذِينَ جَاءُوا هَدًى** **فَبَيْنَا لَهُمْ دِينَهُمْ سُبُلًا مِّنْ بَيْنَ أَيْمَانٍ** (۱۹۹) جو لوگ ہماری متعین کردہ منزل تک پہنچنے کے لئے پوری پوری کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں اس منزل تک پہنچنے کے راستے دکھا دیتے ہیں، اس کی تشریح نبی اکرمؐ کی ایک حدیث میں ملتی ہے۔ روایت ہے کہ جب حضرت معاذ کو یمن کا گورنر مقرر کیا گیا تو رسول اللہؐ نے ان سے پوچھا کہ وہ معاملات کے فیصلے کس طرح کریں گے۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ میں تمام امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کروں گا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر کسی معاملہ میں کتاب اللہ سے راہ نمائی نہ ملے تو پھر اس کے جواب میں حضرت معاذ نے کہا کہ ایسی صورت میں، میں رسول اللہؐ کے نظائر کی طرف رجوع کروں گا۔ مگر ارشاد ہوڑا کہ اگر اس باب میں یہ نظائر بھی خاموش ہوں تو؟ تو میں اپنے اجتہاد سے فیصلہ دوں گا۔ یہ تھا حضرت معاذ کا جواب۔

(یہ تھی اس تصور کی ابتداء۔ لیکن تاریخ اسلام کے طالب العلم کی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اسلامی مملکت کی توسیع کے ساتھ، ایک منظم اور باضابطہ قانونی فکر کی ضرورت لاینفک ہو گئی۔ یہی وہ ضرورت تھی جس کے ماتحت، ہمارے قدیم فقہاء عرب اور غیر عرب دونوں۔ اس باب میں برابر محنت کرتے رہے تاکہ ان کی اجتماعی فکر، ہماری فقہ کے مسئلہ مذاہب کے پیچیدوں میں جلوہ پیرا ہو گئی۔ یہ فقہی مذاہب، اجتہاد کے تین مدارج تسلیم کرتے ہیں۔

(۱) اجتہاد مطلق۔ یعنی قانون سازی کا اختیار کئی۔ جو ان مذاہب کے ائمہ کی ذات تک محدود ہے۔

اجتہاد کے تین مدارج

(۲) اضافی اجتہاد - یعنی کسی ایک مذہب فقہ کے اندر رہتے ہوئے، اجتہاد کی ضرورت

(۳) خصوصی اجتہاد - یعنی ان مسائل میں اجتہاد جنہیں ائمہ فقہ نے غیر معین چھوڑ دیا ہو۔

میں اس خطبہ میں صرف شق اول (اجتہاد مطلق) کے متعلق گفتگو کروں گا۔

سنی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظام شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر موجود زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتعاشی تصور کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی۔ جس نے قانون شریعت کو بحیرہ منجمد بنا کر رکھ دیا۔ بعض مغربی مصنفین کا خیال ہے کہ اس جمود کا باعث ترکوں کا اثر ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال سطحی سا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے مذاہب فقہ، ترکوں کے اثرات کی آمد سے بہت پہلے اپنی آخری شکل میں مرتب و منہجکل ہو چکے تھے۔ میرے خیال میں اس کے حقیقی اسباب حسب ذیل ہیں۔

جمود کے اسباب

۱۔ اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ عباسیوں کے ابتدائی دور میں، اسلام میں معقولیت (معتزلہ) کی ایک تحریک پیدا ہوئی تھی جس کی وجہ سے کئی تند و تلخ بحثیں چھڑ گئی تھیں۔ مثلاً ان دو گروہ (منقولیت اور معقولیت) کے درمیان ایک ماہ الزلزلہ مسئلہ یہ بھی تھا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ معقولیت (معتزلہ) نے اس کے غیر مخلوق ہونے سے اس بنا پر انکار کیا کہ ان کے نزدیک یہ عیسائیت کے اس عقیدہ کی ایک دوسری شکل تھی جس کی رُو سے وہ "کلمہ" کو قدیم مانتے ہیں۔ اس کے برعکس، قدامت پرست گروہ (محدثین) نے جنہیں بعد میں عباسی خلفاء

محدثین کا گروہ

کی تائید اس بنا پر حاصل ہو گئی کہ وہ معتزلہ کے سیاسی اثرات سے خائف تھے۔ معتزلہ کی اس وجہ سے مخالفت کی کہ ان کا خیال تھا کہ قرآن کو مخلوق مان کر وہ اسلامی معاشرہ کی بنیادیں کمزور کر رہے ہیں۔ مثلاً نظامِ معتزلہ (معتزلہ) کو لیجئے۔ اس نے احادیث کا قریب قریب انکار کر دیا اور حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق علانیہ کہہ دیا کہ وہ قابلِ اعتماد راوی نہ تھے۔ چنانچہ کچھ تو اس لئے کہ ان معقولیت کے حقیقی منشا کے متعلق لوگوں کو غلط فہمی ہوئی اور کچھ اس لئے کہ ان میں سے بعض کے افکار بے باک سے ہو گئے، قدامت پسند گروہ نے اس تحریک کو اُمت میں انتشار

پیدا کرنے کا موجب سمجھا اور اسلام کے نظام تمدن و سیاست کے استحکام کے لئے خطرہ تصور کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسلامی معاشرہ کو انتشار سے بچایا جائے، اس مقصد کے حصول کے لئے، ان کے سامنے ایک ہی طریق کار تھا۔ اور وہ یہ کہ اس کے لئے شریعت کے ڈنڈے کو استعمال کیا جائے اور اپنے ضابطہ قانون کو شدت کے ساتھ سخت گیر بنادیا جائے (یعنی اس میں نہ کوئی لچک رکھی جائے نہ کسی تغیر و تبدل کی گنجائش)۔

تصوف

(۲) اسلامی قانون شریعت کے جامد اور متصل بن جانے کا یہ پہلا سبب تھا۔ اس کا دوسرا سبب، مسلمانوں میں خالصتاً ہیئت کے تصوف کی نمود اور فروغ تھا۔ اس نے، یکسر غیر اسلامی اثرات کے ماتحت، آہستہ آہستہ، ملت کو زندگی کے عملی مسائل سے بیگانہ بنا کر، قیاسی اور نظری تصورات میں الجھا دیا۔ خالص مذہبی نقطہ نگاہ سے، تصوف نے فقہاء اور مکلفین کی لفظی ٹوسگانیوں اور شکات آفرینیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مثال کے طور پر حضرت سفیان ثوری کہلیجی۔ یہ اپنے دور کے بڑے فائبر ہیں، مقتشین میں سے تھے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ایک خاص فقہی مذہب کے بانی، لیکن چونکہ ان کا رجحان شدت سے روحانیت کی طرف تھا۔ اس لئے انہوں نے فقہ کی خشک بجوش سے تنگ آ کر تصوف کی آغوش میں پناہ لے لی۔ جہاں تک تصوف کے تصوراتی پہلو کا تعلق ہے (جس نے بعد میں ایک فلسفہ کی شکل اختیار کر لی) یہ آزاد خیالی کا منظر اور معقولیت کا ہمرنگ ہے۔ لیکن اس نے ظاہر اور باطن کے امتیاز پر جس قدر زور دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باطن کی اہمیت بر طبعی گئی اور زندگی کے ظاہری پہلو سے بے اعتنائی اور بے التفانی کا رجحان راسخ ہو گیا۔ ترک دنیا کے اس مسلک نے اگے چل کر مسلمانوں کی نگاہوں سے اسلام کے سیاسی اور تمدنی گوشے کو، جو اپنے اندر برہمی اہمیت رکھتا ہے، بیکراؤ جھل کر دیا۔ دوسری طرف اس نے عقائد و انکار کی دنیا میں جس قدر آزادی دے رکھی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ملت کے بہترین دماغوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اس طرح کان نمک میں جا کر نمک بن گئے۔ جب بہترین دماغ اس طرف چلے گئے تو سیاست لامحالہ کم مایہ اور ادنیٰ اصلاحیتیں رکھنے والے افراد کے ہاتھوں میں آگئی۔ باقی رہے عوام۔ سوچو نہ کہ قوم میں بلند پایہ مفکرین کا فقدان ہو گیا جو ان کی صحیح فکری راہ نمائی کر سکتے، اس لئے انہوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ مختلف فقہی مذاہب کی اندھی تقلید کرتے رہیں۔

زوالِ بغداد

(۳) ان سب پر طرہ یہ تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں بغداد پر تباہی آگئی جو مسلمانوں کی حیاتِ عقلی کا مرکز بن چکا تھا۔ یہ حادثہ فی الحقیقت مسلمانوں کے لئے طامۃ الکبریٰ اور ایسا جانکا صدمہ تھا کہ اس زمانے کے کم و بیش تمام ہمعصر مؤرخین جب تائاری حلوں کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہیں تو دبی زبان سے خود اسلام کے مستقبل کے متعلق یابوسی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جب اس تباہی نے ملت کا شیرازہ اس طرح بکھیر دیا تو قدامت پرست مفکرین نے، قوم کو مزید انتشار سے بچانے کی خاطر اپنی تمام تر توجہات کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا کہ کسی نہ کسی طرح معاشرتی زندگی کی یکسانیت کو محفوظ رکھ لیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے فتوح دے دیا کہ فقہائے سلف نے جو قوانینِ شریعت مرتب کر دیئے ہیں، ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کیا جاسکتا۔ (اس طرح ہر قسم کی نڈرتِ فکر، بدعت یعنی ضلالت قرار پا گئی) ان حضرات کے پیش نظر صرف ملت کا معاشرتی نظم تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس باب میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال اور عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس اہم حقیقت کو نہ سمجھا۔ اور نہ ہی اسے ہمارے دور کے علماء سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ان کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا افراد کی قوت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جس میں جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے، فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے معاشرتی فکر کے سرمایہ کا تو مالک بن جاتا ہے لیکن اس کی اپنی روح مُردہ ہو جاتی ہے۔ لہذا قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔

ماضی کا جھوٹا احترام

جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک معنیٰ نے کہا ہے :-

”تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے۔ جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔“

لہذا زوال اور عناصر کی روک تھام کا مؤثر طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قوم میں بخود خیزہ افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گیرائیوں کے سر بستہ راز کھولتے ہیں۔ وہ ایسے نئے معیارِ زیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدل نہیں کہ اسے چھوڑا تک نہ جائے۔ ہم اس میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تیرہویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تعالیٰ سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے بکھر خلاف تھا۔ قدامت پرست

علماء کلیہ یہ وہ رجحان تھا جس کا ردِ عمل امام ابن تیمیہؒ کی صورت میں نمودار ہوا۔

امام ابن تیمیہؒ

ابن تیمیہؒ بغداد کی تباہی کے پانچ سال بعد، ۱۲۶۳ء میں، پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت، حنبلی مذہب کی روایات کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ وہ

ایک زبردست اہل قلم اور نہایت سرگرم مبلغِ اسلام تھے۔ انہوں نے خود مجتہد ہونے کا دعویٰ کیا اور اس عقیدے کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور جو کچھ مذاہب فقہ نے مرتب کر دیا ہے وہ شریعت میں حرفِ آخر ہے۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح استدلال فقہ مرتب ہوئی تھی، ہم بھی انہی اصولوں کے ماتحت اسے از سر نو مرتب کر سکتے ہیں۔ فرقہ مظاہرین کے امام ابن حزمؒ کی طرح انہوں نے بھی حنفی مذہب کے قیاس اور اجماع کے اس تصور کی تردید کی جو ان کے ہاں شرع سے چلا آ رہا تھا۔ اس لئے کہ ان کی یہ رائے تھی کہ اس طرح کا اجماع درحقیقت قہم پرستیوں کی بنیاد ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام ابن تیمیہؒ کے زمانے میں جس قسم کی ذہنی ابتری اور اخلاقی کمزوری عام ہو رہی تھی، اس کے پیش نظر ان کا یہ مسلک بالکل درست تھا۔

سولہویں صدی میں امام سیوطیؒ نے بھی مجتہد ہونے کا دعویٰ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کا بھی اضافہ کیا کہ ہر صدی کے آخر پر ایک مجدد پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ابن تیمیہؒ کی تعلیم کی روح کا مکمل مظاہرہ اس تحریک میں جا کر ہوا جو اٹھارہویں صدی میں، ریگ نادر نجد سے اٹھی۔ اس خطہ سے جسے سیکڑا لٹلٹلنے "زوال پذیر اسلامی دنیا کا پاکیزہ ترین خطہ قرار دیا ہے۔"

نجدی تحریک

یہ تحریک عظیم مضمرات و ممکنات کی حامل تھی۔ اس سے اسلام کی حیاتِ تازہ کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ایشیا اور افریقہ کی قریب قریب تمام جدید تحریکوں کا

مرحشہ زندگی، بالواسطہ یا بلاواسطہ، یہی تحریکِ نجد ہے۔ مثلاً سنیوں کی تحریک، بین الاسلامی (پان اسلامک) تحریک یا ایران کی باآبی تحریک، جو درحقیقت عربی براعظم کی تحریک کا ایرانی عکس ہے۔ ان سب میں وہی روحِ کارفرما نظر آتی ہے۔ اس نجدی تحریک کا بانی، محمد بن عبدالوہابؒ نے ۱۱۰۰ھ میں پیدا ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدینہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایران کا سفر کیا اور پھر اپنی مسلسل سعی و عمل سے (انہوں نے اپنی روح بے قرار کی حرارت کو تمام عالمِ اسلامی کے رگ و پے میں دوڑا دیا۔ ان کا جوشِ عمل، امام غزالیؒ کے شاگرد، ابن تومارت کے جوش و ولولہ کے مشابہ تھا جو اندلس کی تباہی کے بعد پیدا ہوا اور جس نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس وقت ہم اس نجدی تحریک کی سیاسی سرگرمیوں سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ جنہیں محمد علی پاشا نے ختم کر دیا۔ اس تحریک

کے اس اجمالی سے مذکورہ سے مقصود صرف اُس روح آزادی کو سامنے لانا ہے جس کی یہ منظر تھی، اگرچہ اپنی داخلی سرشت میں یہ تحریک بھی قدامت پرستی ہی پر مبنی تھی۔ یعنی یہ ایک تحریک، ایک طرف اس عقیدہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی تھی کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں اور اپنے لئے حق اجتہاد کی زبردست مدعی تھی لیکن دوسری طرف، ماضی کے متعلق اس کا طرز عمل یکسر غیر ناقدانہ تھا اور قوانین شریعت کے لئے وہ صرف احادیث نبویؐ پر مدار رکھتی تھی۔

ترکی

اب ترکی کی طرف آئیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اجتہاد کا نظریہ، جسے عصر حاضر کے فلسفیانہ تصورات نے بڑی تعویت اور وسعت دے دی ہے، ترکوں کی مذہبی اور سیاسی فکر میں ایک عرصہ سے کارفرما ہے۔ یہ حقیقت قانون شریعت کے متعلق حلیم ثابت کے جدید نظریہ سے بالکل ظاہر ہے کہ جس کی بنیاد جدید عمرانی تصورات پر رکھی گئی ہے۔ اگر اسلام کی نشاۃ ثانیہ ایک حقیقت ہے اور میل ایمان ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے تو ترکوں کی طرح ایک دن ہمیں بھی اپنی علمی میراث کا از سر نو جائزہ لے کر اس کی صحیح قیمت متعین کرنی ہوگی۔ اس سے اگر ہم نے عام فکر اسلامی میں کوئی قابل قدر اضافہ نہ بھی کیا، تو ہم کم از کم اتنا تو کر سکیں گے کہ اپنے ماضی پر صحیح تنقید سے، بے راہ دوسی اور مذہب سے برگشتگی کی اس رو کو ختم کر سکیں جو اس وقت عالم اسلام میں برپا چلی جا رہی ہیں۔

میں اب ترکی کے مذہبی اور سیاسی افکار و رجحانات کا ایک اجمالی سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس ملک کے فکر و عمل کے دوائر میں اجتہاد کی قوت کس درجہ نمایاں ہو رہی ہے۔ اب سے کچھ وقت پہلے، ترکی میں دو مکاتب فکر تھے۔ ایک وہ جس کی نمائندگی وہاں کی نیشنلسٹ پارٹی کرتی تھی اور دوسرا وہ جس کی ترجمان مذہبی اصلاح کی علمبردار جماعت تھی۔ نیشنلسٹ پارٹی طے کے پیش نظر سب سے اہم سوال مذہب نہیں بلکہ مملکت کا مفاد ہے۔ ان کے نزدیک مذہب کا کوئی آزادانہ منصب ہی نہیں۔ قومی زندگی میں مملکت ہی وہ ضروری عنصر ہے جس سے دیگر عناصر کے فرائض و مناصب معین ہوتے ہیں۔

ط۔ یہی تحریک ہے جو عام میں دہائی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اور جو اب ملک اہل حدیث کی شکل میں متعارف

ہے۔ یہ حضرات ماضی پرستی میں اہل فقر سے بھی زیادہ متشدد ہیں۔

۲۔ اسے پیش نظر رکھئے کہ یہ بات ۱۹۲۸ء میں کہی گئی تھی۔

انہوں نے چنانچہ، مذہب اور سیاست کے فرائض کے متعلق قدیم خیالات کو یکسر مسترد کر دیا ہے اور اس امر پر زور دیا ہے کہ مذہب کو ریاست سے الگ کر دینا چاہئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک مذہبی اور سیاسی نظام کی حیثیت سے اسلام کی ہئیت ترکیبی اس قسم کے تصور کی اجازت دیتی ہے۔ اگرچہ میراثی خیال ہے کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ مملکت کے تصور کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ یہ تمام دیگر اسلامی تصورات پر غالب اور حاکم ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں روح اور مادہ، دین اور دنیا، دو الگ الگ دائرہ حیات نہیں اور اس کا فیصلہ کہ فلاں کام دنیاوی ہے یا دینی، اس کام کے کرنے والے کی نیت سے ہوتا ہے، خواہ

اس کام کا مقصود، کیسا ہی دنیاوی کیوں نہ ہو۔ (بالفاظ دیگر) کسی کام کے دنیاوی یا دینی ہونے کا فیصلہ اس کام کی نوعیت

دین اور سیاست کی ثنویت

نہیں کہتی بلکہ وہ ذہنی پس منظر کرتا ہے جو بالکل غیر مرئی (INVISIBLE) ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کام "دنیاوی" اس وقت کہلائے گا جب اسے زندگی کے گوناگوں علاقے سے یکسر بے تعلق ہو کر کیا جائے۔ لیکن وہی کام "روحانی" ہو جائے گا۔ اگر اس کا جذبہ محرکہ حیات کے وہ علاقے ہوں، اسلام میں، ایک ہی حقیقت کو اگر ایک زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مذہب (کلیسا) بن کر دکھائی دیتی ہے اور اسے دوسرے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مملکت ہو جاتی ہے (یعنی اسلام میں مذہب اور سیاست ایک ہی حقیقت ہے)۔ شکریہ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مذہب اور مملکت ایک شے کے دو رخ یا دو گوشے ہیں۔ (دو رخ یا دو گوشے نہیں بلکہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں) اسلام ایک ناقابل تقسیم اور واحد حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو جس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے یہ وہی بن جائے گی۔ یہ نقطہ بڑا دوسرا ہے اور اگر اس کی وضاحت شرح و بسط سے کی جائے تو ہم بہت بلند اور دقیق فلسفیانہ بحث میں الجھ جائیں گے۔ اس لئے میں اس مقام پر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ مذہب اور سیاست کی ثنویت، اس قدیم غلط تصور کی پیدا کردہ ہے جس کی رو سے انسان کی وحدت کو ان دو جداگانہ حقیقتوں میں تقسیم کر دیا گیا جن کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ ان کا نقطہ اتصال تو ضرور ہے لیکن یہ حقیقت ایک دوسرے سے یکسر متضاد اور متضاد ہیں۔ (یعنی روح اور مادہ کی مغایرت

روح اور مادہ

کا تصور، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب روح (SPIRIT) کو زمان و مکان کی نسبتوں سے دیکھا جائے تو اسے مادہ کہتے ہیں (اس لئے روح اور مادہ الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں) وہ وحدت جسے انسان کہا جاتا ہے، جسم دکھائی دے گی جب ہم اسے خارجی دنیا میں کام کرتا دیکھیں۔ لیکن جب ہم اس مقصد اور غایت پر نگاہ رکھیں جس کے لئے وہ کام کیا جا رہا ہے تو یہی وحدت روح (SOUL) یا (MIND) بن جائے گی۔ ”توحید“ کو جب ایک عملی تصور کی حیثیت سے دیکھا جائے تو مساوات، سالمیت SOLIDARITY اور حریت اس کے بنیادی خصائص نظر آئیں گے۔ جس ادارہ کو مملکت کہا جاتا ہے، اسلامی نقطہ نگاہ سے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ”توحید“ کے انہی بنیادی خصائص کی مادی پیکروں میں متشکل اور کارفرما کرنے کا ذریعہ ہے۔ یا بالفاظ دیگر، اس نصب العین کو انسانی معاشرہ کے قالب میں ڈھالنے کی آواز۔ اسلام میں مملکت کے ”خدائی حکومت“ ہونے سے مفہوم صرف اتنا ہی ہے۔ اس سے یہ مفہوم نہیں کہ اس کا رئیس یا صدر، خدا کا نائب ہے جو اپنے مستند ارادوں اور جابرانہ فیصلوں کو برسرِ عصا معصومیت کے نقاب میں چھپا کر، خدا کے بندوں پر اپنا حکم چلاتا ہے۔ جو لوگ اسلامی نظام حکومت پر تنقید کرتے ہیں ان کی نگاہوں سے یہ اہم حقیقت اوجھل ہوتی ہے۔ عصر حاضر کی سائنس نے اس حقیقت کو منکشف کر دیا ہے کہ مادہ اپنا ایک الگ وجود نہیں رکھتا۔ اس کی اصل روح (SPIRIT) کے اندر ہے۔ اس انکشاف نے اسلام، بلکہ دنیائے مذاہب کی ایک بہت بڑی خستہ انجام دی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ مادی دنیا یا محسوس کائنات کوئی نجس اور قابل نفرت شے نہیں ہے۔ مادہ کا یہ عظیم ذخیرہ محض اس لئے وجود میں لایا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ انسانی ذات PERSONALITY اپنے اندر استحکام پیدا کر کے اپنے مقام کو پالے۔ لہذا مادی کائنات مقدس اور پاکیزہ ہے۔ نجس اور خبیث نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسین الفاظ میں ”یہ تمام دنیا مسجد ہے“ لہذا اسلامی نقطہ نگاہ سے، مملکت اس کا گاہ کا نام ہے جس کے اندر انسانی ذات، معاشرہ کی مساوات کے بیدار اور مستحکم ہو کر اپنے مقام کو پالیتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر وہ مملکت جو تغلب و تسلط پر مبنی نہ ہو، اور جس کا مقصد ان مثالی اصولوں کا حصول ہو، ”حکومت خداوندی“ ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترکِ توہمیت پرستوں کے ذہن میں مذہب اور ریاست کی تفریق کا خیال، یورپ کے سیاسی افکار کی تاریخ کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ قدیم عیسائیت ایک سیاسی یا معاشرتی نظام کی صورت میں وجود میں نہیں آئی تھی۔ وہ ایک ”نجس اور خبیث دنیا“ میں نظامِ خالفاہیت کی حیثیت سے وارد

ہوئی تھی۔ جس کا انسان کے عمرانی معاملات سے کوئی سرکار نہ تھا۔ ان معاملات میں وہ رومی اقتدار کے تابع تھی۔

بحرچ اینڈ سٹیٹ

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مملکت نے مذہب، سیاست اختیار کیا تو سٹیٹ

اور چرچ (کلیسا) ایک دوسرے کے حریف بن کر سامنے آئے اور ان

میں یہ لامتناہی نزاع پیدا ہو گئی کہ ایک کا دائرہ اثر و نفوذ کیا ہے اور دوسرے کے حدود اقتدار کون سے؟ اسلام میں

ایسی صورت حالات کبھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ اسلام شروع ہی سے ایک دوسرے نظام کی حیثیت سے

منفصل شہود پر آیا تھا جسے قرآن کریم نے لیے سیدھے سادے قانونی اصولوں کا ضابطہ عطا کر دیا تھا جس میں

رومیوں کے مشہور بارہ جدولوں کی طرح، اس امر کی صلاحیت تھی کہ وہ دہر زلزلے کے تغصنے کے مطابق نئی

نئی تعبیرات کی رو سے پھیلتا چلا جائے۔ چنانچہ بعد کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ قرآن نے جو قانونی اصول دیئے ہیں

ان میں فی الحقیقت ان وسعتوں کے امکانات موجود ہیں۔ لہذا ترکوں کی نیشنلسٹ پارٹی نے مملکت کے متعلق

جو نظریہ قائم کیا ہے وہ یکسر گمراہ کن ہے۔ اس لئے کہ وہ مذہب اور

قرآن کے قانونی اصول

سیاست میں اس ثنویت کے تصور پر مبنی ہے جس کا اسلام میں

کوئی وجود نہیں۔

اس کے برعکس، مذہبی اصلاحات کی پارٹی جس کے سرکردہ، سعید حکیم پاشا تھے۔ اس اصل الاصول پر

مصر تھی کہ اسلام، تصوریت (IDEALISM) اور مرئیت (POSITIVISM) روح اور

مادہ) کا حسین مرکب ہے۔ یعنی اس میں بلند آفاقی اصول حیات، مادی یکدوں میں عملی مشکل ہو جاتے ہیں۔

یہ حریت، مساوات اور سالمیت کی مستقل اقدار اور بادی صداقتوں کا مجموعہ ہے جسے وطنیت کی چار دیواری

میں محدود نہیں کیا جاسکتا، سعید حکیم پاشا، کے الفاظ میں ”جس طرح برطانوی بیاضیات، جرمن فلکیات

اور فرانسیسی کیمسٹری (کیمیا) کا تصور غلط ہے۔ اسی طرح ترکی، عربی، ایرانی یا ہندی اسلام کا تصور

وطنیت

بھی باطل ہے۔ (یعنی جو حقائق عالمگیر ہوں، وہ وطنی اضافتوں سے ایک دوسرے سے الگ

نہیں کئے جاسکتے) جس طرح سائنس کے حقائق کی عالمگیریت مختلف قوموں میں مختلف سائنٹیفک کلچر پیدا کر دیتی ہے

اور ان تمام کلچرز کا مجموعہ انسانی علم کہلاتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی عالمگیر اقدار، مختلف قوموں میں مختلف ملی، اخلاقی اور

معاشرتی تفصیل العین پیدا کر دیتی ہیں (خود غیر متبدل رہتی ہیں)۔ سعید حکیم پاشا نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ کلچر

جس کی بنیاد قومی انانیت پر ہے، وحشت و بربریت ہی کی دوسری شکل ہے۔

قومیت پرستی

یہ سب سے بڑے ہوئے نظام کارخانہ داری (INDUSTRIALISM) کی پیداوار ہے۔ جس کے ذریعے انسان اپنے جیلی اور حیوانی تقاضوں اور رہنمائی کی تسکین کر لیتا ہے۔ وہ (سعید حکیم پاشا) مناسف ہیں کہ ہماری تاریخ میں، اسلام کے اخلاقی اور معاشرتی اصول، مقامی اثرات اور جڑوں میں مسلمان ہوئیں ان کے، زمانہ قبل از اسلام کے توہم پرستانہ عقائد و مسالک کی وجہ سے، اہستہ اہستہ غیر اسلامی ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ اسلام کے یہ اصول، اسلامی کم اور ایرانی، ترک اور عربی زیادہ ہیں۔ اسلام کے عالمگیر اور غیر شخصی اخلاقی اصولوں پر مقامی اثرات کا کچھ ایسا رنگ چڑھ گیا ہے کہ اس کی اصلی شکل و صورت اب پہچانی ہی نہیں جاتی۔ حتیٰ کہ اصول توحید کی مقدس جہن پر اصنام پرستی تک کے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ اندریں حالات، ہمارے لئے کشادہ کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینہ اسلام پر غیر اسلامی رنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ بحیرہ جامد ہو کر رہ گیا ہے۔ انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے۔ اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سر نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیل جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

غرض، یہ ہیں ترکی کے جلیل القدر وزیر، سعید حکیم پاشا کے خیالات۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ایسے راتے پہ چلتے ہوئے جو روح اسلامی سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، یہ منفرکہ قریب قریب اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جو وہاں کی نیشنلسٹ پارٹی کا موقف ہے۔ یعنی اجتہاد کی آزادی تاکہ جدید فکر اور زمانہ کے تجربات کی روشنی میں قانون شریعت کو از سر نو مرتب کیا جائے۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے بتایا ہے کہ (مثلاً) اٹھائے خلافت کے مسئلہ پر ترکوں نے کس طرح اُن خطو پر اجتہاد سے کام لیا ہے جن کی طرح ابن خلدون اور قاضی ابوبکر باقلانی جیسے منفرکہ بہت پہلے ڈال چکے تھے۔ پھر انہوں نے ترکی کے مشہور انقلابی شاعر ضیاء کی بعض نظموں کے اقتباسات سے اس نقطہ کی وضاحت کی ہے کہ ترکی فکر کس طرح اپنے لئے نئی نئی راہیں تلاش رہی ہے۔ اس شاعر نے اپنے جوشِ تجدّد پسندی میں یہ بھی کہا ہے کہ اسلامی قانون وراثت کی رو سے عورت کو جو مرد سے نصف حصہ ملتا ہے، یہ اصول مساوات کے خلاف ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس کے اس خیال کی تردید آگے چل کر کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کا یہ اعتراض قرآن کے

قوانین وراثت سے بے خبری کی بناء پر ہے۔ ان تصریحات کے بعد، علامہ اقبال لکھتے ہیں :-

”حقیقت یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں ترکی ہی وہ قوم ہے جس نے تراثیت کے خواب گسٹوں سے بیدار ہو کر شعور و فاعل حاصل کیا ہے۔ یہی وہ قوم ہے جو بجا طور پر فکری آزادی کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ یہی ہے جو تصورات کی دنیا سے آگے بڑھ کر حقائق کی دنیا کی طرف آرہی ہے۔ اس عبوری دور سے گزرنے کے لئے ایک شدید ذہنی اور اخلاقی کشمکش ناگزیر تھی۔ اب، وسعت طلب اور حرکت پسند زندگی کی پییدگیاں اس کے سامنے نئے نئے مواقع پیش کریں گی۔ جن کے لئے نئے زاویوں سے سوچنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے (اسلام کے غیر متبدل) اصولوں کی جدید تعبیرات ہوں گی۔ یعنی ان اصولوں کی جدید تعبیرات جو ان لوگوں کے لئے جو روحانی کشادگی کی مسترتوں سے نا آشنا ہوں محض نظری حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ قول برطانوی مفکر ہارز کا ہے کہ اگر مسلسل اور متواتر ایک ہی قسم کے خیالات اور احساسات پیدا ہوں، تو سمجھ لیجئے کہ خیالات اور احساسات سرے سے پیدا ہی نہیں ہو سکتے (یعنی اگر قدرت فکر و احساس نہ ہے تو انسانی قلب دودغ مردہ ہو جاتے ہیں)۔

مسلم اقوام کی حالت

آج مسلم قوم کی اکثریت کی حالت ایسی ہو چکی ہے۔ وہ کسیر کے فقیر ہیں، جو محض ایک مشین کی طرح پرانی اقدار کی رٹ لگائے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس، ترک اس راستہ پر گامزن ہو گئے ہیں جس میں نئی نئی قدروں کی تخلیق ہوگی۔ یہ قوم ایسے تلخ تجارب سے گزر رہی ہے کہ اب اس کی عمیق خودی اس پر شکف ہو رہی ہے۔ اس کی ذات میں روح حیات منطرب و بے قرار نظر آرہی ہے۔ نئی آئینگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے سامنے ہے اور جو زوہد یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے۔ یہ ہے کہ اسلامی قوانین

شرعیت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیے۔ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمر و مرض کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمر و مرض جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے

دافعہ کہ اس جو شجہ پسندی میں جہاں جہاں ترکوں کا دامن قرآن سے چھوٹا ہے، نہ علامہ اقبال؟ اس کی تائید کرتے ہیں نہ طلوع اسلام جیسا کہ ہم مختلف مقامات پر کہہ چکے ہیں، نہ امر موجب بدستمی تھا کہ اس ذہنی انقلاب کے وقت ترکوں میں کوئی ایسا صاحب بعیرت نہ تھا جو قرآن کی روشنی میں ان کی راہ نمائی کر کے انہیں اعتدال کے راستے پر لے چلتا۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اپنی بعد کی تحریروں میں اس پر تنقید بھی کی ہے اور اظہار تاسف بھی۔

رسول اللہ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرات نصیب ہوئی کہ :-
 ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے ۔

ہم دنیاۓ اسلام میں اس قسم کی تحریک آزادی کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ آزاد خیالی کا یہ رجحان، اسلام کی تاریخ میں بڑا نازک لمحہ ہے۔ آزادی انکاد، ملت میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کا موجب

آزاد خیالی کا خطرہ

بھی بن سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی، عالم اسلام میں نسلی امتیاز کا جو تخیل آجکل اس زور شور سے ابھر رہا ہے اس سے یہ غدشہ ہے کہ کہیں عالمگیر انسانیت کا وہ گہرا مایہ تصور جسے مسلمانوں نے اپنے دین سے حاصل کیا تھا۔ ان کے آفتی ذہنی سے ناپید ہی نہ ہو جائے۔ نیز یہ خطرہ بھی ہے کہ اگر ان کی مناسب روک تھام نہ کی گئی تو ہمارے مذہبی اور سیاسی مسلمین وسیع الخیالی کے جوش میں اصلاح کی حدود سے تجاوز کر جائیں گے۔ ہم آجکل اسی قسم کے دور سے گزر رہے ہیں۔ جس سے یورپ، پراٹسٹنٹ تحریک کے زمانے میں گزرا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نو تھر کی تحریک کے آغاز و نتائج سے جو سبق ہمیں سیکھنا چاہئے وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ تاریخ کے عمیق مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پراٹسٹنٹ تحریک، دراصل ایک سیاسی تحریک تھی جس کا یونٹ پر یہ اثر ہوا کہ رفتہ رفتہ عیسائیت کے عالمگیر اخلاق کی جگہ، قومی نظام اخلاق نے لے لی۔ اس رجحان کے اثرات ہم نے گزشتہ جنگ عظیم پہلی عالمگیر جنگ، میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ اس جنگ نے بجائے اس کے کہ یہ دو متضاد نظام ہائے اخلاق میں ہم آہنگی پیدا کرتی، یورپ کے حالات کو اور بھی ناقابل برداشت بنا دیا۔ لہذا دنیاۓ اسلام کے رہنماؤں کا فریضہ ہے کہ یورپ میں جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور اسلام اپنے معاشرتی اور سیاسی نظام کی رُو سے جس نصب العین کی طرف لے جاتا ہے، اسے نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے، اصلاح حالات کے لئے قدم اٹھائیں۔

میں نے اجتہاد کی تاریخ اور جس طریق سے وہ آجکل عالم اسلام میں عمل پیرا ہو رہا ہے، اس کا ایک اجمالی سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب میں یہ بتاؤں گا کہ اسلامی قوانین شریعت کی تاریخ اور ہیئت

ہیں اس نتیجہ تک پہنچائی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی جدید تعبیر ممکن ہے یا اس نتیجہ پر کہ ان میں جدید تعبیرات

کا امکان نہیں؟ بالفاظ دیگر، سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے قوانین شرعیات میں ارتقاء کی صلاحیت ہے یا نہیں؟ یہی سوال، بولن

جدید تعبیرات کا امکان

یونیورسٹی کے اسٹنٹ سائبر کے پروفیسر، ہارٹن نے، اسلامی فلسفہ اور الہیات کے ضمن میں اٹھایا ہے۔ چنانچہ یہ پروفیسر، مسلم مفکرین کی ان کوششوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جو انہوں نے خالص مذہبی فکر کے سلسلہ میں کی ہیں، لکھتا ہے کہ تاریخ اسلام، اُردین علم و ثقافت اور سماجی مذہب کے متغائر قوتوں میں تدریجی تعامل، ہم آہنگی اور غمی پیدا کرنے سے عبارت ہے۔ مسلمان ہمیشہ اپنے مذہبی نقطہ نگاہ کو ان ثقافتی عناصر سے تطبیق دیتے رہے ہیں جو ان کے گرد و پیش کی اقوام سے ان کی طرف آتے رہے۔ چنانچہ مشرق سے لے کر مغرب تک مسلمانوں میں کم از کم ایک سو فقہی مکاتب پیدا ہوئے۔ یہ اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ اسلامی حکم میں کس قدر لچک ہے اور قدیم مفکرین نے اس باب میں کس قدر انتھک کوششیں کی ہیں۔ اس طرح اسلامی حکم اور مسلمانوں کے لٹریچر کے گہرے مطالعہ کے بعد، یہ مغربی مستشرق اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ:-

”اسلام کی روح (سپرٹ) وسیع ہی نہیں بلکہ قریب قریب لامحدود ہے۔ اس نے دہرت کو چھوڑ کر، اپنے گرد و پیش کی اقوام کے باقی تمام تصورات کو نہ صرف اپنا یا بلکہ انہیں اپنی مخصوص راہ نمائی میں شاہ راہ ترقی پر بھی ڈال دیا ہے۔“

اسلام کی یہ ”خدا ماضی“ کی سپرٹ قانون کے دائرہ میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ چنانچہ مشہور ولندیزی ناقد اسلام، پروفیسر برگدوچ، اس باب میں لکھتا ہے کہ:-

”جب ہم اسلامی فقہ کی نشو و ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف، ہر دور کے علماء چھوٹی چھوٹی جزئیات کے اختلاف سے مشغول ہو کر ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں اور دوسری طرف، وہی علماء اپنے متقدمین کے انہی اختلافات میں موافقت اور مطابقت پیدا کرنے کے لئے باہم گہرے متحد و ہم مقصد ہو کر کوشاں رہتے ہیں۔“

عصر حاضر کے ان مغربی ناقدین کے ان خیالات کی رو سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے

روح اسلام کی عالمگیریت

وقت روح اسلام کی اندرونی عالمگیریت، علماء کی شدید قدامت پرستی کے علی الرغم، کارفرما ہو کر رہے گی اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ اگر دورِ حاضر کے ناقدین، فقہ اسلامی سے متعلق کثیر لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو انہیں اپنا یہ سطحی خیال بدلنا پڑے گا کہ اسلامی قانون شریعت جامد اور ناقابل ارتقاء ہے۔ بدقسمتی سے، ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو وہ بہت سے لوگوں کے لئے ناگوار ہی کا باعث ہو جائے گی اور فرقہ وارانہ نزاعات چھڑ جائیں گے۔ بایں ہمہ، میں مسئلہ زیر نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی حیرت ضرور کروں گا۔

(۱) سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قرنِ اول سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک، مسلمانوں میں، قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہ تھا۔

(۲) یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ پہلی صدی ہجری کے وسط سے لے کر چوتھی صدی کے آغاز تک، مسلمانوں میں قریب انیس مکاتب فقہ پیدا ہو چکے تھے۔ صرف اس ایک بات سے پتہ چل سکتا ہے کہ ایک بڑھتی ہوئی تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے، ہمارے فقہاء نے کس قدر جدوجہد سے کام لیا تھا۔ جوں جوں اسلامی فتوحات کا سلسلہ بھیل گیا اور مسلمانوں کا دائرہ نظر وسیع ہوتا گیا۔ ہمارے ان قدیم فقہاء کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ ان اقوام کے احوال و ظروف اور عادات و اطوار کا مطالعہ کریں۔ جو صلہ نگوش اسلام ہوئی تھیں ادا اس طرح اپنے ماحول اور اس کے تقاضوں کا وسعت نظر سے جائزہ لیں۔ چنانچہ اگر اس زمانہ کی تمدنی اور سیاسی تاریخ کی روشنی میں مختلف مذاہب فقہ کا وقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجانی ہے کہ ہمارے فقہاء فقیر احکام کے سلسلہ میں رفتہ رفتہ استخراجی طریق (DEDUCTIVE) سے استقرائی طریق (INDUCTIVE) کی طرف آتے گئے۔

(۳) جب ہم شریعت اسلامی کے چار مسلمہ مآخذ (قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس) امدان سے پیدا شدہ

قانون شریعت کے مآخذ اربعہ

نزاعات پر غور کرتے ہیں تو ہمارے مذاہب فقہ کے جامد ہونے کا مفروضہ بالکل بے اصل و بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے اور فقہ میں مزید ارتقاء اور نشوونما کا امکان واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے۔
آئیے۔ اب ان چار مآخذ شریعت کے متعلق مختصر طور پر غور کریں۔

۱۔ قرآن

قرآن

اسلام میں قانون کا اصلی سرچشمہ قرآن ہے۔ لیکن قرآن، کوئی (تفصیلی) ضابطہ قانون نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اس کا بنیادی مقصد، انسان کے دل میں، خدا اور کائنات کے ساتھ اس کے تعلق کے بلند شعور کو بیدار کرنا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن میں بعض اصول و ضوابط قانونی نوعیت کے بھی موجود ہیں۔ بالخصوص انسان کی عائلی زندگی کے متعلق قواعد و ضوابط، جس پر اس کی معاشرتی زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ جس دجی کے پیش نظر انسان کی بلند ترین زندگی ہے، اس میں یہ معاشرتی قواعد و ضوابط دجی کا جزو کیوں بنا دیئے گئے، تو اس سوال کا جواب عیسائیت کی تاریخ میں ملے گا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ عیسائیت درحقیقت یہودیت کی آئین و رسوم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی زندگی کے خلاف رد عمل تھی۔ اس کے لئے اس نے انسان کے سامنے دنیا چھوڑ عاقبت سنوارنے کا نصب العین رکھا۔ اور اس میں اسے کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن اس نے اس طرح انفرادی زندگی کا جو تصور پیدا کر دیا اس سے اس نے سمجھ لیا کہ انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کو روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ (جرمن فلاسفر) لومبن اپنی کتاب BRIEFF UBER RELIGION میں لکھتا ہے کہ:-

”ابتدائی مسیحیت نے مملکت، قانون، معاشرہ اور پیدوار کے تحفظ کے مسائل کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس نے معاشرتی مسائل کو درخور اعتناء ہی نہیں سمجھا۔“

ان تصریحات کے بعد وہ آخر میں لکھتا ہے :-

”اب ہمارے لئے دو ہی صورتیں رہ گئی ہیں۔ یا تو ہم اس کا فیصلہ کر لیں کہ ہم بغیر کسی مملکت کے زندگی بسر کریں گے اور اس طرح اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فوضویت اور لاقانونیت کے گرداب میں ڈال دیں گے۔ اور یا ہم، اپنے مذہبی مسلک کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی مسلک کو بھی مقصد حیات بنالیں۔“

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضروری سمجھا ہے کہ مذہب و مملکت اور اخلاقیات و سیاسیات کو ایک ہی دجی کی لٹری میں پرو دیا جائے۔ جس طرح افلاطون نے اپنی کتاب ریپبلک (جمہوریت) میں انہیں یکجا رکھنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس سلسلہ میں خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل، قرآن کا حکم کیا ہی نقطہ نظر ہے۔ میں اس سے پہلے، اس کے آغاز اور تاریخ کے متعلق تفصیلی طور پر کہہ چکا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو کتاب اس نقطہ نگاہ کی حامل ہو، وہ ارتقاء کے تصور کے مخالف کبھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ زندگی صرف تغیر و تبدل ہی کا نام نہیں۔ اس کے اندر ایسے عناصر -----
(ELEMENTS OF CONSERVATION) بھی ہیں جو اپنی حالت پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ انسان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے تخلیقی کارناموں سے لذت اندوز ہوتا ہے اور اپنی توانائیوں کو زندگی کی نئی نئی شاہراہوں کے انکشاف پر مرکوز رکھتا ہے۔ لیکن ان تمام کامرانوں کے باوجود، اسے اپنی ذات کے انکشاف کے وقت کچھ تردد اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ اپنی ترقی اور پیش قدمی میں اپنے ماضی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اور اپنی ذات کی داخلی کشادگی سے اسے کچھ ڈر سا محسوس ہوتا ہے۔ وہ جب آگے بڑھتا ہے تو ایسی قوتیں جو اس سے متخالف سمت کی طرف جانی دکھائی دیتی ہیں، اس کی روح کے سامنے روک بن کر حائل ہو جاتی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ زندگی، اپنے ماضی کے پشتارے کو اپنی کمر پر لادے ہوئے آگے بڑھتی ہے اس لئے جب بھی معاشرہ میں کسی تبدیلی کا سوال سامنے آئے تو قدامت پسندی کی قوتوں کی قیمت اور جس انداز سے وہ عمل پیرا ہوتی ہیں اس کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ لہذا ہمارے ہاں کے معقولیت پسند طبقہ کو چاہئے کہ وہ جب معاشرہ کے مردوبہ رسوم و مناسک (INSTITUTIONS) میں اصلاح و تغیر کا خیال کرے تو قرآن کے اس اہم اصول کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے۔ دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی کو کبھی مسترد نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ ان کی ذات کا تشخص ان کے ماضی کی بناء پر ہوتا ہے۔

۱۔ اپنی ذات کے انکشاف و کشور کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی انفرادیت (INDIVIDUALITY) سے باخبر ہو جاتا ہے اور اس طرح اس پر حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ وہ کسی بڑے کل معاشرہ کا جزو نہیں بلکہ اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے جس کی نشوونما معاشرہ کے اندر ہوتی ہے وہ اپنے اس احساس انفرادیت سے گھبراتا ہے حالانکہ وہ اسے بتدریج تسلیم کر لیتا ہے تو چیز اطمینان کا موجب ہوتی چاہئے نہ کہ گھبراہٹ کا سبب۔ وہ اپنی انفرادیت میں معاشرہ سے کٹ نہیں جاتا بلکہ اس کا اہم رفیق بن جاتا ہے۔ لہذا اس کی یہ گھبراہٹ اس کی کوتاہ نگہی کی دلیل ہے۔

۲۔ ماضی سے وابستگی اور شے ہے اور ماضی کی پرستش اور چیز ماضی سے وابستگی کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے پاس اسلاف کا جو سرمایہ منقول ہو کر آئے ہم اس سے مستفید ہوں۔ لیکن ماضی پرستی کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس سرمایہ پر کبھی تنقید کا نگاہ نہ ڈالیں۔

پس اسلام جیسے معاشرہ میں، مروجہ شعائر و مناسک (INSTITUTIONS) میں تبدیلی کا سوال بہت نازک اور دشوار بن جاتا ہے جس سے ایک مصلح کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے اسلام، کسی خاص خطرہ زمین سے پاسبانہ نہیں۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ وہ مختلف نسلوں کے افراد کو ایمان کے ذریعے، ایک مرکز پر اکٹھا کرے اور پھر ان ذرات کو ایک ایسی مملکت میں منسلک کر دے جسے شعور ذات کی نعمت حاصل ہو۔ اس طرح یہ ملت، تمام دنیا کے لئے ایک نمونہ بنے گی یہ بتانے کے لئے کہ تمام نوع انسانی کس طرح ایک اُمت واحد بن سکتی ہے۔ یہ کام کچھ ایسا آسان اور سہل الحصول نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسلام اپنے عظیم المنظر شعائر و ارکان کے ذریعے، تضاد و مخالفت کے اس ہجوم (نوع انسانی) میں ایک اجتماعی عزم اور مجموعی ضمیر پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس قسم کے معاشرہ کے ارتقار میں (اور تواور) خور و نوش اور پاک پلید جیسے عام معاملات زندگی کے متعلق قوانین و ضوابط کا غیر متبدل ہونا بھی۔۔۔۔۔ ایک خاص معنی اور قدر و ارزش رکھتا ہے۔ اس لئے کہ جب مختلف طبائع اور متضاد اطوار کے افراد ان احکام کی پابندی سے اپنے اندر یکسانیت پیدا کر لیتے ہیں تو اس سے معاشرہ میں ایک خاص اندرونی یکانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز اس سے وہ داخلی اور خارجی وحدت اور ہم آہنگی قائم رہتی ہے جو ان قوتوں کا مقابلہ کرتی ہے جو اس قسم کے مختلف الاوضاع معاشرہ میں نشئت و انتشار پیدا کرنے کے لئے اندر ہی اندر سرگرم عمل رہتی ہیں۔ لہذا ان شعائر و مناسک پر تنقیدی نگاہ ڈالنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس معاشرتی تجربہ کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر لے جس کی تشکیل اسلام کرتا ہے۔ وہ ان شعائر و مناسک پر غور و فکر کرتے ہوئے یہ نہ دیکھے کہ ان سے فلاں ملک کو کیا کیا معاشرتی فوائد حاصل ہوں گے یا نقصانات پہنچیں گے، وہ ان کا جائزہ اس عظیم مقصد کی روشنی میں لے جو پوری کی پوری انسانیت میں رُو بکار ہوتا جا رہا ہے۔

آئیے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

۱۔ کسی فرد کو ان تبدیلیوں کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یہ تبدیلیاں عند الضرورت صرف اسلامی نظام ہی کر سکتا ہے۔

۲۔ جس شعائر و مناسک کا تعین خود قرآن نے کر دیا ہے ان پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تنقید سے مراد ان رسوم و مناسک پر تنقید ہے جو خارج از قرآن ہیں۔

سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہانے، قانون شرعی کے متعدد نظام دستم مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم ادعا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہین منت تھا۔ چنانچہ خان کرمیر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ :-

”دویوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس استعداد احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔“

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعا) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہاد مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیا کے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں فکر انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و مادیات کو کبھی قطعی کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرا سمجھا یا کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دور حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، ذہن کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصول اس کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرز عمل میرے خیال میں بالکل سجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے رہنمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے ترکی کے انقلاب پسند شاعر ضیاء کے ان سوالات کو لیا ہے کہ

طلاق و وراثت وغیرہ کے معاملات میں مردوں اور عورتوں کو مساوات حاصل ہونا چاہئے اور ان پر مدلل بحث کی ہے۔ اس کے بعد وہ قانون شریعت کے دوسرے سرچشمہ یعنی حدیث کی طرف آتے ہیں۔

۲۔ حدیث

اسلامی قانون شریعت کا دوسرا سرچشمہ حدیث نبویؐ ہے۔ احادیث، سابقہ زمانے میں بھی اور دورِ حاضر میں بھی کافی بحث و نزاع کا موضوع رہی ہیں۔ زمانہ حال کے نقادوں میں، گولڈزبرہ نے، جدید اصول تنقید کی روشنی میں ان کی کافی جانچ پڑتال کی ہے جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ ذخیرہ بہ نسبت مجموعی قابل اعتماد نہیں۔ ایک، دوسرا مغربی مصنف ان اصولوں کا جائزہ لینے کے بعد جن کے مطابق مسلمان ائمہ جرح و تعدیل نے احادیث کو پرکھا ہے کہتا ہے کہ نظریاتی طور پر ان میں غلطی کا امکان ہے۔ لیکن اس کے بعد لکھتا ہے کہ :-

”آخر میں میں کہوں گا کہ جن خیالات کا اظہار اُدپر کیا گیا ہے۔ ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان اصولوں میں غلطی کا امکان نظری طور پر موجود ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب کہ حدیث کو اس طرح پرکھنے میں فی الواقع کس حد تک غلطیاں سرزد ہوئیں، اس بات پر منحصر ہے کہ جن حالات میں احادیث کی جانچ پڑتال ہوئی وہ کہاں تک اس کی ترغیب دلاتے تھے کہ غلطی کے امکان سے قلمدہ اٹھالیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے حالات بہت کم تھے اور سن کے ذخیرہ کا بہت کم حصہ ان سے متاثر ہوا ہے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن احادیث کے مجموعوں کو مسلمان قانونی حیثیت دیتے ہیں، ان کا بڑا حصہ، اسلام کے آغاز اور اتمام کا صحیح ریکارڈ ہے۔“

لیکن مقصدِ زیرِ نظر کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان احادیث کو جن کی حیثیت قانونی ہے، ان احادیث سے جن کی قانونی حیثیت نہیں، الگ کر لیں۔ احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے **احادیث کی قانونی حیثیت** اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے

بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ نے علیٰ حالہ رکھا۔ اور بعض میں ترمیم فرمادی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استنباط فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ پیغمبرؐ نے طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں پیغمبرؐ کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہذا پیغمبرؐ کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالم گیر شریعت کے لئے بطور خیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائص کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کا کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انہیں آنے والی نسلوں پر اس وعظ و نصیحت سے کیا جاسکتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تعاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطہ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوین فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب بیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحبؒ

اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مفتن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو ان کا یہ طرز عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرز عمل کے ہم آہنگ ہو گا۔ جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقنین میں ہوتا ہے۔

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ محدثین نے قانون کے متعلق مجرد فکر و تخیل کے مقابلہ میں ٹھوس واقعات (CONCRETE CASES) کو زیادہ اہمیت دینے سے شرعی قانون کی بڑی خدمت سر انجام دی ہے۔ علاوہ بریں، اگر احادیث کے لٹریچر کے غائر مطالعہ سے اس روح (سپرٹ) کے سمجھنے کا کام لیا جائے۔ جن کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی کی تعبیر فرمائی تھی تو اس سے یہ بھی سمجھ میں آ جائیگا کہ قرآن نے قانون سازی کے لئے جو اصول دیئے ہیں، زندگی کے عملی میدان میں ان کی صحیح قدر و قیمت کیا ہے۔ اگر ان اصولوں کی حیاتی قدر (LIFE - VALUE) کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو اس سے، شرعی قانون سازی کے بنیادی اصولوں کی تعبیر نو میں بڑی مدد ملے گی۔ یہی ایک چیز ہے جو اس باب میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

۳۔ اجماع

قانون شریعت کا تیسرا سرچشمہ اجماع ہے جو میرے نزدیک اسلام میں سب سے اہم قانونی تصور ہے۔ لیکن یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ابتدائے اسلام میں اس اہم قانونی تصور کے متعلق نظری بحثیں تو اس قدر ہوئیں۔ لیکن یہ صرف خیال ہی خیال رہا اور مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی ایک مستقل عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔ اغلباً اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ چہارم کے بعد مسلمانوں میں جو ملکیت آگئی تو اس نے سمجھ لیا کہ اجماع کو ایک قانونی حیثیت دینے سے اس کے سیاسی مفاد پر زد پڑے گی۔ میرا خیال

۱۔ علامہ اقبالؒ نے اس پوری بحث میں اجماع سے مراد اسلام کا مشاورتی نظام یا ہے نہ کہ فقہ کا مصطلح "اجماع" اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اس بحث کو دیکھنا چاہیے۔

ہے کہ بنی اُستیہ اور عباسی خلفاء نے اپنا مفاد اسی میں سمجھا کہ بجائے اس کے کہ افراد ملت کے نمائندگان کی ایک مستقل مجلس مشاورت (اسمبلی) متشکل کی جائے، جس سے وہ اتنا اقتدار حاصل کر لے کہ اُن دسلاطین کے لئے دردمسز بن جائے، مجتہدین کو انفرادی اجتہاد کا حق دے دیا جائے۔ لیکن اب یہ دیکھ کر برطانی ڈھارس بندھتی ہے کہ زمانہ کے جدید تقاضوں اور اقوام مغرب کے سیاسی تجربے سے دور جانے کے مسلمانوں کو اجماع کی قدر و قیمت اور امکان کا احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان ممالک میں روح جمہور کی بیداری اور رفتہ رفتہ مجلس قانون ساز کی تشکیل ایک نیک فال اور ترقی کی جانب صحیح اقدام ہے۔ دور حاضر میں جبکہ اُمت میں متعدد جماعتیں اور پارٹیاں پیدا ہو چکی ہیں، اجماع کی ممکن شکل یہ ہے کہ مذاہب فقہ کے انفرادی نمائندگان سے حق اجتہاد چھین کر، اُسے مسلمانوں کی مجلس قانون ساز کو تفویض کر دیا جائے۔ اس سے، دیگر مفاد کے علاوہ، ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ قانونی مباحث میں وہ غیر فنی ارباب بصیرت بھی حصہ لے سکیں گے جنہیں فنی نکات افرینیوں کے مقابلہ میں، معاملات کی (عملی) سمجھ بوجھ کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظام قانون کو جمود و تعطل کے پنجے سے سجاتا دلا کر اس میں خون زندگی دوڑا سکتے اور اسے پھر سے ایک ارتقائی انداز نظر عطا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس طریق کار کے اختیار کرنے میں، ہندوستان میں دشواریاں پیدا ہونگی۔ اس لئے کہ یہ امر مشتبہ ہے کہ ایک غیر مسلم اسمبلی کو اجتہاد کا اختیار دیا جاسکتا ہے

اجماع کی صحیح شکل

اجماع کے ضمن میں ایک دو سوال اور بھی پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دیا جانا ضروری ہے، مثلاً یہ کہ کیا اجماع اُمت (جمہور کا فیصلہ) قرآنی احکام کو منسوخ کر سکتا ہے؟ مسلمانوں کے مجمع میں اس سوال کا اٹھانا یکسر غیر ضروری ہے۔ (کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس حقیقت سے باخبر ہے کہ قرآنی احکام کو کوئی بھی منسوخ نہیں کر سکتا) لیکن مجھے اس سوال کو اس لئے سامنے لانا پڑا ہے کہ

قرآن اور اجماع

(MOHAMMEDAN THEORIES OF FINANCE) کے سامنے لانا پڑا ہے کہ مغربی مصنف نے اپنی اس کتاب میں برطانی گمراہ کن بات لکھ دی ہے۔ اس نے بغیر کسی حوالہ اور سند کے لکھ دیا ہے کہ بعض حنفی اور معتزلہ مصنفین کے نزدیک اجماع، قرآن کو منسوخ کر سکتا ہے۔ سارے اسلامی

ص - تشکیل پاکستان کے بعد یہ دشواری خود بخود دور ہو گئی تھی۔

لڑ پھر میں اس بات کے جواز و نایید میں کوئی چیز نہیں ملتی۔ (اجماع اُمت تو ایک طرف، قرآن کو تو رسول اللہ کی کوئی حدیث بھی منسوخ نہیں کر سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اس مغربی مصنف کو جس بات نے مغالطہ میں ڈالا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے متقدمین نے اپنی تحریروں میں نسخ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ امام ساجی نے المواقعات (جلد سوم، صفحہ ۶۵) میں لکھا ہے، صحابہؓ کے اجماع کے سلسلہ میں جب نسخ کا لفظ آئے تو اس سے مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے قرآن کے فلاں حکم کو فلاں حد تک نافذ کیا یا اسے فلاں دائرہ تک محدود رکھا (یعنی احکام قرآنی کی تعقید و تعمیم)۔ اس سے ہرگز یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر دیا یا اس کی جگہ کوئی دوسرا حکم نافذ کر دیا۔ اس تحدید و توسیع کے سلسلہ میں بھی بقول آمدی نظریہ قانون یہ ہے کہ صحابہؓ کے پاس اس کے لئے کوئی نہ کوئی حکم شریعت ضرور ہوگا۔ (آمدی، شافعی) امام فقہ میں جن کی وفات ساتویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی اور حال ہی میں مصر سے ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

صحابہؓ کے فیصلوں کی حیثیت

لیکن فرض کیجئے کہ کسی معاملہ میں صحابہؓ نے بالاتفاق ایک فیصلہ کیا تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آنے والی نسلیں بھی اس فیصلہ کی پابند رہیں گی؟ امام شوکانی نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مختلف مذاہب فقہ کے ائمہ کی آراء بھی نقل کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس باب میں ضروری ہے کہ ان امور میں جن کا تعلق واقعات (FACTS) سے ہے اور ان میں جن کا تعلق قانون سے ہے۔ فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جن امور کا تعلق (عہد رسالت یا زمانہ صحابہؓ کے) واقعات و حوادث سے ہے، ان میں صحابہؓ کا فیصلہ قول فیصل ہوگا۔ اس لئے کہ اس زمانے کے واقعات کا علم صحابہؓ سے زیادہ اور کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر اس واقعہ کو لیجئے جس میں یہ سوال اٹھا کہ کیا قرآن کی وہ صورتیں جنہیں معوذتین کہا جاتا ہے، قرآن کا حصہ ہیں یا نہیں اور صحابہؓ نے متفقہ طور پر ان کو قرآن کا حصہ قرار دیا تھا۔ یا قسط کے زمانے میں ان لوگوں کو چوری کی سزا نہیں دی تھی جنہوں نے بھوک کی وجہ سے غلہ کی چوری کی تھی۔

یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ صحابہؓ کے پاس ”حکم شرعی“ ہونے سے کیا مراد ہے۔ انہوں نے قرآن کی تعلیم سے ایسا استنباط کیا ہوگا۔ اور ایسا استنباط ہو سکتا ہے۔ ان کا ایسا فیصلہ (جو قرآن کے اصولوں کے اندر ہو) خود حکم شرعی کی حیثیت رکھتا تھا۔

ظور فیصلہ کیا کہ یہ قرآن کا جزو ہیں۔ لیکن جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جن کی حیثیت قانونی ہے، ان کی بابت میری ناچیز رائے یہ ہے کہ بعد میں آنے والی نسلیں صحابہؓ کے فیصلوں کی پابند نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس میں سوال (قرآن کے کسی اصولی حکم کی) تعبیر کا ہے۔ چنانچہ امام کرخی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”سنت صحابہؓ صرف ان معاملات میں واجب الاتباع ہے جن کا فیصلہ قیاس سے نہیں کیا جاسکتا۔ جن معاملات کا فیصلہ (اجتہاد) قیاس سے کیا جاسکتا ہے ان میں ان کی سنت کی تقلید لازم نہیں۔“

اس ضمن میں ایک اور سوال پوچھا جاسکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بحالات موجودہ مسلمانوں کی جو مجالس قوانین ساز بنائی جائیں گی ان میں لامحالہ ایسے لوگ آجائیں گے جو قانون شریعت کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجالس سے قانون شریعت کی تعبیرت میں غلطیاں سرزد ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی غلطیوں کے سبب باب، یا ان

ہماری مجالس قانون ساز

کے مواقع کو کم کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ (اس سلسلہ میں) ایران نے اپنے سنہ ۱۹۰۶ء کے دستور مملکت کی رو سے، ایسے علماء کی ”جو امور دنیا سے باخبر ہوں“ ایک کمیٹی مقرر کی تھی تاکہ وہ مجلس قانون ساز کے کام کی نگرانی کرے۔ یہ تدبیر بڑی خطرناک تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے ایران کے نظریہ دستور کے حالات خصوصی کے پیش نظر اختیار کیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ ان کا نظریہ دستور یہ ہے کہ مملکت و حقیقت امام غائب کی ملک ہے اور بادشاہ صرف اس کا محافظ ہے۔ علمائے مذہب، بحیثیت نمائندگان امام غائب اپنا حق سمجھتے ہیں کہ وہ ملت کی زندگی کے ہر گوشے کے محاسب و نگران ہوں۔ اگرچہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب امام غائب کی جانشینی کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو ان علماء کے حق نیابت کو کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ بہر حال ایران کا نظریہ دستور کچھ ہی ہو، یہ تدبیر خطرات سے خالی نہیں ہے۔ اگر کوئی سنی مملکت اس تدبیر کو آزمائشی طور پر اختیار کرنا چاہے، تو وہ اسے عارضی طور پر آزما کر دیکھ لے۔ وہ بھی اس طرح کہ علماء کو

۱۔ ہمارے نو مسلم مصنف اسد کیو پولڈ نے اپنے مسودہ دستور پاکستان میں اس قسم کی مجلس علماء کی تجویز پیش کی تھی جس کی طلوع اسلام نے مخالفت کی تھی۔ نیز پہلی مجلس دستور ساز کی کمیٹی نے بھی کچھ اس قسم کی تجویز کی تھی جو منظور نہیں کی گئی تھی بعد کے دساتیر پاکستان میں اس قسم کی کوئی شق نہیں رکھی گئی۔

مجلس قانون ساز کارکن بنادیا جائے تاکہ وہ قوانین شریعت پر آزادانہ بحث و تمحیص میں دوسروں کی معاونت اور راہنمائی کریں۔ احکام شریعت میں غلطیوں کے سدباب کا مؤثر طریقہ ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان ملک میں قانونی تعلیم کے موجودہ طریق میں ایسی اصلاح کی جائے جس سے اس کا دائرہ وسیع ہو جائے اور جدید اصول قانون سازی کو طلباء کے درس کا لازمی جزو قرار دیا جائے۔

۴. قیاس

فقہ کا چوتھا بنیادی مأخذ قیاس ہے۔ یعنی کسی ایک حکم یا فیصلہ کو، عقل و بصیرت کی رُو سے، اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔ (مہدی رسالت مآب کے بعد) جو ممالک اسلامی فتوحات کے دائرے میں آئے۔ ان میں معاشرتی اور زرعی حالات، عربوں سے، بالکل مختلف تھے۔ ان معاملات کی نزاعات کے تصفیہ کے لئے، اُن نظام سے کچھ مدد نہیں مل سکتی تھی جو احادیث کے مجموعوں میں مندرج تھے۔ اس دشواری کے پیش نظر، مذہب حنفی کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ تھا کہ وہ قانونی تعبیرات میں قیاس اور رائے سے کام لیں۔ عراق میں جو نئے حالات سامنے آئے ان کے پیش نظر انہوں نے یہ خیال کیا کہ اگر قانون سازی میں ارسطوی منطق سے کام لیا جائے تو کامیابی ہو سکتی ہے۔ لیکن قانون شریعت کی تدوین کے ابتدائی مراحل میں یہ طریق کار بہت نقصان دساں تھا۔ ارسطوی منطق کے معنی یہ ہیں کہ عام اصولوں سے، ایسے قواعد و ضوابط مستنبط کئے جائیں جن میں کہیں لوج اور لچک نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ طرق و اعمال حیات کچھ ایسے پیچیدہ واقع ہوئے ہیں کہ اسے اس قسم کے سخت قواعد و ضوابط کے شکنجے میں کسا نہیں جاسکتا۔ لیکن اگر زندگی کو ارسطوی منطق کی عینک سے دیکھا جائے تو وہ ایک مشین محض دکھائی دیتی ہے جس میں کوئی داخلی اصول حرکت کارفرما نہیں۔ مذہب حنفیہ کے ائمہ نے حیات کی تخلیقی آزادی اور خود ارادگی کو نظر انداز کر دیا۔ اس سے انہیں اُمید بندھتی تھی کہ خالص منطق کی بنیادوں پر ایک مکمل ضابطہ قوانین کی تشکیل کی جاسکے گی۔ یہ طریق کار فقہائے حجاز کے فطری میلان کے خلاف تھا (عربی فطرت اس قسم کی حادویا لیس جھڑپ بندیوں کو قبول ہی نہیں کر سکتی تھی)۔ چنانچہ انہوں نے فقہائے عراق کی اس قسم کی قانونی موٹگیابیوں کے، اور ان کے اس رجحان کے خلاف کہ محض قیاسی اور فرضی مقدمات کو سامنے

رکھ کر، قانون بناتے چلے جائیں، صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ سمجھتے تھے اور بجاطور سمجھتے تھے کہ اس طرح اسلام کا قانون ایک بے جان مشین ہو کر رہ جائے گا۔ ان آئمہ فقہ کی اس قسم کی باہمی نزاعات سے یہ مجلس چھڑ گئیں کہ قیاس کے حدود کیا ہیں۔ کن حالات میں قیاس جائز ہے۔ غلط قیاس کی تصحیح کس طرح کی جاسکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان بحثوں کی ضرورت اس لئے بھی لاحق ہو گئی کہ شرع میں قیاس کے متعلق صرف اتنا ہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک مجتہد کی ذاتی رائے کا نام ہے۔ لیکن آخر الامر یہی چیز قانون اسلام میں سرچشمہ حیات و عمل بن گئی۔ آریائی ذہنیت و رجحان طبع یہ ہے کہ انسان تصورات کی خیالی دنیا میں مگن رہے اور واقعات و ممکنات کی دنیا سے کم دلچسپی لے۔ یہ ذہنیت زندگی کے عملی مسائل کے مقابلہ میں نظری مسائل کے متعلق بحث و تحقیق سے زیادہ لذت اندوز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، سامی رجحان طبع دنیا سے واقعات سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے اور تصورات کی بجائے ٹھوس حقائق پر قابو پانا چاہتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے اس مسلک پر کہ قیاس، قانون کا ماتخذ ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی کڑی تنقید، آریائی ذہنیت پر سامی احتساب ہے۔ بالفاظ دیگر، یہ ایک نزاع تھی قانون کی تحقیق میں، استقرائی اور استخراجی اسلوب کے حامیوں کے درمیان شرع میں، فقہائے عراق، تصورات کی ابدیت پر زیادہ زور دیتے رہے۔ ان کے برعکس حجاز کے فقہاء نے اس کے زمانی 'TEMPORAL' پہلو پر زور دیا لیکن انہوں نے اپنی پوزیشن کی اہمیت کا کماحقہ احساس نہ کیا۔ وہ چونکہ حجاز کے رہنے والے تھے اس لئے طبعی طور پر وہ حجاز کے قانونی راویات کے طرفدار ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہد رسالت مآبؐ اور عہد صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شرع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا۔ اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اسی قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے

۱۔ امام ابوحنیفہؒ کا تعلق آریہ نسل سے تھا اور امام مالکؒ اور شافعیؒ سامی النسل تھے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس میں

افراد متعلقہ کے ذاتی رجحان کے بجائے حالات کے تقاضے زیادہ ذمہ دار تھے۔ جیسا کہ خود علامہؒ نے آگے چل کر بیان

کیا ہے۔

شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہب حنفیہ کے لئے (ایک اوزنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصول قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتب فقہ جس نے ان مباحث کے تناظر کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا۔ اپنے خاص الخاص اصول فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذہب فقہ و شریعہ کے مقابلے میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح، امام ابوحنیفہؒ کے ناقدین نے، ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہد رسالت مآب اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

اس مکتب فقہ کا خاص الخاص اصول۔ قیاس۔ بشرطیکہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ امام شافعیؒ کے الفاظ میں اجتہاد وہی کا دوسرا نام ہے جس سے وحی کی چار دیواری کے اندر، پوری پوری آزادی سے کام لیا جاسکتا ہے۔ ایک اصول قانون کی حیثیت سے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ۔ جیسا کہ بعض علماء بالخصوص قاضی شوکانیؒ نے لکھا ہے، خود نبی اکرمؐ کی زندگی میں بھی اس کی اجازت تھی۔ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افری ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی، اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود و تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افری" کو بے قرار رکھا ہے تو وہ ان کا ذاتی فعل ہے۔ دور حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) مندر کے دیاتھا، یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں :-

”اگر اس افری کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے حقیقت

یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو معتدین کے پاس

نہ تھا۔)

مجھے اُمید ہے کہ ان مختصر تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ہمارے نظام قانون کے نہ اساسی اصولوں میں اور نہ ہی ان کے اوپر اُٹھی ہوئی موجودہ عمارت میں کوئی چیز ایسی ہے جو ہمارے موجودہ طرزِ عمل کے لئے وجہِ جواز بن سکے (جس کے مطابق سمجھا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین شریعت ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں) بنا بریں دنیاۓ اسلام کو چاہئے کہ وہ جرأت و بسالت سے کام لے اور حکمرانی

جرأت کی ضرورت ہے

اور تجرباتِ جدید کی روشنی میں نظام شریعت کی تشکیل نو کے اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اس سلسلہ میں اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تشکیلِ جدید کے معنی صرف اسی قدر نہیں کہ زمانہ کے موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کر لی جائے۔ اس کا ایک گوشہ اس سے بھی زیادہ اہم اور نازک ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم (پہلی جنگِ عظیم) اپنے پیچھے دو اہم اثرات چھوڑ گئی ہے۔ ایک تو ترکی کی بیداری - جس کے متعلق ایک فرانسیسی مصنف نے کہا ہے کہ وہ دنیاۓ اسلام میں ثبات و استحکام کا عنصر ہے - اور دوسرے وہ معاشی تجربہ جو مسلم ایشیا کے پہلو (روس) میں ہو رہا ہے۔ یہ وہ کوائف ہیں جن سے ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہئے کہ اسلام کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ اور وہ انسانیت کو کس منزل کی طرف لے جانا چاہئے۔ آج عالمِ انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے -

۱) کائنات کی روحانی تعبیر

۲) فرد کی روحانی آزادی اور

عالمِ انسانیت کے تقاضے

۳) عالمگیر اصول اساسی جو انسانیت کو روحانی بنیادوں پر نشو و نما دے کے راستے پر ڈال دیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جدید یورپ نے ان بنیادوں پر چند تصوراتی نظام قائم کئے ہیں۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جن صدائوں کو محض عقل کی رُو سے دریافت کیا جاتا ہے ان سے (قلبِ انسانیت میں) زندہ و پائندہ ایمان کا وہ شعلہ کبھی بیدار نہیں ہوتا جو حقیقی نبوت کی رُو سے ظہور میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محض عقل لوگوں کو بہت کم متاثر کر سکی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مذہب نے ہمیشہ افراد کو کبھی بلندیاں عطا کی ہیں اور پورے کے پورے

معاشرے میں بھی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یورپ کی تصویریت (جسے اس نے خالص عقل کی رُو سے قائم کیا ہے) اس کی زندگی میں کبھی ایک زندہ عنصر نہیں بن سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں ایک بدنہاد اور مسح شدہ انسانیت (PERVERTED EGO) ان جمہوریتوں کے پیکیج میں نمودار ہو گئی ہے جو باہمہمہ متصادم ہیں اور جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ دولت مندوں کی عیش سامانیوں کی خاطر غریبوں کو لوٹا کھسٹا جائے۔ یقین مانئے! انسانیت کی اخلاقی ترقی کے راستے میں آج سب سے بڑی رکاوٹ یورپ ہے۔ اس کے برعکس، مسلمانوں کے پاس وحی کے تصدیق، وہ بنیادی تصورات موجود ہیں (جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جن کی آج انسانیت کو اس قدر ضرورت ہے) وحی کا سرچشمہ اعمالِ حیات ہے۔ اس کے حروف و الفاظ کے لباس میں اس کی اہم حقیقتیں منور ہیں۔ اس میں الفاظ و معانی میں وہی اختلاط ہے۔

جس طرح انگھر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

زندگی کی روحانی بنیاد مسلمان کا ایمان ہے۔ ایسا ایمان جس کی خاطر ہم میں سے کم سے کم بڑھا کھٹا آدمی بھی بلا تود تامل، اپنی جان تک دے دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہم دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہتے ہیں پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرے کی تشکیل جدید کرے۔ اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل وغایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

ختم شد

(ختم)

لے یعنی ہم صرف ان غیر متبدل اصولوں کے پابند ہیں جو خدا نے انہی بار قرآن میں متعین کر دیتے ہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہم ہر طرح سے آزاد ہیں کہ زندگی کے نئے تعاضوں کے مطابق اپنے معاشرہ میں مناسب تغیر و تبدل کرتے رہیں۔ نیز ان معنوں میں آزاد کہ اب کوئی شخص ہم سے آگے نہیں کہے گا کہ خدا نے میری معرفت تمہارے لئے یہ احکام بھیجے ہیں تم ان کی اطاعت کرو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بتقریب یوم اقبال

پریل ۱۹۸۰ء

اقبال اور کمونزم

ہمارے ہاں چونکہ نہ تحریک پاکستان کی کوئی مستند تاریخ ہے۔ نہ قائد اعظمؒ یا علامہ اقبالؒ کے قابل اعتناء سوانح حیات، اس لئے فتنہ گردوں کے لئے، الزام تراشیوں اور تہمت بافیوں کی فضا بڑی سازگار ہے۔ کبھی کہہ دیا جاتا ہے کہ تقسیم ہند کی اسکیم دراصل انگریز کی تخلیق تھی اور قائد اعظمؒ برطانیہ کے آلہ کار تھے۔ کبھی آواز اٹھتی ہے کہ قائد اعظمؒ پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے (اور اب تو غیر سے ایک بزرگوار نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی شائع کر دی ہے۔۔۔ یا اللعجب) دوسری طرف، علامہ اقبالؒ کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلائی جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہو گیا آواز اٹھی کہ اقبالؒ کمیونسٹ تھا۔ طلوع اسلام نے اس کی بھرپور تردید کی تو یہ چنگاری خاموش ہو گئی لیکن معلوم ہوا کہ یہ دب گئی تھی، ابھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ اب جو حادثہ افغانستان کے سلسلہ میں کمیونسٹوں نے کر دیا ہے تو یہی فتنہ پھر بیدار کیا جا رہا ہے۔ یعنی یہ افواہ پھیلائی جا رہی ہے کہ اقبالؒ کمیونسٹ تھا۔ علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے تو اس الزام کی تردید خود فرما دیتے۔ لیکن اب اس فریفتہ کی ادائیگی طلوع اسلام کے ذمہ ہے جو فکر اقبالؒ کا پیغامبر ہے۔ ان سطور کا محرک بھی جذبہ ہے۔ اقبالؒ کو کمیونسٹ کہنا ایسا ہی ہے نیسے کوئی یہ کہہ دے کہ اقبالؒ درحقیقت ہندو تھا اور اس کا۔۔۔ اصلی نام اقبالؒ چند تھا! دیے کسی کو کمیونسٹ کہہ دینا آسان بھی بڑا ہے۔ جہاں کسی نے کہا کہ ملک میں کوئی بھوکا نہیں رہنا چاہئے۔ مشہور کر دیا کہ وہ کمیونسٹ ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ خود طلوع اسلام کے خلاف بھی یہ فتویٰ صادر کیا گیا کہ یہ کمیونسٹ ہے کیونکہ یہ کہتا ہے کہ قرآن کریم نظام سرمایہ داری کے خلاف ہے۔ برہنہ بالبرہنہ بات اقبالؒ اور کمونزم کی ہو رہی ہے اس لئے ہم اپنے رشتہات قلم کو یہیں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

ہم متعدد بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ کمونزم (یا اس کا قدم اول، سوشلزم) ایک معاشی نظام ہی نہیں بلکہ ایک فلسفہ زندگی اور نظریہ حیات ہے۔ جس کی بنیادوں پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

اس کا فلسفہ حیات، اسلام کے نظریہ زندگی کی ضد ہے۔ اسی طرح جیسے دہریت اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کمیونسٹ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے فلسفہ حیات کو تسلیم کیا جائے، اور اسے تسلیم کرنے کے بعد اسلام کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ یہ وجہ ہے کہ جو ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں کہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی مسلمان کمیونسٹ یعنی کوئی شخص بیک وقت مسلمان اور کمیونسٹ نہیں ہو سکتا۔ جو ایسا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مسلمان بھی ہے اور کمیونسٹ بھی، وہ جاہل ہے یا منافق۔

البتہ جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے وہ قرآن حکیم کے معاشی نظام سے ایک حد تک ملتا جلتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ جس حد تک کمیونزم یا سوشلزم جاسکی ہے، قرآن اس سے کہیں آگے جاتا ہے۔۔۔۔۔ (پرویز صاحب کے ایک خطاب کا عنوان ہی یہ تھا۔ جہاں مارکس ناکام رہ گیا، اس سے آگے!) یہ ہے ان دونوں نظاموں میں وہ جزوی مماثلت جس سے سطح میں مسلمان دھوکا کھا جاتے ہیں اور اسلام اور کمیونزم کو ایک دوسرے کا حلیف سمجھنے لگتے ہیں۔ یا جس سے فائدہ اٹھا کر، کمیونسٹ، مسلمانوں کو دھوکا دینے میں (بعض اوقات) کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ اقبالؒ کو کمیونسٹ ثابت کرنے میں اس حربہ سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ جس طرح اسلام کے معاشی نظام کو اس کے فلسفہ حیات سے الگ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح کمیونزم (یا سوشلزم) کے معاشی نظام کو اس کے نظریہ زندگی سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح مسلمان ہونے کے لئے سب سے پہلے، اسلام کے فلسفہ حیات پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح کمیونسٹ ہونے کے لئے کمیونزم کے نظریہ زندگی کا ماننا لازمی ہے اور جس طرح کوئی شخص محض اسلام کے معاشی نظام کو، صحیح سمجھ کر مسلمان نہیں ہو سکتا اسی طرح کوئی شخص، محض کمیونزم کے معاشی نظام کو تسلیم کرنے سے کمیونسٹ نہیں کہلا سکتا۔ اسلام اور کمیونزم دونوں میں، ان کے معاشی نظام کو ان کے فلسفہ حیات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا کمیونزم کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اس کے فلسفہ حیات کا سمجھنا ضروری ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، کمیونزم کا بانی کارل مارکس تھا۔ وہ محض ایک ماہر معاشیات نہیں تھا، اس کا شمار فلاسفر کے زمرہ میں بھی ہوتا ہے۔ اس نے بنیادی طور پر ایک فلسفہ پیش کیا تھا اور پھر، اس فلسفہ کی بنیادوں پر ایک معاشی نظام کا نقشہ دیا تھا جس کی ابتدائی شکل سوشلزم اور انتہائی کمیونزم ہے۔ لہذا، کمیونزم یا سوشلزم

سے مراد ہے مارکس کا پیش کردہ فلسفہ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام۔ مارکس کے فلسفہ حیات کی دوسری انسان کی زندگی بس یہی طبعی زندگی ہے اور اس سے متعلق مسائل مادی۔ اس تصور حیات کے مطابق، نہ خدا کا وجود باقی رہتا ہے نہ وحی کا وجود باقی رہتا ہے تو نہ جنت کا تصور باقی رہتا ہے، نہ اس کی وساطت سے عطا کردہ مستقل اقدار کا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد، حیات اخروی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے (مسئلہ زیر نظر کی حد تک) مارکس کے فلسفہ حیات کا ملخص۔

جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے۔ مارکس کے نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ :-

۱۔ نظام سرمایہ داری کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کی جگہ ایک ایسا نظام لے گا جو اس نظام (سرمایہ داری) کی ضد ہوگا۔

۲۔ اس (جدید) نظام میں، ذرائع پیداوار، افراد کی ذاتی ملکیت کے بجائے، محنت کشوں کی مشترکہ ملکیت (یا تحویل) میں رہیں گے۔

۳۔ فاضلہ دولت، جو نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے، کسی کے پاس نہیں رہے گی۔

۴۔ جب فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہے گی تو دولت کی بنیاد پر، دوسروں کی محنت کو غضب کر کے، مزید دولت کمائے گا سوال باقی نہیں رہے گا۔ نہ ذاتی جائیدادیں کھڑکی کی جاسکیں گی۔ نہ انفرادی کارخانے لگائے جاسکیں گے، نہ سودی کاروبار ہو سکے گا، نہ یہ صورت پیدا ہو سکے گی کہ :-

اُتے بر اُتے دیگر چروا

دانہ این می کارداں حاصل بردا

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ مارکس کے پیش کردہ فلسفہ حیات کا کبھی مؤید نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا فلسفہ حیات اور مادی فلسفہ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اب رہا معاشی نظام۔ سو اگر اسلام کا مفہوم غیر متغیث رکھا جائے تو پھر مارکسی نظام، خلاف اسلام بھی ہو سکتا ہے اور مطابق اسلام بھی۔ لیکن اگر اس کے مفہوم کے لئے قرآن کریم کو حرف آخر قرار دے لیا جائے تو اس حقیقت کے اثبات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قرآن کریم نظام سرمایہ داری کا سخت دشمن ہے اور اشتراکی نظام کسی مذہب قرآن کے معاشی نظام کے ماثل ہے۔

آئیے، ہم دیکھیں کہ اقبالؒ اس باب میں کیا کہتا ہے ؟

اقبال کا قلب درد آگیاں

اقبالؒ نے اپنے سینے میں ایک درد آگیاں قلب پایا تھا جو مفلسوں اور ناداروں، غنت کشوں اور مزدوروں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بن کر اس کے جسم گریباں سے ٹپک پڑتا تھا۔ ان کی سب سے پہلی (شرکی) کتاب ”علم الاقصا“ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سبیل رواں ہیں، اصول مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چکے سے اس کے ظاہری و باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے بجلا آئینہ کو اس قدر رنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلم اول، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے، مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلتی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مذہب قویٰ محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوت مدارج، بجائے اس کے کہ قیام تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہے، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مغربی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مغربی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چکے چکے کر اپنے والوں کی دلخاش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک درد مند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحہ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔

یہ ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ غور کیجئے کہ اتنی سی عمر میں، اقبالؒ کے دل میں کس قسم کے سوالات ابھر رہے تھے۔ یہ سوالات کہ

- ۱۔ آیا مغربی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ اور
- ۲۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چکے چکے کر اپنے والوں کی دلخاش صدائیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

خاموش ہو جائیں اور ایک دو منڈل کو ہلا دینے والا نظارہ ہمیشہ کے لئے صغیر عالم سے حرفِ غلط کی طرح

مٹ جائے

ان سوالات میں ہمیشہ کے لئے " کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ اقبالؒ کی باقی زندگی (مجموعہ دیگر امور) انہی سوالات کے اطمینان بخش جواب کی تلاش میں گزری۔ ظاہر ہے کہ ان کا جواب ہمارے مروجہ مذہب کے معاشی نظام سے نہیں مل سکتا تھا، جس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ نظمِ عالم کے لئے مفلسی ایک جزو لازم ہے۔ کیونکہ اگر مفلسی نہ رہے تو دولت مند لوگ صدقہ و خیرات دے کر ثواب کیسے حاصل کر سکیں گے، اور مفلسی سے کراہنے والوں کی دلخراش صدقہ ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں ہونی چاہئیں، کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو صدقہ و خیرات سے متعلق احکام شریعت معطل ہو کر رہ جائیں گے۔

لیکن اقبالؒ نے ان سوالات کا جواب قرآن حکیم کے عالم گیر ابدی ضابطہ حیات سے پالیا اور انہی جوابات کو وہ اُمت اور عالم گیر انسانیت کے سامنے پیش کرتے رہے۔ سب سے پہلے انہیں قرآن کی دقتیں سے یہ جواب ملا کہ مفلسی اور ناداری کا بنیادی سبب، نظامِ سرمایہ داری ہے۔ اور جب تک اس نظام کی جڑیں نہیں کٹتیں، کراہنے

اقبالؒ اور نظامِ سرمایہ داری

والوں کی دلخراش صدائیں خاموش نہیں ہو سکتیں۔ ان صداؤں کا علاج، محتاجوں اور مفلسوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈال دینے میں نہیں، ان کا علاج، اس نظام کو بدل دینے میں ہے جو انہیں مفلس اور محتاج بنا رہا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر، اقبالؒ نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اپنی مشہور نظم "خضر راہ" میں ————— جو ۱۹۲۲ء (۹) میں کہی گئی تھی ————— خضر سے سوال کرتے ہیں کہ

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے

اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خردش؟

اور خضر کی زبانی اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ:۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے!

خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کا ناست

اے کو تھک کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گم شاہخ آہو پر رہی صدیوں تک تیری برات
مکہ کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اسی زمانہ میں، ان کا فارسی مجموعہ کلام، پیام مشرق، شائع ہوا۔ اس کے آخری باب ”نقشِ فرنگ“ کا بیشتر حصہ، محنت اور سرمایہ کے اہم موضوع کے لئے وقف ہے۔ یہ اشعار فارسی زبان میں ہیں۔ طلوع اسلام میں جب بھی فارسی کے اشعار درج کئے جاتے ہیں تو اکثر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ان کا اردو ترجمہ کر دیا جائے تاکہ سب کو سمجھ میں آئے۔ (بالخصوص ہماری نئی نسل کا تعلیم یافتہ طبقہ اس سے بے بہرہ ہوتا ہے۔) یہ طالب علم تو اب اردو سمجھنے سے بھی قاصر ہوتے جا رہے ہیں (شعر کا ترجمہ نہ صرف اس کی شعریت ختم کر دیتا ہے بلکہ اس سے اس کی اثر انگیزی بھی باقی نہیں رہتی۔ اشعار کا مفہوم تو سمجھایا جاسکتا ہے، ان کا ترجمہ انہیں بے روح بنا دیتا ہے۔ اس لئے ہم نے ایسے مطالبات کو پورا کرنے سے اکثر معذرت چاہی ہے۔

اور پیام مشرق کے یہ اشعار، نہ صرف یہ کہ ان کی زبان فارسی ہے بلکہ ان میں جو فلسفہ پیش کیا گیا ہے وہ بھی بڑا دقیق ہے اس لئے بھی ان کا ترجمہ مفید مطلب نہیں ہو سکتا۔ بنا بریں ہم انہیں علیٰ حالہ پیش کر دینے پر مجبور ہیں۔

اس کی تلافی علامہ کے اردو کے وہ اشعار کر دیں گے جو بعد میں آئیں گے۔

پیام مشرق کے آخر میں ”صحبتِ رفنگان“ کے زیر عنوان، حضرت علامہ سب سے پہلے، طاسٹائے کی زبان سے کہلاتے ہیں :-

داروئے بیہوشی است، تاج، کلیسا، وطن

جانِ خدا داد را خواجه محبتِ خرید

اور کادل مار کس کے یہ الفاظ دہراتے ہیں کہ :-

راز دان جزو دکل، از خویش نامحرم شد است

اوم از سرمایہ داری، قاتلِ آدم شد است

طاسٹائے، ہیکل کے فلسفہ اضماد کو ”عقلِ دورو“ کی تخلیق قرار دے کر، اس پر، ان الفاظ میں سخت تنقید

کہنا ہے کہ اس کی رُو سے وہ :-

درسِ رضا سی دہد بندہٴ مزدور را ^ع
 ایرانی تحریکِ کمیونزم کا بانی، مزدک، دورِ حاضر کی اضطراب انگیزوں کو دیکھ کر، پکار اٹھتا ہے کہ
 دانهٴ ایراں ز کشتِ زار و قیصر بر دمید مرگِ بوی رقص اندر قصر سلطان دامیر
 مٹتے در آتشِ نمرودی سوزِ غلیل!
 تباہی کہ دوحِ میش از خداوندانِ پیر
 دورِ پردیزی گزشتِ لمے کشتہٴ پرویز، نیز
 نعمتِ گم گشتہٴ خود را ز خسر و باز گسیر
 اس کے ساتھ ہی، مزدوروں کا نمائندہ، کوہکن (فرہاد) اس غیر قیامت خیز کے ساتھ سامنے آتا ہے :-
 نگارِ من کہ بسے سادہ دم آمیز است ستیزہ گیشِ دستم کوششِ مفتنہٴ انگیز است
 برونِ اوہمہ بزم و درونِ اوہمہ رزم زبانِ اوز مسیح و دلش ز چنگیز است
 اگرچہ تیشہٴ من کوہِ راز پا آورد ہنوز گروشِ گردوں بکامِ پرنیز است
 ز خاک تباہِ فلک ہر چہ ہست وہ پیماست
 قدمِ کشائے کہ رفتارِ کاروانِ نیز است
 اس کے بعد ہمارے سامنے فرانسیسی فلاسفر، آگسٹس کوٹ اور مردِ مزدور کا مکالمہ آتا ہے۔ کوٹ، فلسفہٴ
 یادیت کا علمبردار تھا اور طبقات کی تقسیم کو مطابقِ فطرت قرار دیتا تھا۔ اس کے فلسفہ کے جواب میں، مردِ
 مزدور کہتا ہے :-

فریبی بہ حکمت مرا اسے حکیم	کہ نتوان شکستِ این ظلمِ قدیم
میں غلامِ رازِ زرا اندوہم ؟	مرا خوئے تسلیمِ ضررِ سودہ ؟
جی کو، بکنِ دادی اے نکمہٴ سنج	بہ پردیز پر کار و نابودہ رنج ؟
جہاں راست بہ روزی از دستِ مزد	ندانی کہ این مسیح کار است و زرد

۱۔ انسانوں کا خود ساختہ مذہب، غریب کو تقدیر پر خداوندی پرست کر رہنے کی تلقین سے درسِ رضا دیلے۔

۲۔ ایران کے حالیہ انقلاب کی روشنی میں ان اشعار کا صحیح مفہوم سمجھیں آسکتا ہے۔

پئے جرم او پوزشس آ دردہ ؟

بایں عقل و دانش فسون خوردہ ؟

اذاں بعد، سرمایہ دار اور مزدور کا "قسمت نامہ" ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس تقسیم کی رو سے، سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اس میں تمہارا بھی حصہ ہے اور میرا بھی۔ اس کی تقسیم یوں ہوگی کہ :-

غوغائے کارخانہ آہنگری زمین گلیاں گارغنون کلیسا اذاں تو !

نخلے کہ شہ خراج برومی نہد، زمین یارب بہشت دسدرہ و طوبی اذاں تو

تلخائے کہ درد سر آمد، اذاں من صہبائے پاک آدم و حوا اذاں تو

ایں خاک و آنچه در شکم او اذاں من

وز خاک، تا بہ عرش معلّا اذاں تو

اور پھر مزدور کی یہ دل خراش صلے دردناک ہمارے کافوں میں آتی ہے :-

زمرد بندہ کر پاس پوش و محنت کش

نصیب خوابہ تا کردہ کا درخت حریہ

زخوے نشانی، من لعل غام دالی زاشک کو دک من گوہر ستار امیر

زخون من چو، ز کوفہ ہی کلیسا را بزردہ بازوئے من دست سلطنت ہمگیر

خوابہ رشک گلستاں ز گریہ محرم

شباب لالہ و گل از طراوت جگرم

اور اس کا رد عمل :-

بیاکہ نازہ نوامی تراود از رگ ساز میں کہ شیشہ گداز دہر ساغر اندازیم

مغان و دیہ مغاں را نظام نازہ دہیم بنائے میکہ ہائے کہن بر اندازیم

زیر مہر نان چمن انتقام لالہ کشیم برہم غنیمہ دگل طرح دیگر اندازیم

بطوف شمع چو پروانہ زیستن تاکے

زخویش این ہمہ بیکانہ زیستن تاکے

اگے بٹھنے سے پیشتر، ذرا اس حقیقت کو سامنے لائیے کہ یہ اشعار ۱۹۲۳ء سے پہلے کہے گئے ہیں۔ اس کے بعد نظام سرمایہ داری اور محنت کشوں میں جو کش مکش ہوئی ہے اور دنیا کے معاشی نظام میں جس قدر انقلابات آئے ہیں، ان اشعار میں ان کی کس طرح پیش گوئی کی گئی ہے۔ اسے کہتے ہیں فراستِ مرد مومن! — حضرت علامہ نے یہ سچ کہا تھا کہ :-

عادت وہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینہ ادراک میں ہے
اس میں ایک نکتہ یہ بھی قابل غور ہے کہ انہوں نے "آئینہ ادراک" کہا ہے۔ یعنی ان کی فکر — کشف الہام نہیں کہا۔ جس کے دعویدار "ماور من اللہ" بن جاتے ہیں۔

اب اگے چلتے۔ زبورِ عجم میں یہ حشرِ دہاں پیغام انقلاب ہمارے سامنے آتا ہے :-
خواجہ از خونِ دگِ مزدور سازد لعلِ تاج از جھائے وہ خدایاں کشت دہقانِ خراب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

(زبور ص ۱۳۴)

— (۰) —

"بالِ جبریل" میں فرشتوں کا گیت، اسی روحِ انقلاب کا طنزِ نفیشر ہے۔ وہ خدائے کائنات کو مخاطب کہنے لگے کہ :-

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی

نقشِ گرازل ترا نقش ہے تائید ابھی

خلقِ خدا کی گھات میں دند و فقیہہ دمیرو پیر

تیرے جہاں میں ہے وہی گم و گشتِ صبحِ شام ابھی

تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست

بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

(ص ۱۳۸)

اور یہی وہ "عرش کے گنگوڑے ہلا دینے والا" احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ

اس انسانیت کش نظام کو اُلٹنے کے لئے

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو !
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودِ صنماں را بطوا ہترے چراغِ حرم و دیو بکھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرنے کی سبکدوش

(ص ۱۴۹)

میرے لئے مٹی کا حرم اور بسنا دو

یہی بات ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ :-

اے شیخِ امیروں کو مسجد سے نکلا دو

(ص ۱۶۶)

ہے ان کی نمازوں سے محرابِ ترش ابرو

اس لئے کہ

کثرتِ نعمت گداز از دل ببرد نازی آلود نیسا ز ازل برد

سالمہ اندر چہاں گمیدہ ام

(جافید نامہ)

نم بحشم منحاں کم دیدہ ام

بالِ جبریل میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے - "لینن - خدا کے حضور" ! آپ غور کیجئے کہ خدا کا شکر لینن، خدا سے کیا شکایت کرتا ہے - وہ کہتا ہے کہ :-

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو چوچھو حل کر دے جس کو کھیموں کے مقالات

وہ بات کیا ہے جسے گوش گزار کرنے کی اس طرح اجازت مانگی گئی ہے ؟ وہ بات وہی ہے جو ہر کمیونسٹ کے دل میں کھٹکتی ہے کہ :-

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے مہر ؟ وہ آدمِ خالی کہ جو ہے زیرِ سمادات ؟

اس آدمِ خالی کے تو اور ہی خدا ہیں !

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلذات!

ان "خداوند سفیدانِ فرنگی" کے نظامِ سرمایہ داری کا یہ عالم ہے کہ:-

نظامِ بریں تجارت ہے حقیقت میں جو ہے
سود ایک کالا کھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علمِ یہ حکمت، یہ تدبیر، یہ حکومت
پیسے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مسادات
اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ:-

آئندہ کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آنحضر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
مے خانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
نیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خدابات
چہروں پر جو سرخی نظر آتی ہے سرشام
یا غاڑہ ہے یا ساغرِ مینا کی کرامات
اور اس کے بعد دیکھئے کہ وہ کس حشرِ آمیز یا طنزِ آلودِ لہجہ میں کہتا ہے کہ:-

تو فاروقِ عادل ہے مگر تیر جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہٴ مزدور کے اوقا
کب ڈوبے گا سرمایہٴ پستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات! (۱۳۷)

عصرِ حاضر کا علم و حکمت، تدبیر و حکومت، کس طرح نظامِ سرمایہ داری کے آکر کار ہیں۔ اقبالؒ، مختلف مقامات پر، مختلف انداز سے اس کی وضاحت کرتا ہے۔ ارمنانِ حجاز میں ایک بڑی جامع نظم ہے جس کا نام ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"۔ اس میں ابلیس کا ایک مشیر، مختلف نظامِ ہائے حکومت کا تجزیہ کرنے کے بعد کہتا ہے کہ:-

سکار دبا دبا شہر یاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطان پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ولایت ہو یا پردہٴ زکا و ربار ہو
ہے وہ سلطانِ غیر کی کھیتی پہ جو جس کی نظر (۱۳۸)
دوسری جگہ اس حقیقت کو بڑے افو کھے اور نہایت دلچسپ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ایک دوزخی خدا سے مناجات کرتے ہوئے کہتا ہے:-

یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست یہ تجارت
جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاب
اود بادگاہِ باری تعالیٰ میں سجدہٴ شکرانہ بجالاتے ہوئے کہتا ہے:-
اللہ تدا شکر ہے کہ یہ خطہٴ پر سوز
سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

علامہ دورِ حاضر کے طالب علم سے کہتے ہیں :-

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیار جس نے قبض کی روح تدریٰ کے تجھے نگرِ معاش
(ضربِ کلیم ص ۸۲)

ارمغانِ حجاز میں وہ اُس سے کہتے ہیں :-

مرا کا فر کند اندیشہ رزق ترا کا فر کند علم کتبی (ص ۵۴)
جاوید نامہ میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-
چار مرگ اندیشئے این ذیرمید سود خوار و والی و مشلا و پیر
دوسرے مقام پر ہے :-

باقی تر رہی تیر سی وہ آئینہ ضمیری اے کشتہ سلطانی و ملاتی و پیری
نظامِ سرمایہ داری کے علمبردار، عزیز بول اور ناداروں کو جس اسلام کا سبق پڑھاتے ہیں، اقبالؔ؟ اسے ابلیس کا پیدا
کردہ فریب قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی زبان سے کہلوا یا گیا ہے :-
میں نے ناداروں کو سکھایا سبق تقدیر کا میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

لیکن نے خدا سے پوچھا تھا کہ :-

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تری منتظر ایوم مکافات
اقبالؔ؟ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ اس میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ مجھے تو نظر آرہا ہے کہ :-
گیا دورِ سرمایہ داری گسیا تماشا دکھا کہ مدار سی گسیا
لیکن وہ کہتے یہ ہیں کہ نظامِ سرمایہ داری، کمیونزم یا سوشلزم کے ہاتھوں نہیں ٹوٹے گا، اس لئے کہ ان کا معاشی
نظام چل ہی نہیں سکتا۔ یہ خود ناکام رہ جائے گا۔
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گیمباؤں کو کچ
مزد کی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے

(ارمغانِ حجاز ص ۲۲۳)

اس نظام کا سفینہ، اسلام کے ہاتھوں ڈوبے گا جس کے نظام کی حقیقت یہ ہے کہ وہ :-
موت کا پیغام ہر نوبہٴ غلامی کے لیے لے کوئی نفور و خافان نے فقیرِ ریشی (ص ۲۲۵)

اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ اسلام کا وہ نظام کیا ہے جس کے ہاتھوں سرمایہ داری کا خاتمہ ہو گا۔

مثبت نظام معیشت | نظام سرمایہ داری کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہنے چاہئیں۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ نظریہ، قرآنی نظریہ معیشت کا کبیر نقیض ہے اور البتہ انکسار کی ایجاد، ذرائع پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض کو) حاصل ہے۔ اس باب میں اقبالؒ کا نظریہ اس قدر واضح ہے کہ اس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ حاقید نامہ میں انہوں نے ”محکمات عالم قرآنی“ کے جو تین ستون بیان کئے ہیں، ان میں ایک ستون یہ ہے کہ :-

ارض ملکِ خدا است

اس عنوان کے تابع وہ لکھتے ہیں :-

حق زمین راجح متاع مانہ گفت
ایں متاع بے بہا مفت است مفت
دہہ خدایا! نکستہ از من پذیر
رزق و گور از دے بگیر اور انگیز
باطن ”الارض للہ“ ظاہر است

(ص ۸۰)

ہر کہ ایں ظاہر بنویند کافر است

آخری شعر میں اقبالؒ ایک عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔ ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ”الارض للہ“ (یعنی ارض خدا کی ملکیت ہے)، کا اعتراف کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ محض نظری عقیدہ ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ ”الارض للہ“ عقیدہ کی حد تک تو صحیح ہے۔ عملی نظام ایسا نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ ”الارض للہ“ کا نظری عقیدہ دیا ہی اس لئے کیا ہے کہ اس کے مطابق معاشی نظام مشکل کیا جائے۔ اگر اس عقیدہ کو محض نظری طور پر مانا جائے۔ اور عملی نظام اس کے خلاف ہو تو یہ اسلام نہیں، کفر ہے۔

غور فرمائیے۔ اقبالؒ کس طرح مسئلہ ملکیت زمین کو کفر و ایمان کی بنیاد قرار دیتے ہیں؟

اگے چل کر کہتے ہیں :-

رزق خود را از زمین بردن رواست
ایں ”متاع“ بندہ و ملکِ خداست (ص ۹۰)

اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

ایک ہی گوئی متابع از ماست مرد نادان این ہمہ مالک خداست
ارض حق را ارض خود دانی ، بگو چیست شرح آیه لَا تَقْسِدُوا
ابن آدم دل با بلیسی نہ ساد من زابلیسی ندیدم جز فساد
برودہ چیزے کہ از ان تو نیست !
داغ از کارے کہ شایان تو نیست

(۱۲۵)

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ :-

ملک یزدان را بر یزدان باز دہ ناز کار خویش بکشتی گم ہ
”ابلیس کی مجلس شوری“ (اورمغان حجاز) میں ، ابلیس کی زبان سے کہلوا یا گیا ہے :-
اس سے بڑھ کر اور کیا فکرمعمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں ، اللہ کی ہے یہ زمین !
”بال جبریل“ میں اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں : نظم کا عنوان ہے :-
الارض رتبہ !

وہ زمیندار کو (جو اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھتا ہے) مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ :-
پالتا ہے بیج کو مٹی کی تار بجی میں کون ؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سہا ؟
کون لایا پھینچ کر پیچھم سے باد ساز گاز ؟ خاک یہ کس کی ہے ، کس کا ہے یہ نور آفتاب ؟
کس نے بھر دی مٹیوں سے خوشہ گندم کی سہا ؟ موملو کو کس نے کھلائی یہ خوشے انقلاب ؟

وہ خدا یا ! یہ زمین تیری نہیں ، تیری نہیں

تیرے آباء کی نہیں ، تیری نہیں میری نہیں

جب یہ زمین ، تیرے آباء کی نہیں تھی تو اسے وراثت میں پا کر مالک بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ، اور جب یہ نہ
تیری ہے نہ میری ، تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کیسے کیا جاسکتا ہے ؟ یہ خدا کی ہے ۔ اور قرآن کی رو سے
جس چیز کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے ۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے فائدے کے لئے کھلی
رہے گی ، کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جاسکے گی ۔ جیسے اس نے کعبہ کے متعلق کہا کہ وہ میرا گھر دیتی ہے تو اس
کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ اسے للناس بنایا گیا ہے ۔ یعنی تمام نوع انسانی کے فائدے کے لئے ۔ اس لئے وہ —

وَلَا تَقْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ کہ یہ اشارہ ، قرآنی آیات ۲۳۰-۲۳۱ کی تفسیر میں

سواء ان العاکف فیہ والیاد ہے۔ یعنی وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں طور پر کھلا۔ یہی حیثیت زمین کی ہے۔ وہ نوع انسانی کے لئے متلوع (سامان زلیست حاصل کرنے کا ذریعہ) ہے۔ کسی کی ذاتی جائیداد نہیں۔

زمین سے آگے بڑھتے تو، نظام سرمایہ داری کی دوسری بنیاد فاضلہ دولت
فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کا فیصلہ

صاف اور واضح ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے۔ یَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ۔ اے رسول! یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت نوع انسان کی رویت عامہ کے لئے دے دیں۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ تمہاری ضروریات سے زائد جس قدر ہے، سب کی سب۔ اس فیصلہ نے فاضلہ دولت کا تصور ہی ختم کر دیا۔ قرآن کریم کے اسی فیصلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ اقبالؒ جاوید نامہ میں کہتے ہیں :-

بامسماں گفت جاں بر کف — بنہ

ہر صہ از حاجت فزون داری بدرہ

جب روس میں اشتراکیت کا انقلاب برپا ہوا تو اقبالؒ کی نگہ ڈرف بھی وڈورس نے اس میں فطرت کے اس اشارہ کو مضمر دیکھا کہ وہ دور قریب آرہا ہے جب قرآن کا معاشی نظام دیر شادابی عالم بن جائے گا۔ ضرب کلم کی یہ نظم (جس کا عنوان اشتراکیت ہے) اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ کہتے ہیں :-

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے معلوم

بے سود نہیں روس کی یہ گرمی رنستار

اندیشہ ہوا شوخی افکار یہ مجبور!

انساں کی ہوس نے جنہیں کھانا چھپا کر

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان

جو حرفِ قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

جب قرآن کی یہ مفہم حقیقت نمودار ہوگی تو اس وقت اس دنیا کا نقشہ کیا ہوگا۔ اسے اقبالؒ نے، جاوید نامہ میں، فلکِ مرتجح پر، شہرِ مرغین (دینِ پاکستان) کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس میں :-

سخت کش دہقان چراغش روشن است اندھابِ دہ خدایاں ایمن است
کشتِ دُکارش بے نزاع آبجوست حاصلش بے شرکتِ غیرے از دوست (۱۲)

اور

نے بیازاراں زبیکاراں خردش نے صدائے گدایاں دردِ گوش
اقبالؒ اپنی ۱۹۰۳ء کی آزد کو (جس کا ذکر شروع میں ہو چکا ہے) قرآنی نظام کی اسس آئیڈیل دنیا میں پورا ہوتے
دیکھتا ہے جہاں کیفیت یہ ہے کہ :-

کس دریں جاسائل و محروم نیست
عبد و مولا - حاکم و محکوم نیست (۱۳)
اسی کو وہ دین کا حاصل قرار دیتا ہے جب کہنا ہے کہ :-

کس نگہ دو در جہاں محتاج کس!
نکتہ، شرع میں این است و بس (پس چہ بادی کہ و ص ۴۱)
اقبالؒ نے جو کچھ نظام سرمایہ داری کے خلاف کہا ہے، مارکسزم کے حامی اسی کی سند سے اسے (اقبالؒ کی کمیونٹ
ثابت کرتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی غلط نگہی یا فریب انگیزی ہے۔ یہ اقبالؒ کے پیش کردہ نظام یا پیغام کا ادھاحصہ ہے۔
اس کے ساتھ اس کا باقی نصف حصہ ملانے سے پیغامِ اقبالؒ کا صحیح تصور سامنے آسکتا ہے۔ علامہؒ نے (جاوید
نامہ میں) اس غلط نگہی یا فریب کاری کی بڑے لطیف انداز میں پردہ دہی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام کے
ادھورے مطالعہ سے (جو جہل نے بھی پہی کہا تھا کہ جو کچھ رسول (نبی اکرم) مسادات کے نام سے پیش کر رہا ہے، یہ
درحقیقت مزدکیت سے مستعار لیا ہوا نظریہ ہے جسے سلمانؒ اپنے ساتھ فارس سے لایا ہے۔ اور یہاں اسے
اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ :-

ایں مساوات، ایں مواخا عجمی است خوب می دامن کہ سلمانؒ مزدکی است

(جاوید نامہ - نوٹہ ابو جہل - ص ۵۹)

اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ علامہ اقبالؒ نے (قرآنِ کریم کی روشنی میں) کیونززم یا
اشتراکیت کے متعلق کیا کہا ہے۔ اس سے کمیونسٹوں کی مغالطہ آفرینی اور فریب دہی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

کمونزم کی مخالفت

جب ۱۹۱۷ء میں روس میں کمونزم کا سیلاب اُمڈا تو اس نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ انقلاب تھا بھی بڑا زلزلہ، انگریز۔ سطح بین نگاہوں نے اسے محض ایک معاشی نظام سمجھا اور نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ لیکن علامہ اقبالؒ نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اور انہیں ایسا کرنا بھی چاہئے تھا۔ جس انقلاب کا دعویٰ ہو کہ وہ ہر نظام کہیں کی بساط الٹ کر ایک جدید نظام دنیا پر مسلط کرے گا جس سے غریبوں اور محتاجوں کی دردناک صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں گی۔ اس کا گہری نظروں سے جائزہ اقبالؒ نے لیتا تو اور کون لیتا؟ انہوں نے جب اس فلسفہ حیات پر نگاہ ڈالی جس کی بنیادوں پر اس عظیم معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا مقصود تھا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ انہوں نے اپنے ان تاثرات کو (اپنی مشنری پس چہ باید کرد؟ میں) ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

کردہ ام اندر مقاماتش ننگہ لاسلاطیں، لاکلیسا، لالہ

انہوں نے کہا کہ یہ منصفیانہ فلسفہ انسانی زندگی کی اساس نہیں بن سکتا۔ زندگی مثبت بنیادوں پر ہی قائم رہ سکتی ہے :-

در مقام لانیاساید حیات سوائے الامی خرامد کائنات

لاوالا برگ و ساز اُمتاں نفی بے اثبات مرگ اُمتاں

زندگی خلا میں باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ خلا کو پر کرنے کے لئے تعمیری اقدار مہیا نہیں کریں گے تو خیر بھی توہیں وہاں اپنا ڈیرہ جمالیں گی۔ مشہور مغربی فلاسفہ پسکالی نے لکھا ہے :-

انسانی ذہن اپنی عظمت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے۔ خدا قدرت کے کارخانے

میں محال ہے۔ اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ممکن ہے۔ انسان

جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے شکش

ہو جائے تو برے راستے اس کو خوش آتے ہیں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی

خوابط کی کشش، وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ (انسان نے کیا سوچا؟ ص ۳۳۹)

اقبال نے کہا کہ لاسلطیں اور لاکلیسا کی حد تک تو بات ٹھیک ہے کہ یہ دونوں قومیں خمری ہیں۔ اور انسانیت کی برو کے رستے میں بری طرح حائل، اس لئے ان کا مٹانا ضروری ہے۔ لیکن اگر الہ حقیقی کا بھی انکار کر دیا جائے تو اس سے مستقل اقدار خداوندی کا انکار لازم آجاتا ہے اور جب انسانی زندگی میں اقدار کی کارفرمائی نہ رہے تو پھر انسان حیوانوں کی سطح پر آجاتا ہے جس میں ”دنی“ کے سوا کوئی مقصد حیات نہیں رہتا۔ اقبال نے اس ضمن میں کہا کہ :-

دینِ اں پیغمبرِ حق ناستناس! بر مساواتِ شکم وارد اساس

تناخت رامقام اندر دل است بیخ اور دل، نہ دبابِ گل است (جاوید نامہ ص ۶۹)
طبعی (یا حیوانی زندگی) کی مساوات کچھ معنی نہیں رکھتی۔ طبعی زندگی کی ضروریات کا پورا ہونا بے شک لازمی ہے لیکن حقیقی مساوات شرفِ تکوین انسانیت میں مضمر ہے۔

برز از گمہ دول مقامِ آدم است

اصل تہذیب احترامِ آدم است

اور احترامِ آدم مستقل اقدارِ خداوندی کے اتباع سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ان اقدار کے انکار سے ”حیوانی آدم“ تو زندہ رہ سکتا ہے، ”انسانی آدم“ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے انہوں نے کہا کہ :-

دل کی ازادی شہنشاہی شکم سا ان موت فیصلہ میرا تیرے ہاتھوں میں، دل یا شکم

(بال جبریل - ص ۵۵)

جہاں تک سلاطین کا تعلق ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کی شکل بدل دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یورپ نے شہنشاہیت کو ختم کر کے جمہوریت کی طرح ڈالی تو اس سے محض حکومت کی شکل بدلی۔ بعض انسانوں کا دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا سلسلہ ویسے ہی رہا۔ اگر روس، زار کی شہنشاہیت کو ختم کر کے اس کی جگہ ”مزدوروں“ کی حکومت قائم کر دے گا تو اس سے انسانیت کس استبداد میں کمی واقع نہیں ہو جائے گی۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو طریق کو بھن میں بھی دہی چیلے ہیں پروتھی

(بال جبریل - ص ۶۲)

کیونکہ ہم کے فلسفہ اور اس کا اس طرح گہری نظروں سے تجزیہ کرنے کے بعد اقبال نے ملتِ روسیہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ :-

تو کہ طرح دیجھے انداختی دل زد تو کیس پر داختی
کمرہ کار خداوندان تمام بگذر ازلا، جانب الاحرام
در گذر ازلا اگر جویندہ تارہ اثبات گیسری زندہ
ایک مے خواہی نظام علی
جستہ اور اساس محکم

”اساس محکم“ کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے مارکس کی ایک بنیادی معذوری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ نوع انسانی کی مشکلات کا حل اسی معاشی نظام میں مضمر ہے جس میں :-

”ہر فرد اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے۔“

مارکس کے رفقاء نے کہا کہ یہ بہت بڑا انقلابی دعویٰ ہے۔ اسے آپ عملاً مشکل کیجئے۔ اس پر مارکس نے کہا کہ میں اس سے معذور ہوں۔ انسانی مشکلات کا حل تو وہی ہے جسے میں نے پیش کیا ہے لیکن میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ وہ جذبہ محرکہ کیا ہوگا جس کی رو سے ایک شخص جان مار کر دن رات محنت کرے اور اس کے حاصل میں سے اپنے لئے صرف اتنے لے جتنے کی اسے ضرورت ہے اور باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔ جب تک مجھے اس جذبہ محرکہ کا علم نہ ہو جائے میں اس کے لئے عملی قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ اس کے بغیر اس نظام کا قیام ناممکن ہے۔ اس کی پارٹی میں کافی عرصہ تک یہ بحث جاری رہی لیکن جب وہ کسی صورت میں بھی عملی اقدام کے لئے تیار نہ ہوا تو اس کی پارٹی کے کئی ممبر دل برداشتہ ہو کر اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اس نے ان سے کہا کہ تم اس اختلاف کی وجہ سے مجھ سے الگ ہوتے ہو تو ہو جاؤ۔ لیکن میں تمہاری رضا جوئی کی خاطر ایسا قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں جسے میں ممکن العمل نہیں سمجھتا۔ ایسا کرنا منافقت ہوگا۔

یہ ہے وہ جذبہ محرکہ جسے اقبال نے اس قسم کے نظام کے لئے اساس محکم قرار دیا اور اس سلسلے میں رو سے کہا :-

داستان کہنہ شستی باب باب فکرم را روشن کن از اتم الکتاب

کیا اس کے بعد کوئی شخص اقبال کو کمیونسٹ کہہ سکتا ہے؟ اقبال نے کمینوزم کے معاشی نظام اور اس کے فلسفہ زندگی کو الگ الگ کمرے دونوں پر تبصرہ کیا اور اسی لحاظ سے مارکس کے قلب اور دماغ کا بھی الگ الگ تجزیہ کیا۔ اس نے کہا کہ مارکس نے نوع انسان کی معاشی مشکلات کا جو حل تجویز کیا ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔

قرآن کریم نے یہی حل بتایا تھا اور اسلام کے صدرِ اول میں اسے عملاً متشکل کر کے دکھایا گیا تھا۔ لیکن اس کا مارکس کا فلسفہ حیات جو مستقل اقدارِ خداوندی کے انکار پر متغیر ہے یکسر باطل ہے۔ چنانچہ وہ مارکس کی زندگی کے گوشہٴ اول کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ لیکن اس کے دوسرے گوشے کی بنا پر اس کی تردید بھی اسی شدت کے ساتھ کرتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے:-

صاحبِ سرمایہ، از نسلِ خلیل! یعنی اُن پیغمبرِ بے جبرئیل

مارکس کی بنیادی کتاب کا نام "سرمایہ" (DAS CAPITAL) ہے اور چونکہ وہ یہودی تھا۔ اس لئے اسے "از نسلِ خلیل" کہا گیا ہے اور "پیغمبرِ بے جبرئیل" کہہ کر اس کے پیغام کے دونوں گوشوں کو جس طرح منعکس کیا گیا ہے اس کی داد صاحبِ نظر ہی دے سکتے ہیں۔ اسی تجزیہ کو انہوں نے ارمغانِ حجاز میں اہلیت کے مشیر کی زبان سے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:-

وہ کلیمِ بے تجلی، وہ مسیحِ بے طیب نیست پیغمبرِ دلگیر در بغلِ دارِ کتاب

اور ذیل کے شعر میں انہوں نے ان "متشابہات" کو "محکمات" کے پیچھے پیش کر دیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ:-

نا نکمِ حق در باطلِ او مضمر است قلبِ اومومن دماغش کا فراست

کس قدر جبرستہ اور طبع ہے یہ تجزیہ جس کی رُو سے کہا گیا ہے کہ، اس کا قلبِ درد آگیاں مغسول، محتاجوں، مزدوروں، محنت کشوں کے مسائل کے احساس سے وقفِ اضطراب تھا۔ اس لئے اس کا قلبِ مومن تھا لیکن اس نے، وحی کی روشنی سے محروم رہ جانے کی بنا پر جو فلسفہٴ حیات پیش کیا وہ یکسر باطل ہے۔ مارکس (یا کمونزم) کی بے بھری پر اقبال کا دل کڑھتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وحی کی اساسِ محکم موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس قدیم انقلاب نہ صرف ناکام رہ جائے گا بلکہ فسادِ انسانیت کا موجب بن جائے گا۔ وہ ہزار جان سے چاہتا تھا کہ اس انقلاب کے داعی اپنے فلسفہٴ حیات کے لئے قرآن سے راہ نمائی حاصل کریں تاکہ یہ معاشی انقلاب موجبِ تعمیرِ انسانیت ہو جائے۔ اس سے یہ معاشی نظامِ قرآنی نظام کے مماثل ہو جائے گا۔ اس ضمن میں انہوں نے فرانسس ہیکسٹنسن کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا:-

"بالشویزم کے ساتھ اگر خدا کو ملا دیا جائے تو یہ نظامِ اسلامی نظام کے مماثل ہو سکتا ہے۔"

علامہ اقبال نے اپنی تنقید میں صرف روس کو مخاطب کیا ہے، چین کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ ان کی زندگی میں چین، کمیونسٹ مملکت کی حیثیت سے ابھرا نہیں تھا، لیکن علامہ کی تنقید، کمینوزم کے خلاف ہے۔ وہ کسی ملک میں بھی کارفرما کیوں نہ ہو، یہ حیثیت قابلِ غور ہے کہ انہوں نے جو کہا تھا کہ کسی محکم بنیاد کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ نظام کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ ان کی یہ ”پیش گوئی“ حرفِ بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ روس نے تو پھر بھی ناکام ہونے کے لیے کچھ عرصہ لیا۔ چین کا نظام ماورائے تنگ کی شخصیت کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی اس نظامِ فلک بوس عمارت کی اینٹیں ایک ایک کمرے گرنے لگیں شروع ہو گئیں ادب وہ تھوڑے عرصہ کی مہمان نظر آتی ہیں۔ سچ کہا تھا حضرت علامہ نے انسانیت لڑنے کے خلاف میں زندہ نہیں رہ سکتی! اے کاش! اس وقت دنیا میں کہیں قرآن کے الا کا نظام قائم ہوتا تو اس کے عالمگیر ہونے کے لئے فضا بڑی سازگار تھی۔ لیکن اس میں مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ نظام سرمایہ داری کی ناکامی کے بعد، نظام کمینوزم کا ناکام تجربہ، انسانیت کو قرآن کے الٰہی طرف آنے کے لئے مجبور کر دے گا۔ تکل العفو کا دور آگہ رہے گا۔

ان تصریحات سے علامہ اقبال کے مسلک کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ مارکسزم کے معاشی نظام کو قتل کے معاشی نظام کے مماثل سمجھتے تھے لیکن اس کے فلسفہ حیات کو بحیر کفر۔ اور چرچہ کمینوزم میں اس کے فلسفہ حیات کو اس کے معاشی نظام سے الگ نہیں کیا جاسکتا اس لئے کمینوزم ان کے نزدیک کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کھلے لفظوں میں اس کی وضاحت بہت پہلے کر دی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ جب انہوں نے بائبل، درا اور پیامِ مشرق میں، نظام سرمایہ داری کے خلاف لکھا تو ایک صاحب، شمس الدین حسن نے جو کمینوزم کے بہت بڑے حامی (اور مہتمم و اخبار، انقلاب اور خاور کے ایڈیٹر رہ چکے تھے) روزنامہ زمیندار (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۳ جون ۱۹۲۳ء میں ایک مضمون لکھا:-

”بالشوئیک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر، اقبالؒ، ان کی زد سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ بالشوزم، کادل مارکس کے فلسفہ سیاسیات کا لب لباب ہے اور اسی کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمینوزم کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ کی نظم ————— خضر راہ — اور ان کے مجموعہ کلام، پیامِ مشرق، کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ، ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ ہیں۔“

اس کے جواب میں حضرت علامہؒ کا، ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں خط شائع ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ :-

۱۔ میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۃ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔

۲۔ میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔

۳۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناقصیت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہے۔ لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔

(بحوالہ: اقبالؒ اور قرآن جلد ۱۹)

اس کے بعد انہوں نے، ۱۹۳۶ء میں، خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں لکھا :-
 ”سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے خلاف ہیں۔ اور اسے ایفون تصور کرتے ہیں۔ لفظ ایفون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مرنے والا ہوں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں۔ مگر روحانیت کے قسائی مفہوم کا..... جو روحانیت میرے نزدیک مغضب یعنی ایفونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم۔ سوا سلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔“

(مکاتیب اقبالؒ)

اس سے سوشلزم اور اسلام کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے اور حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سوشلزم کا فلسفہ حیات ماننے والا، مسلمان نہیں ہو سکتا۔

انہوں نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے، قائد اعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ :-
 ”شریعت اسلام کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون

کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم عام معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔ اسلام کے لئے سوشل ڈیما کر لینی کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ علامہؒ اقبالؒ سوشلزم کے فلسفہ حیات کو اسلام کی نفیض قرار دیتے اور اس کے شدید مخالف تھے اور وہ قرآن کے معاشی نظام کو (جو سوشلزم کے معاشی نظام کے مماثل ہے) نوع انسانی کی مشکلات کا حل قرار دیتے تھے۔ لہذا اقبالؒ کو کمیونسٹ کہنا بڑی زیادتی ہے۔

پرویز

دوقومی نظریہ

(اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کی نگاہوں میں)

ذیل کا مقالہ، روزنامہ نوائے وقت کی ۲۱ نومبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اسے پرنسپل صاحب کی نظر ثانی کے بعد، نوائے وقت کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے :-

۱۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء کے نوائے وقت میں میرا مبسوط مقالہ شائع ہوا، جس کا عنوان تھا - "کیا قائد اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟"۔ اس میں ضمناً دوقومی نظریہ کا بھی ذکر کیا گیا تھا، لیکن چونکہ میرے زیر نظر موضوع دوسرا تھا اس لئے میں اسے چھوٹا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد مجھے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ جس طرح میں نے اسلامک سٹیٹ اور سیکولر سٹیٹ کے فرق کو نکھارا اور انہماک کر بیان کیا ہے اور اس باب میں قائد اعظمؒ کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح "دوقومی نظریہ" کے متعلق بھی مجھے تفصیل سے لکھنا چاہئے اور اس باب میں علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے نظریات اور مسلک کو وضاحت سے بیان کرنا چاہئے۔ یہ سطور اسی مطالبہ کی تعمیل میں تحریر ہیں۔

جب اس کمرہٴ ارض پر انسانوں نے پہلے پہل جل کر رہنا شروع کیا تو وہ (مختصر ہی رہی) لامحالہ ایک جماعت، ایک گروہ، ایک معاشرہ تھا۔ جس میں کسی قسم کی تفریق اور تقسیم نہیں تھی۔ اس کے بعد ان میں تفریق پیدا ہوئی شرع ہوئی۔ قرآن کریم کے الفاظ میں :-

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفْنَا (۱۹۱)

"ابتداء میں نوع انسان ایک ہی امت تھی۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔

ان اختلافات کو مٹا کر انسانوں کو پھر سے امت واحدہ بنانے کے لئے انبیاء اکرامؑ کا سلسلہ شروع ہوا۔

ارشاد ہے -

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً قَدْ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ
وَمُنذِرِينَ مِمَّا أُنْزِلَ بِهِمْ أَلَكُتِبَ بِالْحَقِّ لِيُعَلِّمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا
اُخْتَلَفُوا فِيهِ ط (۲۱۳)

”نوع انسان شروع میں ایک ہی اُمت کے افراد تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہونے
شروع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے مبشرین اور منذرین انبیاء کرامؑ کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے ساتھ
مصابطہ قوانین بھی نازل کیا۔ تاکہ وہ اس کے ذریعہ ان کے اختلافات کو مٹا کر (انہیں پھر سے
اُمت واحدہ بنادیں)۔“

نوع انسان کی اُمت واحدہ، سب سے پہلے خاندانوں میں تقسیم ہوئی۔ خاندان بڑھے تو اس تفریق نے
قبائل کی شکل اختیار کی۔ قبائل دامن دراز ہوئے تو نسلی امتیازات کی تفریق پیدا ہو گئی۔ اور اب اس دور
میں، اس تقسیم نے قومیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس تفریق کے لئے گمراہی اور من پر یکسریں کھینچی گئیں اور
ان سے مختلف ممالک وجود میں آ گئے۔ اور ایک ملک کی چار دیواری کے اندر بسنے والے انسان ایک قوم کے
افراد قرار پائے۔ اس طرح خدا کی وسیع و عریض زمین مختلف ملکوں کی حدود میں بٹ گئی اور انسانوں کی عالمگیر
برادری نے متعدد قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ اب کوئی انسان محض انسان ہونے کی نسبت سے بیچارہ
نہیں جاتا۔ وہ متعارف ہوتا ہے وطن یا قوم کی نسبت سے۔ اس سے دنیا کس قدر عالمگیر جہنم کے عذاب میں
مبتلا ہے۔ اس کا اندازہ اس چیخ و پکار سے لگ سکتا ہے جو دنیا (بالخصوص مغرب کے دانشمندان) سے مسلسل اٹھ
رہی ہے (یہ بہر حال دوسرا موضوع ہے) آپ نے دیکھا کہ یہ تفریق، نسل، رنگ، زبان، وطن کی بنیادوں
پر پیدا ہوئی۔ حضرات انبیاء کرامؑ نے (وحی خداوندی کی رُوس) کہا کہ یہ معیار تفریق باطل ہے حقیقی معیار تقسیم
فکر و نظر (آئیڈیالوجی) کی ہم آہنگی ہے۔ زندگی کا ایک تصور، مستقل اقدار خداوندی کی رُوس سے مشکل ہوتا ہے۔
جو لوگ اس تصور حیات میں ہم آہنگ ہوں وہ رنگ، نسل، زبان اور وطن کے اختلاف کے باوجود ایک
برادری کے افراد ہیں۔ جو اس تصور کو تسلیم نہ کریں وہ دوسری برادری کے افراد۔ قرآن کریم میں ہے -

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ ط (۶۴)

”خدا نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے ایک گروہ نے بلند انسانیت کی زندگی سے انکار

کر دیا۔ دوسرے گروہ نے اسے تسلیم کر لیا۔

اور یوں نوح انسان ہو گیا وہوں میں بیٹ گئی۔ بلند سطح زندگی سے انکار کرنے والوں کو اصطلاح میں کافر کہتے ہیں۔ حقیقی زندگی کے تسلیم کرنے والوں کو مومن۔ کافر کے معنی انکار کرنے والا ہیں اور مومن کے معنی مان لینے والا۔ قرآن کریم کی دُوسرے تفریق انسانیت کا یہی معیار ہے۔ جس کے مطابق دنیا میں دو ہی قومیں بستی ہیں۔ مومن اور کافر۔ یا مسلم اور غیر مسلم۔

حضرات انبیاء کرامؑ نے اس معیار تفریق کو محض نظری طور پر پیش نہیں کیا۔ اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہو کر دکھائی دیا۔ سلسلہ وحی کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب ان کے زمانے میں، ان کی اپنی قوم میں، اس معیار کے مطابق تفریق پیدا ہوئی تو حضرت نوحؑ ایک طرف تھے اور ان کا حقیقی بیٹا دوسری طرف، کیونکہ وہ مبنی بروحی نظریہ حیات میں ان سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیمؑ کے باپ نے اس صبح روشنی زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے نہ صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا کہ :-

وَاَعْتَزِلْكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (۱۹)

”میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں۔“

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ ان سے کہہ دیا کہ :-

اِمَّا بَدْرًا اَوْ مَسْكُورًا ۚ فَمَا تَتَّبِعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ

”ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو ان سب سے یکسر بے تعلق ہیں۔“

کُفْرًا بِكُمْ ۚ۔ ”ہم تم سے ہر شے کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔“ وَبَدَأَ ابِيْتَنَا وَ بَيْتَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اَبَدًا ۚ ”تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی عداوت اور نفرت رہے گی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، ادنیٰ عداوت محبت سے اور نفرت رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ تم بھی اس رستے کی سپائی پر یقین کر لو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے۔ حَتَّىٰ تَقُومُوا لِلَّهِ وَحْدَهُ (۲۰) اس لئے کہ اس عالمگیر اصول زندگی کی دُوسرے اپنوں اور بیگانوں کا معیار، خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ فَمَنْ تَبِعْنِيْ فَابْتَغُوا مَوَاجِدَہُمْ ”جو شخص میرے پیچھے

یہ سمجھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرو اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے۔ اور میرے اپنے جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے لئے غیر ہیں۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا۔ (۱۱۶، ۱۱۷) قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوع انسانی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ آئنا کونیا کے سامنے وہ دور آگیا جب وحی کی تکمیل ہو گئی۔ اور اس کے مطابق نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں، ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روز روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس تشکیل قومیت کے مطابق حبش کا بلال۔ فارس کا سلمان۔ اور روم کا مہیب رضی

قوم رسول ہاشمی

اللہ تعالیٰ عنہم) محمدؐ عربی کی ”اپنی قوم“ کے افراد تھے اور مکہ کا ابو جہل اور حقیقی چچا ابولہب ”غیر قوم“ کے افراد۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آگیا جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے تو ان کا باپ عتبہ دوسری طرف، حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اس طرف۔ حضرت علیؓ ادھر تھے تو ان کا بھائی عقیل ادھر نہیں! اور آگے بڑھتے۔ ادھر خود محمدؐ تھے تو ان کے بد مقابل آپؐ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص۔ یہ تھی وہ تقسیم انسانیت، جو وطن، رنگ، زبان، نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و نفوس سے بلند ہو کر، خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ اُمت محمدؐ یہ ملت اسلامیہ۔ وہ جماعت مومنین جو دنیا کے مختلف حصوں کے اُن انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجہ اشتراک صرف ایمان تھا یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضُهُمْ (۱۱۸) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں، نہ ماننے والوں دکھار کی قدم بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضُهُمْ (۱۱۹) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز اس کے بعد اس قوم مومنین کو تاکید کر دی کہ:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِلطَانَةٍ مِن دُونِكُمْ

”اے جماعت مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔“

اس لئے کہ لَا يَأْتِيكُمُ خَبْرٌ لَّا... یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ”وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ...“ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں الجھے رہو۔ ”قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ

مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تَحِطُّ بِهُدُودُهُمْ أَكْبَرُ ط ” ان کے بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آجاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ ” قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ أَنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ (۱۱۱) ” ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے ان زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے۔ ان نہ مانتے والوں کی حالت یہ ہے کہ اِنْ تَسْأَلُهُمْ خَيْرٌ سَأَلُوا خَيْرٌ ” اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے۔ ” وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَتَزَوَّجُوا بِهَا ط (۱۱۹) ” اور اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے۔

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی، بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے متعلق (ESTABLISH) ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے ۲۵) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ، تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکام خداوندی کے مطابق کرنے ہیں؛ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ۔ (۵۸) جو ایسا نہیں کرے گا وہ مومن نہیں کافر ہے۔ (۱۱۱) قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو فرعی قوانین مرتب کرنے پڑیں۔ انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو۔ (وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ۔ ۲۸) ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو۔ جو ان سے قبل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امور مملکت میں شریک و ذخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہ کی مجلس شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا نہ خلفائے راشدینؓ کی پارلیمان میں کوئی غیر مسلم۔ ان کی حکومت خالصتاً جماعت مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس مملکت میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔ وہ ”قوم مسلم“ کے افراد نہیں تھے۔

۱۔ عدم گناہ کے باعث یہاں صرف انہی آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید آیات کے لئے دیکھئے۔

صدرِ اول کے بعد

اسلام کے صدرِ اول کے بعد، جب دین، مذہب میں بدل گیا تو اس کے دیگر مہمات اصول کی طرح قومیت کا یہ نظریہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور مسلمان بھی، دیگر قوموں کی طرح، نسل اور وطن کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ گئے۔ صدیوں سے ہماری یہی حالت چلی آرہی تھی کہ ہم میں اقبالؒ جیسا منظم پیدا ہو گیا جس نے اپنی قرآنی بصیرت کی روش سے دین کی دیگر اساسات کی طرح، اس فراموش کردہ حقیقت کی بھی ازسرنو یاد دہانی کرائی کہ اُمتِ محمدیہؐ کانسوں اور وطنوں کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ جانا، اسلام کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ پوری اُمت، ایمان کے اشتراک کی بنا پر اُمتِ واحدہ ہے۔ فکرِ اقبالؒ کے عام ہو جانے کی وجہ سے آج ہمارے لئے یہ سمجھنا کہ اسلامی قومیت کا یہی معیار ہے، چننا تعجب انگیز نہیں، لیکن خود اقبالؒ کا اس قرآنی حقیقت تک پہنچنا بڑا تعجب انگیز تھا۔ وہ ۱۹۰۵ء میں جب اس کی عمر تیس تیس سال سے زیادہ نہ تھی، حصولِ تعلیم کے لئے یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ دانا یاں مغرب اس نظام کو کو نوعِ انسان کے مشکلات کا مداوا قرار دے رہے تھے۔ چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک و تہنیت کے تحائف پیش کئے جا رہے تھے۔ ان حالات میں ایک ایسے نوجوان طالب علم کا جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو، مشدد نیشنلسٹ ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن مؤرخ کی نگاہ یہ دیکھ کر حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ کیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ

ہندی میں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ:-

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا
مسلم میں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
وہ گیا تھا تو یہ گنگنا ہوا کہ

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دینا ہے!

اور وہ واپس آیا تو یہ لاپتا ہوا کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ گیا تھا قویہ سندیش دیتا ہوا کہ ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلساں ہمارا
اور آیا قریہ اعلان کرتا ہوا کہ ہے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

چونکہ یہ نظریہ اسلامی نظامِ زندگی کی اصل اور بنیاد تھا، اس لئے علامہؒ نے اس کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن قرار
دے لیا۔ وہ اسے کس شد و مد سے پیش کرتے تھے، اس کا اندازہ اس نظم سے لگائیے جو ”بانگ درا“ میں
وطنیت کے عنوان سے درج ہے۔ اور اس میں وہ کہتے ہیں ہے

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساتی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے اُفرنے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشید تہذیبِ فوسی ہے غارت گری کا شانہ دینے نبویؐ ہے

بازو ترا تو حید کی قوت سے فوسی ہے اسلام ترا دیں ہے، تو مصطفویؐ ہے

نظارۂ دیریت زمانے کو دکھا دے

اے مصطفویؐ! خاک میں اس بُت کو ملاؤ

اس نظریہ کی مخالفت

میں نے اپنے مقالہ ”مشلع شدہ ذوائے وقت“ باب ۱۷، اکتوبر ۱۹۸۱ء میں بتایا تھا کہ جب قائدِ اعظمؒ
نے سیکولر سٹیٹ کے خلاف اسلامی مملکت کا نظریہ پیش کیا تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت نیشنلسٹ
علماء کی طرف سے ہوئی تھی۔ اسی طرح اقبالؒ کے پیش کردہ نظریہ قومیت کی شدید ترین مخالفت بھی انہی کی

طرف سے ہوئی۔ اس کا ٹیپ کا بند اُن کی وہ بحث ہے جو مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ ہوئی۔ شروع سلسلہ کی بات ہے۔ مولانا مرحوم نے دہلی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ — ”قومیتیں“ اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں۔“ ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان، کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جاسکتا۔ علامہ اقبالؒ اس زمانے میں یوں کہتے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے اس خلافتِ اسلامِ نعر کو سنا تو ان کے دل صدچاک سے ایک آہ اُبھری، جو ان الفاظ کی شکل میں، فضا کو چیرتی ہوئی اُن سونے افلاک تک جا پہنچی کہ :-

عجم ہنوز زنداند رموزِ دیں ورنہ زردیو بند حسین احمدؒ اس چہ لبِ العجبی است

مردِ برہمہ مبرکہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مہم تمام محمدؐ عمری است

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باؤنر سیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں ”بمصطفیٰؐ برساں خویش را“ کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں۔ دینِ خدا کی طرف سے ملتا ہے، لیکن اُمت کی تشکیل اس رسولؐ کی نسبت سے ہوئی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے اسلام کے پیرو، اُمتِ محمدیہ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پاجائے تو رسولؐ سے نسبت ختم ہو جائے اور جب رسولؐ سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیْعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (پہر)

”جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور اس طرح الگ الگ فرقے، پارٹیاں، قومیں بن جائیں

اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں“

یعنی اگر قومیت کی اساس، اسلام کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا رسولؐ سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر، علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے، رسول اللہؐ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت کی نسبت وطن کے بجائے حضور نبی اکرمؐ کی طرف کرو۔ بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باؤنر سیدی

اگر تم نے اپنی نسبت حضورؐ کی طرف نہ کی تو — تمام بوالہبھی است — پھر دین باقی نہیں رہتا۔ بولہبھی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف کی جاتی ہے۔ اس اصولی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہؒ نے کہا :-

”اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی قابلِ قدر اور اہم تھا تو رسول اللہؐ کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پُر خاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول اللہؐ نے اسلام کو ایک ہم گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت، ابو جہلؓ بولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔۔۔ محمدؐ (فداہ انی وامی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی، لیکن جب محمدؐ کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہؐ کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے، وہ سب امت مسلمہ یا ملت محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے، اب ”ملک و نسب“ ان کا گرفتار ہو گیا۔

کے کو پیچہ زو ملک و نسب را نہ داند نکستہ دین عرب را !
اگر قوم از وطن بودے، محمدؐ ندادے دعوتِ دیں بولہب را !
حضور رسالت مآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ بولہب یا ابو جہلؓ یا کفار مکہ سے فرماتے کہ تم اپنی بہت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اثر اکنت کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحشت عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر حضورؐ (غوف باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ بنی آخر الزماںؑ کی راہ نہ ہوتی۔

آپؐ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریہ قومیت کو کس قدر اُبھار کر اور نکھار کر بیان کر دیا ہے۔ لیکن ابھی تک اس نظریہ کا ایک بُخ باقی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن امت کی تشکیل اس نبیؐ کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا ہوں، لیکن موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے آج پھر دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ امت کی یہ تشکیل اس رسولؐ کی طرف نسبت

سے ہوتی ہے جسے سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے۔ مثلاً ایک عیسائی، حضرت عیسیٰؑ امدان سے پہلے کے جملہ انبیاءؑ بنی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے، یعنی نبوت کو حضرت عیسیٰؑ کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے، اس لئے وہ اُمتِ حضرت عیسیٰؑ کا فرد (یعنی عیسائی) کہلاتا ہے۔ لیکن جو نبی وہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمد رسول اللہ) پر ایمان لے آتا ہے، وہ اُمتِ عیسوی سے کٹ کر ایک نئی اُمت یعنی اُمتِ محمدیہ کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی اصول کی رو سے، اگر کوئی شخص، محمد رسول اللہ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ اُمتِ محمدیہ سے کٹ کر ایک نئی اُمت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ جس طرح رسول اللہ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ، اُمتِ محمدیہ سے کٹ جاتا ہے، اسی طرح وطن یا نسل کو قومیت کی اساس قرار دینے سے بھی اُمتِ محمدیہ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا۔

انہوں نے کہا ہے کہ :-

”حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریہ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں ”انکارِ خاتمیت“ کا نظریہ۔ وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الہی ابدالاً بآدمک متعین و متکفل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کر لے جس طرح قادیانی نظریہ، ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی اُمتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔“

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور، ذاتِ رسالتِ مآب سے اپنا رشتہ منقطع کر کے، ایک جدید اُمت، یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی یہ تنبیہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی اور اس کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہئے تھا بلکہ نیشنلسزم کا مسک بھی ترک کر دینا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے

جائے مولانا مدنی نے اپنے دعویٰ کی مدافعت میں لمبا چڑھا بیان داغ دیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو ”معرکہ دین و وطن“ کے نام سے مشہور ہے۔ اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابل تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے اس معرکہ آراء بیان کو یہاں درج کر دیا جائے۔ لیکن عدم گنجائش اس سے مانع ہے۔ (ویسے میں اس موضوع پر طلوع اسلام میں مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں)

(ضمناً، مولانا مدنی (مرحوم) کے متبعین میں سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے اس بیان کے بعد، مولانا مدنی نے یہ وضاحت کہہ دی تھی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسلام کی رو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ ابھل قومیتیں، وطنیت کی بنا پر متشکل ہوتی ہیں۔ اور علامہ اقبالؒ نے ان کی اس معذرت (یا وضاحت) کو تسلیم نہ کیا تھا، اس لئے اس فقرہ کو اب دہرانا نہیں چاہئے۔ لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو سامنے نہیں لائے کہ مولانا مدنی (مرحوم) نے حضرت علامہؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد، ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں کہا تھا کہ اقبالؒ کا موقف معنی برحقیت نہیں تھا۔ اسلام کی رو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ طلوع اسلام نے اسی زمانہ میں اس کتابچہ کا بھرپور جواب شائع کیا تھا جس کا کسی سے آج تک جواب بن نہیں پڑا۔ (یہ مقالہ بارہ گنج، طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا)۔

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو پیش کرتے رہے، لیکن یہ احساس ان کے دل میں برابر کھٹک پیدا کر رہا تھا کہ ان کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ان نظریات کو عملی طور پر کون آگے بڑھائے گا؟ جب آنے والا مورخ اس حقیقت پر نگاہ ڈالے گا کہ اس مقصد کے لئے ان کی نگہ انتخاب کہاں جا کر ٹکی تو وہ یقیناً جو حیرت رہ جائے گا۔ ان کی نگاہ کا ہدف تھا مسٹر محمد علی جناح۔ وہ جناح جو عمر بھر نیشنلسٹ رہا اور پھر ہندوستانی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن کے گوشہ خلوت میں جا بیٹھا تھا۔ اس قسم کے نیشنلسٹ کو اسلامی قومیت کے نظریہ کا ایسا معتقد بنا دینا کہ وہ اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دے لے، اقبالؒ کا وہ کارنامہ ہے جس سے ملت اسلامیہ ان کی ہمیشہ رہیں منت رہے گی۔ یہ کیسے ہوا تھا؟ اس حقیقت کی پردہ کشائی قائم مقام کے سوانح حیات کا انگریز مرتب (پیکر بلو لیتھو) ان الفاظ میں کرتا ہے :-

”اپنے قیام لندن کے دوران مسٹر جناحؒ نے اقبالؒ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ ایک دوسرے کے بہت

اچھے دوست تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناحؒ نے اقبالؒ کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہیں کیا اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔ (ص ۹۹)

جناحؒ انگلستان گیا تھا تو اس نیشنلزم کا پرستار جس کی شہادت آج بھی بمبئی میں ”جناح کانگریس ہال“ دے رہا ہے۔ اور واپس آیا تو اقبالؒ کا یہ پیغام دہراتا ہوا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمیعت کا ہے ملک و نسب بدل چکا
وقتِ مذہب سے مستحکم ہے جمیعت کا

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمیعت کہاں

اور جمیعت ہوئی رخصت تو ملت بھی گنتی

قائدِ اعظمؒ نے اسلام کے اس تصورِ قومیت کو کس کس انداز سے پیش کیا، اس کی مثالیں آگے چل کر پیش آئیں گی لیکن میں سب سے پہلے ان کا ایک ایسا فقرہ پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے پوری تفصیل کو اس طرح سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا:-

”پاکستان کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ

اس زمانے کی بات ہے۔ جب یہاں ہندو مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔“

بات کس قدر واضح ہے کہ جب یہاں پہلی بار ایک غیر مسلم، اسلام لے آیا تو اس ملک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آگیا۔ اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے، ایڈورڈس کالج، پٹنہ میں، ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو کہا تھا:-

”ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا

دین، ہمیں ایک ایسا ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔

ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں؟

جدا گز قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شد و مد کے ساتھ ہوئی تھی۔ پٹنہ جواہر لال نہرو نے، آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبہ صدارت میں (مارچ ۱۹۴۷ء میں) کہا تھا کہ

”ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دنیاوی خیال کی گنجائش نہیں۔“
انہوں نے اپنی سولہ عمری میں لکھا تھا :-

”مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من مہرست اور محض پروازِ خیالی ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کئے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔“

جب قائد اعظمؒ نے اس تصورِ قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں (مورچہ ۵، ستمبر ۱۹۴۴ء کو) ایک خط میں لکھا :-

”میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے اباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اودان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے اباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔“
مسٹر گاندھی کا یہ خط یوں سمجھئے کہ قائد اعظمؒ کے اس خط کے جواب میں محتاجس میں انہوں نے، مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ :-

”اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے، نہ شک و شبہ، کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک ایک ہے۔ یہ بہت بڑی مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آبادیہ عمل کرنی ہے، کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح ہے، تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔۔۔ (لہذا، مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں، آج انسانی سعی و کوشش کا دائرہ ایک ناقابل تقسیم وحشت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، سیاسی، معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر رہی نہیں کئے۔ جس مذہب کو نوع انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں ہیں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے اگر مذہب نہ ہو تو انسان

اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں، اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے۔ لیکن مقصود کچھ نہیں ہوتا۔“

(جناب کا خط بنام گاندھی۔ جنوری ۱۹۴۷ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۴۷ء تحریک پاکستان کی تاریخ میں نشان منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں پاکستان کارپوریشن پاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کے خطبہ صدارت میں قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا:-

”میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ”مذہب“ نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیے، ہندو اور مسلمان، مذہب کے ہر معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دونوں الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظام مملکت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو طرحائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا۔ جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔“

اس کے ایک سال بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس، کے خطبہ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا:-

”مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیتہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔“

قائد اعظمؒ نے اس دعویٰ کو اس شد و مد سے ذہرایا کہ اس کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن، مسٹر این، سی دت نے اپنے اپنے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں جو اخبار مدینہ، بننور کی یکم فروری ۱۹۴۷ء کی اشاعت

میں شائع ہوئی تھی، لکھا تھا:

”ان حالات میں، میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندوؤں مسلمان کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناحؒ نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو مراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ، میرے خیال میں، اب نہیں، توکل حقیقت ہو کر رہے گا۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ البتہ اس میں ترمیم و اصلاح کر کے، اسے اپنے حسبِ حال بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔“

اور اس حقیقت کو، بالآخر، ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا۔ اور دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آگیا۔ اس موضوع پر، قائد اعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے اور بھی بہت کچھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چندان ضرورت نہیں۔ انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ تشکیل پاکستان کے بعد بھی وہ کس طرح اس حقیقت کو دہراتے رہے، اسے ذرا آگے چل کر پیش کیا جائے گا۔

میں نے اپنے مقالہ (مندرجہ ذیل) وقت مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں کہا تھا کہ تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کے مخالفین، قائد اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کو ٹرپ کے پتے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قائد اعظمؒ نہ تو اسلامی مملکت کے قائل تھے اور نہ ہی مسلمانوں کی الگ قومیت کے مؤید۔ وہ وطن کی بنیادوں پر متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں (محولہ بالا تقریر کے ضمن میں) اسلامی مملکت کے مسئلہ پر تو دو مباحث سے بحث کی تھی۔ لیکن نظریہ قومیت کے سلسلے میں صرف اتنا کہا تھا کہ اس سے ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ مسلمان اور غیر مسلم ”اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم بن جائیں گے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ غیر مسلم یہاں اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے اور اسی حیثیت سے ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔

غیر مسلم اقلیتیں

انہوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی محولہ بالا تقریر سے قریب ایک ماہ پہلے، ۱۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے، دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ اس میں ان سے جب پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا :-

”میں ان وعدوں میں سے جو میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کئے ہیں، متعرف نہیں ہوں گا۔ میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کہا ہے کہ انہیں پورا پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ میں جو بھی کہتا ہوں اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے اور جو کچھ میں کہہ چکا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اقلیتوں کو خواہ وہ کسی جماعت اور فرقے سے متعلق ہوں بہر طور پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔ ان کو اپنی مذہبی رسومات و عبادت کی پوری آزادی ہوگی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائیگی۔ ان کی جان، ان کے مال اور ان کے تمدن کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انہیں بلا تفریق مذہب و ملت ورنگ ہر صورت میں پاکستان کا باشندہ تصور کیا جائے گا۔“

(بحوالہ نوائے وقت، مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۷۸ء)

آپ نے دیکھا کہ قائد اعظمؒ نے اس میں، پاکستان کے غیر مسلموں کو اقلیتیں کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ان کی ۱۱ اگست کی تقریر سے ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد انہوں نے (اس تقریر کے تین ہی دن بعد) ۱۴ اگست کو مجلس آئین ساز کا افتتاح کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں کہہ دیا تھا کہ

۱۱ اگست کے بعد | مجھے اُمید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے ویسا ہی کشادہ غری اور دھار کا سلوک کیا جائے گا جیسا شہنشاہ اکبرؒ نے کیا تھا۔ قائد اعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن کے اس مشورہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :-

”شہنشاہ اکبرؒ نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسن سلوک کا ثبوت دیا، وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو سال پہلے سے چلا آرہا تھا جب حضورؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کر لینے کے بعد ان سے لفظ ہی نہیں بلکہ عملاً انتہائی رواداری برتی اور ان کے مذہب اور عقائد کو عزت و احترام کی نظروں

سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کے) انہی عظیم انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا اور انہیں پر ہمیں بھی عمل کرنا چاہئے۔“

آپ نے خود فرمایا کہ قائد اعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس ضمن میں آپ اس نکتہ پر بھی خود فرمائیے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جن یہودیوں اور عیسائیوں سے حسن سلوک کا برتاؤ کیا تھا، وہ مسلم قوم کا جزو نہیں بن گئے تھے۔ اسلامی مملکت میں ان کی حیثیت ذمیوں کی تھی۔ یہ حقیقت بجائے خویش اسلامی نقطہ نگاہ سے ”دو قومی نظریہ“ کا تین ثبوت ہے۔

اس کے بعد قائد اعظمؒ قریب ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے۔ جہاں جہاں بھی موقع ملا انہوں نے غیر مسلموں کو ہمیشہ اقلیت کہہ کر پکارا اور انہیں یقین دلایا کہ اُن سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا۔ مثلاً انہوں نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

”ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار اُبھرتا ہے، اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ میں نے جلوت اور ضلوت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں سے حسن سلوک کا ثبوت دینا چاہئے۔ تقسیم ہند کے وقت اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہذا جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی، انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔“

پھر انہوں نے ۳۰ اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

”اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے۔ خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہئے۔ اور ان کے دل میں اس حفاظت کی طرف سے کامل اعتماد پیدا کرنا چاہئے۔ ہمارا یہی رویہ ہمارے لئے باعث عزت اور وقار ہے۔“

۳۔ فروری ۱۹۴۸ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائد اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب

میں انہوں نے فرمایا کہ ”حکومت اس امر کا خاص اہتمام کر رہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے، خوف اور بد اعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کر دے“ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براؤڈ کاسٹ میں کہا:-

”اسلام ہم سے تعاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہل مذہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں۔ جو لوگ بھی یہاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کریں گے ہم ان کے اس تعاون کا گمہ جوشی سے استقبال کریں گے“

انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

”ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانے میں اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور ان کا جتنا خیال رکھا ہے، ہندوستان میں اس کی کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔ پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت ہندوستانی اقلیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا ذمہ ہے اور ہم اس ذمہ داری کو مذہب و ملت کی تمیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے“

اس کے بعد انہوں نے، اسی تقریر کے دوران فرمایا:-

”اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے۔ اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں یہ سکھایا ہے، کہ آپ کچھ بھی ہوں، اول و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں۔ تم نے اپنے لئے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ نہ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی۔ نہ سندھی کی ہے نہ چٹھان کی۔ یہ آپ سب کی ہے۔۔۔۔۔ اس لئے اگر تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبائی تفریق کے خیال کو جھٹک دیجئے۔ صوبائی تفریق ایک لعنت ہے۔ ویسی ہی لعنت جیسی لعنت فرقہ بندی، شیعہ سنی کی تفریق ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا:-

”میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ عوامی کا برتاؤ کریں گے۔“

آپ نے دیکھا کہ اس تقریر کے پہلے اقتباس میں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں ”ایک قوم“ کہا ہے۔ اور دوسرے اقتباس میں، غیر مسلموں کو اقلیتیں۔ فرمائیے کہ ایسا کہنے والا ”دوقومی نظریہ“ کا علمبردار تھا، یا متحدہ قومیت کا؟

انہوں نے ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

”ایک غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جمانے کی بھی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔“

۱۳ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائد اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ :-

”آپ کو معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلا تفریق مذہب و ملت اور بلا لحاظ رنگ و نسل ہر شخص کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کو اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہیئے۔“

آپ نے دیکھا کہ قائد اعظمؒ اس تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیت کہہ کر پکارتے رہے اور انہیں ان کی جان، مال اور عزت، اُبردو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں، اس لئے اب ان میں کسی قسم کی تفریق و تمیز باقی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص نظریہ زندگی کی بنا پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اس براڈ کاسٹ میں جس کی طرف اُدھر اشارہ کیا گیا ہے، کہا کہ :-

”یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہؐ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکمیل ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں وحشت و انداخت کا بڑا گہرا اور خاص

جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات، ہم اپنے نظریات زندگی، نقطہ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں جو قومیت کی تشکیل کا دار بننا ہے؟

آپ نے غور فرمایا کہ قائد اعظمؒ نے قومیت کی تشکیل کے لئے کون کون سے اجزاء کو لایفک قرار دیا؟ کیا یہ وہی نہیں جن کے امتزاج سے مسلم قوم یا امت مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ قائد اعظمؒ نے کہیں بھی یہ کہا تھا کہ ہم (پاکستان) کے مسلم اور غیر مسلم، اشتراک وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن چکے ہیں؟

پھر انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکت پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اس پیغام میں جو ان کی زندگی کا آخری پیغام تھا پاکستان کو "دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ" کہہ کر پکارا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے لے "مسلم سٹیٹ" کہا ہو، اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے، ہر موقع پر، مسلم سٹیٹ ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے ماہرین سیاست سے کہ جو مملکت محض وطنیت کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہو، اُسے کبھی بھی، مسلم سٹیٹ، ہندو سٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جاسکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیت کی بنیاد پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکل ہوئی ہو، اس کی مملکت ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ اس بحث کے سلسلہ میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ :-

”اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رکھے ہیں تو میں مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروا ہوئی۔ لہذا، قائد اعظمؒ کا مملکت پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے قائل نہیں تھے۔“

نئی نسل کی تعلیم

یہ تھے دوقومی نظریہ کے متعلق قائد اعظمؒ کے خیالات۔ میں نے تشکیل پاکستان کے فوری بعد، ملک کے ارباب حل و عقد کی خیمہ نشینی گزارش کیا تھا کہ مذہب (دین) کی بنیادوں پر ایک مملکت اور ایک جگہ گانہ

قومیت کا تصور دنیا میں رائج نظریات سیاست کے خلاف اور انوکھے نظریات ہیں۔ ہم (پرائی نسل کے افراد) تو وہاں سے یہ کچھ پکارتے ہوئے یہاں آگئے ہیں۔ لیکن ہماری نئی نسل کی سمجھ میں یہ بات از خود نہیں آئے گی اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم کا نظام ایسا کیا جائے کہ یہ نظریات علیٰ وجہ البصیرت ان کی زندگی کا جزو بن جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ عام نظریات سیاست سے متاثر ہو کر، سیکولر سٹیٹ اور وطنی قومیت کا قائل ہو جائے گا، اور اس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کی وجہ جواز ہی ختم ہو جائے گی۔ ان حضرات نے میری ان گزارشات پر کوئی توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ کہ یہ زہر ہماری نئی نسل کے دگ پیپے میں سرایت کر گیا۔ ملک میں موجود پاکستان دشمن عناصر اس زہر آلودہ خون کی گہ و شس کو تیز سے تیز کرتے چلے گئے اور اس کا عملی مظاہر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں ہوا۔ تعلیم کی طرف سے ہماری جبرمانہ تداخل شعاری کی وجہ سے وہاں کے طالب علموں کی ذہنیت کیا بن چکی تھی، اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے (اس زمانے کے) ایم اے فائنل کے ایک طالب علم عزیز الرحمن کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو روزنامہ (DAINIC PAKISTAN) کی اشاعت بابت مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا ہے کہ ہم، ہند کی بنیاد پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ :-

”ہم شری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجاسے سنگھ، جیسے اپنی قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسیٰ اور علی رضویوں کو اپنا ہیروز سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا، اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا، یعنی اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر رکھ دئے اور ناگنی، گھاگنی جیسے سیدھے سادھے ناموں کو تیاگ کر دیا۔“

اس کے بعد اس نے لکھا تھا :-

”اب ہمارا رنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے ہندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔“

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب اور وجوہات معلوم کرنے کے لئے ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے رہے۔ لیکن یہ سب بے سود تھا۔ اس کا بنیادی سبب وہ ذہنیت تھی جس کی جھلک عزیز الرحمن کے مندرجہ بالا خط میں صاف نظر آ رہی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد، سقوطِ ڈھاکہ کے جگہ خراش المیہ پر شادیانے بجاتے ہوئے بنگلہ دیش کے اس وقت کے قائم مقام صدر، مسٹر نذر الاسلام نے اعلان فرمایا تھا کہ :-

”ہماری یہ فتح، نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے، ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے سر پھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا دار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل، اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جدا گانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جو دو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں ورنہ جو مشرقی پاکستان کا ہوا ہے، وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا، حقائق کسی کے جھٹلاہوئے چھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔“

مسز اندرا گاندھی

ادھر نذر الاسلام صاحب یہ کہہ رہے تھے اور دوسری طرف (اس زمانہ کی بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اپنی پارلیمان میں جشن ”فتح بنگالہ“ پر ہدیہ تبریک کے جواب میں یہ فرما رہی تھیں کہ :-

”یکامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یکامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ

کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب ۲۵ سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا۔ اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے؟

(سابقہ مشرقی پاکستان) حالیہ بنگلہ دیش میں اس ذہنیت نے ملک کو دو ملت کر دیا۔ رادھر مغربی پاکستان میں اس ذہنیت کی پرورش کے لئے دوسرا انداز اختیار کیا گیا۔ یہاں کہا گیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں۔

قارئین کو شاید یاد ہو کہ ۱۹۶۸ء میں کراچی کی ”عوامی ادبی“ انجمن کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس پر منجملہ دیگر ”دانشوران قوم“ جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا:-

”ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں، ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختار نہ رہتی کہہ سکیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔“

یعنی سیکولر مملکتوں میں تو وطن کی چار دیواری کے اندر بنے والے تمام افراد ایک قوم کہلاتے ہیں۔ یہاں ان حضرات نے اس نظریہ کی ترویج شروع کی کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں بنے والے الگ الگ قوم ہیں۔ یعنی یہ ”ارباب دانش“ سیکولر سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے! رادھر تقسیم ہند کے سب سے شدید مخالف خان عبدالغفار خان بھی اسی قسم کے نظریات عام کرنے میں برابر مصروف ہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں ”ٹائمز آف انڈیا“ کے نمائندہ مسٹر ولیم کمار مکر جی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ”چند سال پہلے کا پاکستان اب مرچکا ہے۔ مغربی پاکستان میں اب چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہوگی۔“ انہوں نے یہ بات کوئی پہلی مرتبہ نہیں کہی۔ وہ جب ۱۹۶۹ء میں کابل سے ہجرت گئے تھے تو انہوں نے وہاں کہا تھا:-

”میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے

لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے۔ جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی، لہذا میں اسے کس طرح تسلیم کر لوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔

(سٹیٹسین ۱۶، اکتوبر ۱۹۶۹ء بحوالہ پاکستان ٹائمز ۳۱/۱۰/۱۹۶۹ء)

اُدھر والد بزرگوار یہ فرما رہے تھے اور ادھر ان کے صاحبزادہ خان عبدالولی خان، یہ اعلان کر رہے تھے:-
”دوقومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیس سال کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ پاکستان غلط تھا۔“

(نوائے وقت - ۱۳، اکتوبر ۱۹۶۲ء)

میں نے پہلے لکھا ہے کہ بنگالی طالب علم، عزیز الرحمن نے اپنے خط میں کہا تھا کہ اب وطن پرستی کی ذہنیت مشرقی پاکستان سے اُگے بڑھ کر سندھ میں سرایت کر رہی ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ ”حریت“ کی اشاعت بابت ۲ نومبر ۱۹۶۸ء میں ایک سندھی طالبہ مس نسیم تھل کا ایک خط چھپا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ:-

”وہ اسلام اور پاکستان، جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے ساوہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجودارو، کوٹ ڈی جان کے آثار قدیمہ، اور لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سیدی کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے۔

(نہ کہ اسلام کی وجہ سے)۔ (طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۶۸ء)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہاں کے ہماری (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اور ان پر مصائب آلام کا جو سلسلہ اب تک جاری ہے، اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سندھ کی ایک اور بڑی غزالہ بلوچ کا ایک خط اخبار ”ڈیلی نیوز“ کراچی کی ۱۹ اگست ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا جس میں اس نے لکھا تھا:-

”اگر مشرقی پاکستان کے بہاری، پاکستانی فرج اور مرکز حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرنے کو وہ آج بڑی پُر مشرت حالت میں ہوتے لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان - ایک پاکستان کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے اور اب اپنی حماقت کی قیمت اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ بہاریوں کی بد قسمتی دراصل اس دن شروع ہوئی تھی جب انہوں نے ۱۹۴۶-۴۷ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر ناپڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے نہایت کے سامنے دو راستے کھلے ہیں یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی ٹیسی قوم کا جزو بن جائیں گے۔“

(طلوع اسلام - اکتوبر ۱۹۴۲ء، صفحہ ۴۳)

وہاں کے نوجوان طبقہ میں یہ ذہنیت از خود پیدا نہیں ہو گئی تھی وہاں کے ”بزرگ سیاستدانوں“ نے جب اپنی گاڑی کا رخ بدلا تو اس سے ساری فضا متاثر ہو گئی۔ سندھ کی ”بزرگ ترین سیاسی شخصیت“ مسٹر جی ایم سید کی تھی۔ وہ مسٹر سید جنہوں نے سب سے پہلے سندھ میں مسلم لیگ کو متعارف کرایا تھا اور بعد میں ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ اوائل ۱۹۴۷ء میں جب ان کی سالگرہ منائی گئی تو اس تقریب پر انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :-

”پاکستان کے موجودہ انتشار، افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے۔ یعنی دو قومی نظریہ، مذہبی نظام حکومت کا تختل، فسطائی نظریہ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی۔“

اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ :-

”۲۴ سالہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے دو قومی نظریہ کو خیر باد کہا جائے، یا پاکستان میں پانچ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قومیں

کو ملکی خود مختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتے سے ایک فیڈریشن بنائی جائے۔“

(المنبر - ۴، فروری ۱۹۴۲ء)

سندھ سے آگے بڑھ کر بلوچستان کی طرف آئیے۔ وہاں کے (اس زمانے میں) وزیر اعلیٰ، سردار عطاء اللہ مینگل نے ۱۹۴۲ء میں کہا تھا کہ :-

”جس دو قومی نظریہ کی اساس پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا وہ خلیج بنگال میں غرق ہو چکا ہے۔“

(نوائے وقت - ۱۸، اکتوبر ۱۹۴۲ء)

اور وہاں کے گورنر میر غوث بخش بزنجنے ملتان کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا :-

”پاکستان میں بننے والی قومیتوں کی تاریخ، جغرافیائی حدود، تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا معاشرہ جدا ہے۔ ہمارا مطالبہ اتنا ہے کہ ان کے نازک احساسات کا خیال رکھا جائے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ پھر پاکستان کو متحد رکھنے کی کیا اساس ہے۔ انہوں نے کہا کہ چار قومیتوں کے مجموعہ سے ایک پاکستانی قوم بنے گی۔ جب ہم آپس میں بات کریں گے تو علیحدہ علیحدہ قومیتوں میں ہوں گے۔ جب کسی غیر ملک سے بات ہوگی تو پاکستانی قوم کی بات ہوگی۔“

(نوائے وقت - ۱۴، اکتوبر ۱۹۴۳ء)

کسی نے ان سے یہ پوچھا کہ جب سارے ملک میں قومیں الگ الگ ہوں گی تو پاکستانی قوم کی بات کون کرے گا؟ میں اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے زیر نظر مقصد کے لئے ہر دست اتنا ہی کافی ہے۔ (میں مزید تفصیل کسی دوسرے وقت پر اٹھائے رکھتا ہوں۔)

اس وقت تک دو قومی نظریے متعلق گفتگو پاکستان کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ لیکن، جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے یہ نظریہ نہ تو تحریک پاکستان کے کسی سیاسی محرک کی تخلیق تھا اور نہ ہی پاکستان یا کسی اور ملک سے وابستہ یا اس تک محدود۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے جو کفر اور اسلام کی تفریق کے ساتھ وابستہ ہے۔ چونکہ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے، اس لئے کوئی اہل ایمان جہاں بھی ہے، وہ عظیم امت

مسلمہ کافرو ہے۔ اور جغرافیائی بُعد اور مسافت اُسے نہ اُس اُمت سے الگ کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسری قوم کا جزو بنا سکتے ہیں، اسلام چھوڑنے کے بعد ہی کسی دوسری قوم کا جزو بن سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جب دو قومی نظریہ کا تصور پیش کیا تھا تو اُسے صرف ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا تھا۔ پاکستان کا اس زمانے میں ابھی تصور تک بھی ذہنوں میں نہیں آیا تھا، انہوں نے اس پیغام کو تمام دنیا کے مسلمانوں تک پھیلایا۔ (مثلاً، انہوں نے ۱۹۲۲ء میں، پہلی جنگ عظیم کے بعد، تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور ترکی کی بالخصوص حالت بڑی سقیم ہو رہی تھی، جملہ عالم اسلام کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ یاد رکھو ہماری نجات و نبروں حالی کا ایک ہی علاج ہے، اور وہ یہ کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لیکر تابناک کاشغر

جو کہ یگانہ امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا ترک خور گا بنی ہو یا ایرانی والا گھر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی

اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گذر

اور اس سے اگلے سال (۱۹۲۳ء میں)، انہوں نے اپنی مشہور نظم، طلوع اسلام میں انہی اقوام کو مخاطب کر کے کہا کہ :

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوب انسا کو اخت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی تو لے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر سیر

تو لے مرغ حرم، اڑنے سے پہلے پریشان ہو جا

وہ عمر بھر اسی طرح وحشت و اُمت کے اس پیغام کو عام کرتے رہے۔ اس لئے کہ وہ حقیقی اسلام کے داعی تھے اور اسلام اور وحدت اُمت لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن مسلمانان عالم، جو حقیقی اسلام کو نظر انداز کر کے دنیا کی دو برتر قوموں کی طرح جغرافیائی حدود میں بٹ کر مختلف قومیں بن چکے تھے، انہوں نے اس پیغام کا کوئی اثر نہ لیا۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اس نظریے کو عملی شکل دینے کے لئے اسے پاکستان کے خطہ زمین تک سمٹایا اور اس کی ابتداء ہندوستانی مسلمانوں سے کی۔ انہوں نے اس خطہ زمین کا تصور ہی اس لئے دیا تھا کہ اس میں اسلام کو اس کی حقیقی شکل میں عملاً نافذ کیا جاسکے۔ اس اعتبار سے اسلام، دو قومی نظریہ، اور پاکستان

ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے تھے۔ پاکستان وجود میں آگیا، لیکن یہ دیکھ کر ناسف ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے کہ اس میں حقیقی اسلام کا احیاء تو ایک طرف، ہم پاکستانی مسلمان بھی ایک اُمت نہیں بن سکے۔ ہم میں صوبائی تقسیم بدستور قائم ہے۔ یہ صوبائی تقسیم نہیں، درحقیقت نسلی تفریق ہے، اور وہ بھی اس قدر گہری کہ ایک ہی نسل کے ایک ہی صوبے میں بسنے والے پاکستانی مسلمان ہندوؤں کی طرح ذاتوں، برادریوں، گوتوں تک میں بٹے ہوئے ہیں اور باہمی تفریق و تقسیم کی گمراہیوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم میں قدرِ مشترک صرف مسلمان کا لفظ ہے۔ اس سے زیادہ اس کا مفہوم کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اگر ہم ... دوقومی نظریہ کے الفاظ دہارتے ہیں تو اس کا عملی نتیجہ تو کچھ نہیں نکل سکے گا۔ لہذا، جہاں ہم ان لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں جو دوقومی نظریہ کے مخالف ہیں، ہمیں ان لوگوں کی بھی اسی طرح مخالفت کرنی چاہئے جو لفظی طور پر تو دوقومی نظریہ کے قائل ہیں، لیکن عملاً ایک اُمت بننے کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے۔ اس وقت مسلمانانِ عالم کے لئے بالعموم اور پاکستانی مسلمانوں کے لئے بالخصوص مقدم ترین مسئلہ وحدتِ اُمت کی تشکیل کا ہے جب تک یہ وحدت قائم نہیں ہوتی نہ مملکتی سطح پر ہمارا کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے، اور نہ ہی بین المملکتی سطح پر۔

والسلام

بروز
۲۱ نومبر ۱۹۸۰ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

احترامِ آدمیت

کس نگر و درجہاں محتاج کس نیکہ ذمہ شرع مبیں، این است ولس!

بتقریب یومِ اقبال اپریل ۱۹۸۱ء

پرویز

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت!

جو حضرات میرے ہفتہ واری درسِ قرآن مجید میں شریک ہوتے ہیں، یا جن کی نگاہوں سے میری تحریریں گزرتی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ میں کس طرح قرآنی حقائق کی نشر و تفسیر، کلامِ اقبالؒ کے کرتا ہوں۔ اس سے جہاں قرآنی معارف و وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں، وہاں خود اقبالؒ کا شعر بھی فلکِ بوس بلند یوں تک جا پہنچتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اقبالؒ کا احسان حدودِ فراموش ہو جاتا ہے۔ عالمگیر انسانیت پر احسان اس اعتبار سے کہ اس وقت اقوامِ عالم جن زہرہ گداز مصائب اور اضطرابِ انجیزِ آلام کا شکار ہو رہی ہیں، اُس نے انہیں ان سے نجات حاصل کرنے کا راستہ بتایا۔ ملتِ اسلامیہ ہندیہ پر اس کا یہ احسان کہ اس نے، ان کے لئے ایک ایسی آزاد مملکت کی نشاندہی کی جس میں وہ اقدارِ خداوندی کے مطابق نظامِ قائم کے صحیح آزادی حاصل کر سکیں۔ اور پھر ان کا احسانِ عظیم اس پیچیدہ پر کہ جس کی قرآنِ فہمی کا طریق فکر اقبالؒ کا رہنما منت ہے۔ یہی ہے احسانِ اقبالؒ کی وہ سرگزشتِ اہمیت جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے میں ایسی تعاریف پر خصوصی خطاب پیش کیا کہ تاہوں جیسا کہ آپ نے اعلان میں دیکھ لیا ہوگا، میرے آج کے خصوصی درس کا موضوع ہے:۔

کس نگر و درجہاں محتاج کس نیکہ ذمہ شرع مبیں، این است ولس!
یعنی اسلام کا مقصود اور شریعتِ قرآنیہ کا منہاں یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج

نہ رہے۔

اقبالؒ نے ان دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں، اسلام کے مقصود و منہیٰ کو سٹاک کر رکھ دیا ہے۔ قرآنِ حکیم کا اعلان ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ۵ (۱۶) اُٹھانے ہر انسان کو، محض انسان ہونے کی جہت سے واجب الشکریم پیدا کیا ہے۔ آپ دیکھئے! اس میں کافر و مومن کی تمیز و تفریق نہیں۔ (یہ تفریق آگے جا کر شروع ہوئی ہے) اس نے ہر انسان کو واجب الشکریم قرار دیا ہے۔ اور یہی (شرف و تحکیم انسانیت) پیغامِ اقبالؒ کا بھی منہیٰ ہے۔

برتر از گمردوں مقامِ آدم است اصل تہذیب، احترامِ آدم است

اس، مقصود و مطلوبِ پیامِ خداوندی کے بعد، اقبالؒ نے بتایا ہے کہ انسان کو اس عزت و تحکیم سے محروم کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس نے (بصیرتِ قرآنی کی روشنی میں) کہا ہے کہ مستبد قوتیں سامانِ رزق کو اپنے قبضے میں لے کر، کمزور انسانوں کو ضروریاتِ زندگی کے لئے ان کا محتاج بنا دیتی ہیں، اور جب وہ ان کا محتاج ہو جاتا ہے تو پھر وہ اسے اپنا محکوم بنا لیتی ہیں۔ قرآنی نظام، رزق کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج ہی نہیں رہتا۔ اور جب وہ کسی انسان کا محتاج نہیں رہتا، تو کسی کا محکوم بھی نہیں بنتا۔ اس (اقبالؒ) نے جنتِ ارضی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ :-

جنتِ ارضی

کس دریں جا، سائل و محروم نیست

عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست !

چونکہ اس میں کوئی بھی اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہوتا، اس لئے اس معاشرہ میں غلام اور اقا، حاکم اور محکوم کی تفریق ہی نہیں ہوتی۔ اقبالؒ نے جو کہا کہ :-

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک تیرے سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوتے

تو وہ اسی جنتِ ارضی کی خصوصیت ہے جو قرآنی نظام سے وجود میں آتی ہے۔

اقبالؒ کے متعلق بنیادی غلط نگہی یہ ہے کہ ہم نے اسے یا تو ایک شاعر سمجھا ہے اور

یا فلاسفر ————— وہم نے اسے جو سب سے بڑا "اعزاز بخشا ہے۔ وہ "شاعر

شاعر نہیں

مشرق کا ہے۔ وہ عمر بھر کہتا رہا کہ بابا! میں شاعر نہیں !

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

بلکہ تنگ آکر یہاں تک بھی کہنے پر مجبور ہو گیا کہ :-
 نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم مثال شاعراں افسانہ بستم
 نہ بینی خمیہ از ازاں مرد فرد دست کہ بر ما تہمت شعرو سخن لبست
 یہ اس لئے کہ :-

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمست نہ خوابید، نہ بیدار
 جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے، اس نے دو لفظوں میں ساری بات کہہ دی کہ فلسفہ
 زندگی سے دوری! اور فلاسفر سے بر ملا کہا کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے برمی ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی
 چنانچہ وہ عمر بھر زمین کے ہنگامے سہل کرنے کی تدابیر سوچتے رہے۔ ان ہنگاموں میں سرفہرست روٹی کا مسئلہ
 ہے۔ جس سے محرومی سے، محتاجی پیدا ہوتی ہے۔ جو شرف و تحکیم انسانیت کو کھل کر رکھ دیتی ہے۔
 یہ مسئلہ کب سے ان کی توجہ کا مرکز بنا، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ یوں تو ہمارا دور، اقتصادیات کا زمانہ
 (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے لیکن ہمارے ہاں اس نے بہت تھوڑے ... عرصہ سے
 اہمیت اختیار کی ہے۔ اقبال کا قلب حساس اور نگہ رُو دریں اس کی منتظر نہیں تھی کہ یہ مسئلہ یہاں اہمیت اختیار
 کرے تو وہ لب کشائی کرے۔ اردو زبان میں اقتصادیات پر سب سے پہلی کتاب ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی اس
 کے مصنف اقبال تھے۔ حالانکہ تعلیم کے زمانے میں اقتصادیات (اکنامکس) ان کا اعلیٰ مضمون بھی نہیں تھا۔ اور
 ان کی عمر بھی تیس بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اتنی سی عمر میں فلسفہ کے اس ...
 طالب علم نے وہ کتاب لکھی جس کے دیباچہ میں کہا :-

”اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سبیل رواں میں، اصول مذہب بھی بے انتہا موثر ثابت
 ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا
 دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور بچکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قوی کو اپنے
 سلچنے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ فرد ان خیال کر دے کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضرورت زندگی کے کامل طور پر
 پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی، قوی انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتا
 ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلات آئینہ کو اس قدر رنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی، اور

تمدنی لحاظ سے اس کا وجود عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلمِ اول، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مذہبِ قرین محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخواس صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلادیئے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحہِ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟ (اقبال، ۷ اور قرآن، ص ۱۷۸)

اس کے بعد یہ نوجوان، مزید تعلیم کے حصول کے لئے یورپ چلا گیا۔ اس زمانے میں یورپ میں، نظامِ سرمایہ داری انتہائی عروج پر تھا۔ یہ نظام کن بنیادوں پر استوار تھا، اس کے متعلق ہیں اس مقام پر صرف ایک اقتباس پر اکتفا کر دوں گا۔ اس نظام کے ایک علمبردار WILLIAM TOWNSEND نے ایک کتاب لکھی تھی:

“DISSERTATION ON THE POOR LAWS” اس میں اس نے کہا تھا:-

”بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور شہنشاہ سے شہنشاہ کو رام کر دیتا ہے۔ اس سے سرکش سے سرکش انسان بھی مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ یعنی بھوک۔ بھوک ہی وہ، جذبہ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔“

(بحوالہ نظامِ ریلوے، ص ۲۲۳)

یورپ میں اقبالؒ نے ان کوڑوں کے خونچکاں زخموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ واپسی پر انہوں نے ۱۹۱۱ء میں، علی گڑھ میں، وہ معرکہ آرا تقریر کی جس کا شہرہ آج تک قائم دوائم ہے۔ (مولانا ظفر علی خان (مرحوم) نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا۔ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر۔ اس میں اقبالؒ نے کہا تھا:-

مسلمانوں کا افلاس

”یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوس ناک اور

قبولِ رحم ہے۔ شہر میں جہاں کی آبادی کا جزو غالب مسلمان ہیں۔ معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اُجرت غلیظ مکان، اور ان کے پیٹ بھر دینی ٹکو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاہور کے کسی اسلامی محلہ میں جانکلو۔ ایک تنگ و تاریک کوچہ پر ہماری نظر پڑے گی۔ جس کے وحشتناک سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ پکاریا کسی پردہ نشین برہمن کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی۔ جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقع میں سے نکل کر خیرات کے لیے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ نوگلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدمہ ہمارا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے۔ جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آج فاقہ کمر رہی ہیں۔ کئی دن سے انارح کا ایک دانہ مک منہ میں اڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خود داری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پساریں۔ ہمارے نوجوان علم برداران اصلاح تمدن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قومی روز افزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں شاید نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمہ دار پردہ نہیں بلکہ یہ جان فرسا افلاس ہے جو ہماری قوم کے ادانی و اخلاقی کو کھائے جا رہا ہے؟ (بحوالہ مضامین اقبالؒ۔ مرتبہ تصدق حسین تاج۔ ص ۱۰۱)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ، ”بھوک سے کراہنے والوں کی دلخراش صداؤں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے“ مصروفِ جہاد رہے۔ اس کا علاج، قرآن کے معاشی نظام کا قیام تھا جس کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور عطا فرمایا تھا۔

علامہ اقبالؒ کے اس جہاد کے تین نمایاں مراحل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ قَلْبِ وقت کے پیش نظر میں ان مراحل پر مختصر انداز سے روشنی ڈال سکیں گے۔

مرحلہ اول۔ محنت کشوں کا مسئلہ

پہلی عالمی جنگ کے بعد، اقوامِ یورپ جس طرح ترقی کے حصے بخرے کر کے، اس کی قوت اور شوکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے درپے تھیں، اس کے احساس سے اقبالؒ کے قلبِ درد آگئیں کی فلک رس صدائیں، اس زہرہ گداز نظم کی صورت میں لہزہ انگیز ہوئی تھیں جس کا عنوان ”خضرِ راہ“ ہے۔ اس کا عمودی موضوع

تو یہ تھا کہ :-

لے گئے تئلیٹ کے فرزند میراثِ خلیلؑ خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز !
لیکن اس میں، اُن اہم مسائل کا حل بھی دربانِ حضرتؑ پیش کیا گیا ہے جن سے اس زمانے میں دنیا وقفِ اضطراب
تھی۔ اس میں ایک اہم ترین مسئلہ ”سرمایہ و محنت“ کا بھی ہے اس کے متعلق اقبالؒ کے سوال کے جواب میں حضرت
کہتا ہے :-

بندۂ مزدور کو جا کہ مرا پیغام دے حضرت کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات !
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حبیلہ گم شاخِ آہو پر رہی صدیوں تک نیرسِ مرگ
دستِ دولتِ آفریں کو مزدوروں ملتی رہی اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکرم کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بنزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

یہ ۲۳-۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ اس کے بعد، پیامِ مشرق کے آخری باب میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز بحث
سامنے آتی ہے۔ لیکن ایک تو وہ بحث عمیق فلسفیانہ ہے اور دوسرے وہ فارسی زبان میں ہے، اس لئے ہم اس
سے صرف نظر کرتے ہوئے، بالِ جبریلؑ تک پہنچ جاتے ہیں، اس میں، دو تین مربوط نظمیں بڑی دلچسپ بھی ہیں
اور معنی خیز بھی۔ اس سلسلہ کی پہلی نظم کا عنوان ہے :-

لیتین _____ خدا کے حضور

جیسا کہ معلوم ہے، مارکسزم کا مشہور لیڈر اور مفکر، لینن، خدا، وحی، آخرت، سب کا منکر تھا۔ اس کا خدا
کے حضور ”نظرِ نابِرا“ تعجب انگیز سا ہے۔ لیکن وہ اپنے سوال تک پہنچنے سے پہلے، اس معتمہ کو خود ہی حل کر
دیتا ہے جب کہتا ہے کہ جو گتھی فلسفہ نہیں سلجھا سکا تھا، اسے عینی مشاہدہ نے حل کر دیا۔ تو (خدا) میرے سامنے
ہے اس لئے تیرے وجود سے اب کیسے انکار کیا جاسکتا ہے؟ اس تمہید کے بعد وہ کہتا ہے :-

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پھچوں حل کرنے سکے جس کو حکیموں کے مکالات
جب تک میں جیا خیمہ افلاک کے نیچے کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کے اس اسلوب بیان میں، وہ لئین کس طرح چلمنی انداز سے سامنے آ رہا ہے جو زندگی بھر خدا کا منکر ہی نہیں، انتہائی درجہ کا سرکش تھا، ادبِ خدا سے مخاطب! اس کی (سابقہ) خوں سرکشی، روح میں سلاطین برپا کر رہی ہے، لیکن احترامِ خداوندی، دل کی بات بیباکانہ زبان تک آنے کے راستے میں حائل ہے۔ پتا، صلیق تک آئی ہے، پھر لوٹ جاتی ہے جھجکتے اور لرزتے ہوئے، بصد توقف و تامل، اسے پھر نوکِ زبان تک لانے کی کوشش (بلکہ جرأت) کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی تامل اور اضطراب تھا جس سے تنگ آنکر ایک وقفِ طلسمِ پیچ و تاب نے کہا تھا کہ :-

از سینہ تا بچشہ بر آرم، فسرد و بیم اس نیم قطرہ خوں کہ ز شرگاں چکید فی است
اب سینے وہ بات جسے لئین اس صبر آزما توقف کے بعد زبان تک لایا۔ کہا کہ میں جانتا ہوں کہ ”تو خالقِ اعصار و نگارندہٴ آفات“ ہے، لیکن میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ :-

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ وہ آدم خالی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟
یہ پوچھنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ :-

مشرق کے خداوند، سفیدانِ فرنگی مغرب کے خداوند، خشنودِ قلندر!
مشرق میں، سفید فام مغربی اقوام کی پرستش ہوتی ہے۔ اور مغربی اقوام چاندی سونے (دولت) کی پرستار ہیں۔ ان دونوں کے خدا تو یہ ہیں! میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کون سے آدم کے خدا ہیں؟
آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کا بتیانِ حقیقت کا انداز کس قدر بلیغ اور حسین ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس وقت خدا کی حکمرانی دنیا میں کہیں بھی نہیں، اس لئے لئین کا یہ سوال بالکل فطری ہے، اور ایسا جس کا جواب کوئی نہیں بن پڑ سکتا۔ کہ وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ - ہم پر تو منکرینِ خدا ہوئے کا الزام دھر دیا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ خدا کے مومن کون ہیں، اور وہ کس دنیا میں جیتے ہیں؟

اقبالؒ نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ :- ”دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری — اور یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری — وہ نہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، نہ دوسروں کو یہ کہہ کر فریب میں رکھنا چاہتا ہے کہ دنیا میں فوتے کہ وڑ مومن جیتے ہیں۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ :-

تیرے محیط میں کہیں، گوہرِ زندگی نہیں ڈھونڈ چکا میں موزِ موزِ دیکھ چکا صدقہ
اس میں نہ مشرق کی استثناء ہے نہ مغرب کی تمیز!

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی
لیکن کہتا ہے کہ اہل مشرق جن (مغربی) خداؤں کو پوجتے ہیں، ان کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ :-
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبیر، یہ حکومت پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مسادا
اس کے بعد وہ اپنے ترکش سے ایک اور تیر نکالتا ہے، اور کہتا ہے کہ :-

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقا
دیئے اخلاق کا ایک قدیم معرہ ہے جسے ذہن انسانی آج تک حل نہیں کر سکا۔ معرہ یہ ہے کہ :-
اگر خدا حیر ہے، تو دنیا میں شرکا وجود کیوں ہے ؟

اگر شرکا وجود، اس کی مرضی سے ہے تو وہ خمیر نہیں :-

اور اگر شرکا وجود اس کی مرضی کے خلاف ہے تو وہ قادر مطلق نہیں۔

لیکن نے خدا سے کہا ہے کہ ترا دعویٰ ہے کہ تو عادل بھی ہے اور قادر بھی۔

عدل کا تقاضا ہے کہ بندہ مزدور کو اس کی محنت کا حاصل ملے۔ لیکن وہ نہیں مل رہا اور بندہ مزدور کے اوقا
سخت تلخ ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ خدا عادل تو ہے لیکن اس کے فیصلے عملاً نافذ نہیں ہوتے۔

اس کے یہ معنی ہونے کہ وہ قادر نہیں۔ JUDICIARY تو اس کے پاس ہے لیکن EXECUTIVE
اس کے پاس نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس کے عادل ہونے کا فائدہ کیا ہے !

اور اس کے بعد وہ اس نہایت پیچیدہ سوال کا جواب خود ہی دیتا ہے کہ میں ماننا ہوں کہ تو عادل بھی
ہے اور قادر بھی۔ لیکن تیر قانون یہ ہے کہ انسان کے عمل اور اس کے نتائج کے محسوس طور پر سامنے آنے میں
مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ اور یہ خود تقاضا عدل ہے، جس طرح دنیاوی قانون کی مو سے بھی حاملہ عورت کی سزا
موت، وضع حمل تک ملتوی کر دی جاتی ہے۔ اس قانون مہلت کی مو سے وہ پوچھتا ہے کہ :-

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟ دنیا ہے تری منظر یوم مکافات !

یہ نہیں کہ مجھے یقین نہیں کہ سرمایہ داری کا سفینہ ڈوبے گا یا نہیں۔ سوال صرف "کب" کا ہے۔ یہ کب ڈوبے گا؟ تیری
دنیا اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہی ہے ! اس لئے آپ ذرا جلدی کریں۔

"کب" کا یہ سوال فرشتوں کے دل میں بھی پھیل رہا ہے جس کا تذکرہ اگلی نظم میں سامنے لایا گیا ہے۔ اس کا عنوان

فرشتوں کا گیت

ہے ”فرشتوں کا گیت“۔

قرآن مجید نے قصہ آدم، اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کسی خاص شخص (آدم) یا ایک جوڑے (آدم اور حوا) کا تذکرہ نہیں۔ وہ خود آدمی کی داستانِ حیات ہے۔ وہ تاریخِ انسانیت کا تمثیلی بیان ہے۔ اس تمثیل میں یوں سمجھئے گویا ایک مجلس میں خدا اور اس کے فرشتے بیٹھے ہیں اور بات اس مخلوق کی ہو رہی ہے جسے دنیا میں صاحبِ اقتدار بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِیْہِ الْاٰمَرٰتِیْنَ خَلِیْفَۃً ۙ... ملائکہ جب اس ہیولی آب و گل پر گہری نگاہ ڈالتے ہیں تو انہیں اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چمکاریاں نظر آتی ہیں۔ وہ عرض کرتے ہیں اَتَجْعَلُ فِیْہَا مَنْ یُّضِلُّ فِیْہَا وَیُسِفُّ الْبَدْمَآءَ ۚ بار الہا! اجراتِ معاف ہو تو ہم عرض کریں کہ کیا تو کوئی ارض کو ایسی مخلوق کے حوالے کر دینا چاہتا ہے جو وہاں خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں کرے گی؟ جواب ملا اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱/۲) گہراؤ نہیں! ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔

اس پر فرشتے خاموش ہو گئے اور نہایت گہری نظروں سے تاریخِ انسانیت کا مطالعہ، بلکہ مشاہدہ کرتے رہے۔ جو کچھ وہ دیکھتے اس پر بڑے ضبط اور صبر سے کام لیتے۔ لیکن ضبط کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ ہمارے دور میں پہنچ کر، جب انہوں نے آدم کی عالمگیر سفاکیوں اور نبا کاریوں کو دیکھا تو ان سے نہ رہا گیا، اور ایک دن بارگاہِ خداوندی میں لب کشائی کی جرأت کر ہی لی۔

لیکن ملائکہ کی جرأت لب کشائی اور لیتن کے استفسار میں بڑا فرق تھا۔ لیتن نے بھی ادب و احترام کو ملحوظ رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے حرفِ تمنا میں، طعن و تشنیع کا کھلا ہوا نشتر نہ سہی، چھپی ہوئی پھانس ضرور تھی۔ ملائکہ کی عرض داشت کا اندازہ کچھ اور تھا۔ انہوں نے کہا۔۔۔۔۔

غفل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی نقش گرازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی

اس ”ابھی“ میں گہری حقیقتیں سرسبز ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ”کیوں؟ کیا وہی نہیں ہوا، جو ہم کہتے تھے؟ کیا آدم ویسا ہی نہیں نکلا جیسا ہم نے اندازہ لگایا تھا؟“ انہوں نے کہا یہ۔۔۔۔۔ کہ ہمیں اس کا تو یقین ہے کہ آدم ویسا ہی ہوگا جیسا آپ کی مشیت میں تھا، لیکن ابھی تک یہ اس معیار پر پورا نہیں اُترا۔ ابھی یہ نقش نا تمام ہے۔

ارتقائی منازل

اور اس میں عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ یہ کائنات اور انسان، پہلے ہی دل اپنی مکمل شکل میں وجود پذیر نہیں ہو گئے تھے۔ یہ ابتدائی بیہولی کی صورت میں تخلیق کئے گئے تھے۔ اس کے بعد انہیں ہزار ہا ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد اس منہی تک پہنچنا تھا جو ان کا مقصد تھا۔ قرآن مجید میں اس سلسلہ ارتقاء کے شواہد موجود ہیں اور کلام اقبالؒ میں اس کی بکثرت تفصیلات ذرا ان دو قطعہ بند شعروں کو دیکھئے۔

کیکے در معنی آدم نگر، از من پر می پڑسی؟ ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود این پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزدان داد دل از تاثیر او، پرخوش شود روزے!
یہ پیکر آب و گل ہنوز ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اسے تکمیل تک پہنچنے دو، پھر دیکھنا کہ یہ کیا بنتا ہے۔
مہ دستارہ سے اگے مقام ہے جس کا وہ مشت خاک ابھی آوارگان راہ میں ہے
ان حقائق کی روشنی میں دیکھئے کہ ملائکہ کی "ابھی" میں کتنے راز سر بستہ تھے! انہوں نے عرض کیا تھا کہ بار الہا!۔
عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام آگیا نقش گہرازل ترا نقش ہے نامم ابھی
عقل حیلہ جو کی اس بے زمامی، عشق انسانیت ساز کی اس بے مقامی، اور آدم کی نامحاشی کا نتیجہ یہ ہے کہ۔
خلق خدا کی گھات میں زند و فقیہ میر و پیر تیرے جہاں میں ہے وہی گہر دش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست بندہ ہے کوہِ گہرا ابھی، خواہ بلند بام ابھی

دانش و دین و علم و فن، بسندگی ہوں تمام

عشق گہرا کشائے کافیض نہیں ہے عام ابھی

جو ہر زندگی ہے عشق، جو ہر عشق ہے خودی

آہ کہ ہے یہ تیغ تیز، پردگی نیام ابھی! (بال جبریل ص ۱۴۸)

ملائکہ کی اس عرضداشت میں اتنا ہی نہیں کہا گیا کہ آدم کی ناکامی کا نتیجہ یہ ہے کہ فساد انگیزوں اور خونریزوں کی ایسی قوتیں ساری دنیا میں برہنہ رقص کر رہی ہیں۔ انہوں نے ضمانت یہ بھی کہہ دیا کہ جب آدم تکمیل تک پہنچ گیا تو ان میں سے کوئی قوت بھی باقی نہیں رہے گی۔ انہوں نے بھی زیر لب یہی کہا تھا کہ بار الہا! اس میں اس قدر

تاخیر کریں ہو رہی ہے۔ ۹ ح

ملائکہ کی اس عجلت پسندی کے جواب میں، اگلی نظم میں، جس کا عنوان ہے، ”فرمانِ خدا (فرشتوں سے) ایک اور بسیط حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ وہ نظم ہے جس کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے سے بڑی تخریب انگیز غلط فہمیاں پیدا ہوتی (یا پیدا کی جاتی) ہیں، اور ہمارے تشدد پسند کمیونسٹ کو اس شعر کو گلی گلی، کوپے کوپے، گاتے پھرتے اور کہتے ہیں کہ دیکھو! خدا خود ”جلاؤ، گھیراؤ“ کے طریق کی تاکید کرتا، بلکہ فرشتوں کو ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے اور اقبالؒ اس پیغام کو عام کرتا ہے کہ :- جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں رہی اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو اصل حقیقت کچا ہے۔

خدا کے کائناتی اوتقاء کے پروگرام کی رفتار (سہا حساب و شمار کی دوس) بڑی سست ہوتی ہے۔ اس میں ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ ”وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ“ بلکہ سچا سچا ہزار سال کا اٹھ اگر اس پروگرام میں انسان کے دست و بازو بھی شریک ہو جائیں، تو پھر یہ مدت انسانوں کے حساب و شمار کے دنوں میں سمٹ آتی ہے۔ انسانی دنیا میں اس قسم کا انقلاب جماعتِ مومنین کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے۔ اس کا طریق کا دیر ہے کہ لوگوں کے قلب و دماغ میں انقلاب پیدا کیا جاتا ہے اور دنیا کے اس انقلاب سے، قوم میں تعمیری انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ یہ طریق کار خود خدا کا متعین فرمودہ ہے۔ ”إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا أَسَاطِنَهُمْ“ (۱۱۱) خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ اپنی ذہنیت میں (نفسیاتی) تبدیلی نہ پیدا کر لے۔ اس طریق انقلاب میں کسی قسم کی تخریب نہیں ہوتی، تباہی نہیں ہوتی، فساد نہیں ہوتا، خونریزی نہیں ہوتی۔

لیکن اگر انسانوں کی ایسی جماعت کھڑی نہ ہو۔ اور دوسری طرف، سلب و ہنب کی خون آشام قوتیں ضرر فراموش ہوتی چلی جائیں، تو پھر مظلوم و محتاج عوام، تنگ آکر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اوز پھرے ہوئے سیلاب

ح بالِ جبریلؑ ہجکا اس شعر کو دیکھئے : ۷

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا کہ پیدائی تری اب تک حجابِ آمیز ہے ساتی اور جس پیش و خلش اور سوز و گداز کی یہ فغانِ سحری تخلیق ہے، اس کا اندازہ لگائیے !

کی طرح ہر اس چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے ہیں جو ان کی لپیٹ میں آجائے۔ وہ سیلاب نہ مسجد و مندر میں تمیز کرتا ہے، نہ ظالم اور مظلوم میں تفریق۔ ان کے جنوں خیز پروگرام میں، تخریب ہی تخریب ہوتی ہے تعمیر نہیں ہوتی یہ انقلاب نہیں ہوتا، فساد ہوتا ہے۔ عام اصطلاح میں اسے زمانے کے نکلنے کہا جاتا ہے اور قرآن کی اصطلاح میں ”عذاب لانے والے ملائکہ“ ہمارے زمانے میں اس قسم کا وسیع پیمانے پر ”فساد“ دوس میں برپا ہو چکا ہے اقبالؒ نے (یوں کہنے لگیا) اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی نگہ حقیقت بین و دور رس نے دیکھا کہ اس پروگرام میں لا ہی لا یعنی تخریب ہی تخریب ہے۔ اَلَا دُشِبْتَ یا تعمیر! کاشائے تک نہیں۔

کہ وہ ام اندر مقامات شش نگہ
لا سلاطین، لا کلیسا، لا لالہ

(پس پھر باید کرد)

میں نے ان کے پروگرام کی مختلف کڑیوں پر غور کیا ہے۔ وہ ظلم و استبداد کی حکمتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ قومیں، مذہبی پیشوائیت کے سہارے مصروفِ جو رستم رہتی ہیں۔ اس لئے وہ مذہب کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں، لیکن ان کا جوشِ جنون یہیں تک نہیں رہتا۔ آگے بڑھتا ہے۔ وہ خود خدا کی ہستی کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اس انکار کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے ضوابطِ اخلاق و اقدار کو مسترد کر دیا ہے۔ لیکن کے الفاظ میں، جو اس نے ۱۹۲۰ء میں، یوتھ کیونسٹ لیگ کی تیسری کانفرنس میں، نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے:-

”ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت سرچشمہ (یعنی وحی خداوندی) یا طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم علانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے۔ یہ تصور زمینداری اور سرمایہ داری کے مفاد کے تحفظ کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطہ اخلاق احکام خداوندی پر مبنی ہے۔ ہم خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں۔۔۔۔۔ ہم کسی ایدھی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔“

(بحوالہ: نظامِ ریورٹیت - ص ۳۳)

یہ ٹھیک ہے کہ اخلاق کا جو ضابطہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے، وہ نظامِ ملوکیت اور سرمایہ داری کے مفاد کے تحفظ کی ضمانت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ لیکن اسے مسترد کرتے ہوئے، خداوند مستقل اقدار سے انکار کر دینا، شدتِ جنون کا نتیجہ ہے۔ جب اخلاق و اقدار کے وجود سے انکار کر دیا جائے تو پھر معاشرہ میں تبدیلی

لانے کے لئے، تشدد اور طوارق کے سوا کون سا طریق رہ جاتا ہے؟ لیکن نے، انجیل کے ایک مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ :-

” انقلاب، ایک ایسا عمل ہے جس کی رُو سے آبادی کا ایک حصہ، دوسرے حصہ پر اپنا اختیار اور تسلط، قوت و استبداد، نوکِ شمشیر و گولیوں کی بوچھاڑ اور انشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی قائم کرتا ہے۔“
(نظامِ ربوبیت - ص ۳۳)

روس کا یہی وہ لاکھ پروگرام تھا جس کے نتائج و عواقب سے متنبہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے اس ت کہا تھا کہ، یاد رکھو ! :-

در مقامِ لائیاں ساید حیات سوئے الٰہی خرامد کائنات
لادِ آلا برگ دسا ز افشاں نفی بے اثبات، مرگِ لُٹاں

اس کے بعد کہا :-

ایک می خواہی نظامِ عالمی جہتِ اودا، اساسِ محکمہ؟
یہ اساسِ محکمہ کہاں سے ملے گی ؟ فرمایا
داستانِ کہنہ شمسِ باب باب فکر را روشنی کن از اُم الکتاب

(اقبالؒ اور قرآن ص ۱۸۸)

ان تصریحات کی روشنی میں کیا آپ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا تصور کر سکتے ہیں کہ اقبالؒ کیونرم کا حامی اور اس کے ”جلاؤ گھیراؤ“ کے تشدد و آمیز طریق کار کا مؤید تھا؟ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے کہ شمس الدین حسن نامی ایک کمیونسٹ نے اپنے ایک مضمون میں لکھ دیا کہ ”اقبالؒ ایک اشتراکی ہی نہیں، بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ ہیں۔“ علامہ اقبالؒ نے ایک دن کے بھی توقف کے بغیر، ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ زمیندار میں حسبِ ذیل خط شائع کرادیا۔

(۱) میرے افکار کو یا شورم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ بالٹویک خیالات رکھنا سیرِ نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔

(۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔

روسی بالشوزم، یورپ کی ناقابل اندیشی اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست رد عمل ہے۔ لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم، دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہمیں بتائی ہے۔“

(انفال اور قرآن - ص ۱۹)

اس کے بعد آپ اس نظم کی طرف آئے جس کے صیغہ مفہوم کے سمجھنے کے لئے اس طواری تمہید کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس نظم میں درحقیقت، عالمگیر انسانیت کو متنبہ (WARN) کیا گیا ہے کہ اگر تم نے مستبد قوتوں کی درازدستیوں کو نہ روکا، تو زمانے کے تقاضے، ایسا سیلاب بلا بن کر اٹھیں گے جس کے سامنے انسانیت کی کوئی منار حیات بھی ٹھہر نہیں سکے گی۔ یہ وارننگ قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے ان الفاظ میں دی تھی کہ :-

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۖ

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ (۲۵)

”اس فتنہ سے بچنے کی کوئی حفاظتی تدبیر نہ کرو، کہ جب وہ آئے تو اپنے آپ کو ظالموں تک ہی محدود نہیں رکھا کرتا۔ وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کا قانون مکافات، بڑی قوتوں کا مالک بھی ہے اور مجرموں کا پھینکا کرنے میں انتھک بھی۔“

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

خدا کے اس جلالی قانون مکافات کی تشبیہ حضورؐ نے ایک نہایت دلنشین مثال کی رو سے فرمائی۔ ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا :-

”کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے۔ کچھ نیچے کے حصے میں۔ جو نیچے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے۔ اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا :-

”بہت اچھا، ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر اس اقدام سے نہ روکا گیا تو ظاہر ہے کہ اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر روک دیا گیا تو سب بچ جائیں گے۔“

(ترمذی - جلد دوم - باب الفتن)

یہ نتیجہ ہوتا ہے اس طوفان کا جو زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہونے والے، عوام کے ہاتھوں برباد ہوتا ہے اور جس کی شعلہ فشا نیوں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا۔
ان تشریحات کی روشنی میں اس نظم کو دیکھئے جس کا مفہوم سمجھنے میں نہیں سمجھتا ہوں، اب آپ کو کوئی وقت نہیں ہوگی۔ نظم کا عنوان ہے۔

فرمانِ خدا - فرشتوں سے

اٹھو! میری دنیوں کے عزیزوں کو جگادو
کہ ماؤ عزیز ہوں کالہو سوزِ یقیں سے
سلطانی جمہور کا آنا سے زمانہ
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی
کیوں خالق و مخلوق میں حائل ہیں پردے
حق را بسجود، ضماں را بطول فتنے
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
کاخِ اُمراء کے درو دیار ہلا دو!
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جو نقص کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو
پیرانِ کلیسا کو، کلیسا سے اٹھا دو
بہتر ہے چراغِ حرم و دیرِ کعبہ دو
میرے لیے مٹی کا حرم اور بسا دو

تہذیبِ نومی کا رگہ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

یوں تو اقبال کا پیغام پوری نوعِ انسان کے لئے تھا لیکن اس کی اولین مخاطب، ملتِ اسلامیہ (مسلمانوں) کی قوم تھی جو، ملکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، تینوں کی صیدِ زبوں تھی۔ یہ موضوع ایک مستقل تصنیف کا مستحق ہے اور میں نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ اس مظلوم و مقہور قوم سے کہتے ہیں:۔
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیرِ
اے کشتہ سلطانی و ملائی و سپری (جاوید نام)

حط ایک مشہور شعر ہے:۔

دنہا دناں قوم نہ باشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بدردے!

حط ضربِ کلیم میں ہے:۔

اے شیخ! امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محرابِ شورشِ ابرو

کس نگر در جہاں

اقبالؔ نے ملائی دپیری کے خلاف جو کچھ کہا ہے، اسے تو سر دست چھوڑ دینے۔ اس نے سلطانی (ملوکیت یا شہنشاہیت) کے خلاف جو بات کہی ہے، میری نظر سے اس کی مثال کہیں نہیں گزری۔ ہمارا آج کا موضوع "محتاجی" ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ اور لوگ تو، کم دبیش، کسی نہ کسی محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن بادشاہ (سربراہ مملکت) کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ سب اس کے محتاج ہوتے ہیں۔ اقبالؔ

گدائے بے حیا

کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ وہ سب سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس نکتہ کی تائید میں اقبالؔ کے دلائل تک پہنچیں، اصولی طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ محتاج کسے کہتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جو شخص اپنی محنت سے رزق حاصل کرتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا (یہ اور بات ہے کہ اس کا رزق چھین کر اسے محتاج بنادیا جائے) محتاج وہ ہوتا ہے جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرے۔ محتاج کی اس DEFINITION کے بعد، جس کے حقیقت ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا، بال جبریلؑ کی اس نظم کو سنئے جس کا عنوان ہے، گدائی — سنئے، اور محو حیرت رہ جائیے کہ ہم کیا سن رہے ہیں، محو حیرت ہی نہیں بلکہ قدرے محبوب بھی کہ ایسی بدیہی بات، اس سے پہلے ہماری سمجھ میں کیوں نہ آئی! جس قدر اس کا موضوع اٹوٹا ہے اسی قدر اس کا انداز بیان بھی شوخ ہے۔ فرماتے ہیں :-

ہے ہمارے شہر کا دالی گدائے بے حیا

میکدے میں ایک دن اک زند زبیر لکھا

ذرا دیکھو کہ :-

کس کی عربیاتی نے بخشی ہے اسے زریں قبا
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیا
دینے والا کون ہے؟ مرد غریب بے نوا!
کوئی مانے یا نہ مانے، میر و سلطان سب گدا

تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی اسے؟
اس کے آب لالہ گوں کی خون بہا لے کشید
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
مانگے والا گدا ہے! صدقہ مانگے یا خراج

ایک غزل میں وہ بانداز دگر اسی خیال کو پیش کرتے ہیں، جہاں کہتے ہیں :-

خراج کی جو گدا ہو، وہ قیصری کیا ہے!

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے!

ط بال جبریلؑ میں، نظم کے آخر میں لکھا ہے (ماخوذ از انوری) لیکن اقبالؔ نے دیکھنے متعدد مقامات پر بھی اس موضوع کو پیش کیا ہے۔

ایک اور شعر : ہے

کے نہیں ہے تمنائے سروری، لسیکن خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے !
خودی کی موت اسی گداگری سے واقع ہوتی ہے۔ اس باب میں ، وہ ہمہ قدیم کی ملکیت اور عصر حاضر کی جمہوریت ، دونوں کو ہم سنگ قرار دیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ ہے

جلس ملت ہو یا پردینہ کا دربار ہو ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی یہ ہو جس کی نظر
گداگری سے خودی کی موت واقع ہوتی ہے ، اور خودی کی موت کے بعد ، کمینگی کی زندگی ۔ بال جبریل ہی میں علامہؒ
نے اس نکتہ کو بڑے دلاویز انداز میں پیش کیا ہے ۔ فرماتے ہیں : ہے

اک مفلس خود داریہ کہتا تھا خلد سے میں کہ نہیں سکتا کلمہ درد فقیری !
لسیکن یہ بتا ، تیری اجازت سے فرشتے کہتے ہیں عطا مرو فرومایہ کو میری ؟

مرو فرومایہ اس لئے کہ ————— خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے ؟
ان مقامات میں تو اقبالؒ نے ان والیان مملکت کو گداگر کہا ہے ۔ ضربِ کلیم کی ایک
نظم میں وہ انہیں ڈاکو کہہ کر پکارتا ہے ۔ سکندر کے سامنے ایک بحری قزاق ، مجرم
کی حیثیت سے پیش ہوتا ہے ۔ سکندر اس سے کہتا ہے : ہے

صلہ تیرا ، تیری زنجیر یا شمشیر میری کہ تیری رہزنی سے تنگ ، دریا کی پہنائی !
قزاق جواب دیتا ہے : ہے

سکندر ! حیف تو اسکو چو انردی سمجھتا گوارا اس طرح کہنے میں ہم چشموں کی رسوائی ؟
تیرا پیشہ ہے سفاکی ، مرا پیشہ ہے سخاکی کہ ہم قزاق ہیں دونوں ، تو میدانی میں دریائی
کوئی مانے یا زمانے ، میر و سلطان سب گدا !

اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جسے سامنے لائے بغیر ، آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا ۔ سوال یہ
پیدا ہوتا ہے کہ مملکت تو قرآن بھی قائم کرتا ہے ۔ اس مملکت کا سربراہ بھی ہوتا ہے ۔ اس سربراہ کو اپنے گنہگار
کے لئے بہر حال ، مملکت کی آمدنی سے کچھ لینا پڑتا ہے جو دوسروں کی محنت سے حاصل ہوتی ہے ۔ تو کیا اسے بھی
”گدا“ کہا جائے گا ؟

آپ ان سربراہانِ مملکت کی زندگی کو سامنے لائیے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ انہیں کیا کہا جائیگا؟

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، منصبِ خلافت پر سرفراز ہونے سے پہلے، کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور خاصے مرقہ الحال تھے۔ خلیفہ منتخب ہونے کے دوسرے دن حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ وہ کپڑے کا گٹھا اٹھائے بازار کی طرف جا رہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کدھر جا رہے ہیں؟ جواب دیا کہ اپنے کام پر۔ انہوں نے کہا کہ خلافت کی ذمہ داریاں قبول کر لینے کے بعد، آپ کا وقت آپ کا نہیں رہا، ملت کا ہو گیا ہے۔ اس لئے آپ اسے ذاتی کام کے لئے صرف نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا نہ کروں گا تو کھاؤں گا کہاں سے؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس کا انتظام کرنا اُمت کے ذمے ہے۔ چنانچہ سوال درپیش ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ، یعنی حقِ خدمت کیا ہونا چاہیے؟ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے کہا کہ اسے میں خود اپنے لئے مقرر کروں گا۔ چنانچہ آپ نے معلوم کیا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی یومیہ اجرت کیا ہے! اس کے مطابق آپ نے اپنا وظیفہ مقرر کیا۔ دوسری روایات میں ہے کہ اسے دیگر صحابہؓ نے مقرر کیا تھا اور معیار تھا کہ قریش کے معمولی فرد کا انداز زندگی۔ کچھ بھی تھا۔ جب آپؐ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپؐ نے اپنے اہل بیت سے کہا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے مسلمانوں کے بیت المال میں سے لیا ہے اس کے مطابق ان کی خدمت بھی کدسکا ہوں یا نہیں۔ اس کے متعلق قیامت میں باز پرس ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا حساب یہیں چکا دیا جائے۔ ایک مختصر سا قطعہ زمین میرے پاس ہے۔ اسے فروخت کر دیا جائے اور جس قدر رقم میں نے بیت المال سے لی ہے اسے واپس کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے لئے جو وظیفہ مقرر کیا تھا، وہ یہ تھا:-

”کپڑوں کے دو جرطے، ایک سردی کا ایک گرمی کا، حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں جو ان کا حال سو میرا حال“

اس اجرت کے عوض کام کتنا؟ بانیں لاکھ مزاج میل پہ پھیلی ہوئی مملکت، نظم و نسق۔ ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم۔۔۔ کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ پالان پر سوار تیز تیز جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا، امیر المؤمنین! کدھر؟ کہنے لگے بیت المال کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے، اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔

حضرت علیؓ نے کہا کہ آپ نے کسی اور سے کیوں نہ کہہ دیا کہ وہ اس اونٹ کو تلاش کرے۔ آپ نے کہا کہ بخدا! یہ تو ایک اونٹ ہے۔ اگر بیت المال کی ایک بھری بھی کہیں گم ہوگئی تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی!

امیر المؤمنین، دن بھر اس قسم کے فرائض سرانجام دیتے تھے، اور راتوں کو گشت کرتے تھے تاکہ رعایا کا حال براہ راست معلوم کیا جائے اور ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے میں توقف یا تاخیر نہ ہو۔ یہ اسی قسم کی گشت کا واقعہ ہے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک خیمہ میں ایک عورت کچھ پکار رہی ہے اور دو مین پتے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ آپ کے استفسار پر اس نے کہا کہ کئی وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہنڈیا میں پانی ڈال کر چلے پر چڑھا رکھا ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ حضرت عمرؓ اُٹھے۔ بیت المال سے اُٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اپنے خادم، اسلم سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔ اسلم نے کہا کہ مجھے دے دیجئے۔ میں لے جاتا ہوں۔ فرمایا: اسلم! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے۔ اور قیامت میں تم میرا وجہ نہیں اٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اٹھانے لے جانے دو۔ (شاہکار رسالت ص ۱۳)

”اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے اور قیامت میں ہر ایک کو اپنا اپنا بوجھ آپ اٹھانا پڑے گا۔“ یہ تھیں وہ خدمات جو یہ سربراہانِ مملکت سرانجام دیتے تھے۔ ان خدمات کی اجرت میں جو کھانا منظور کر لیا تھا، اس کی نوعیت یہ تھی کہ ایک دن مصر کا گورنر ملے کے لئے آیا تو آپ کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جو کی روٹی، زیتون کا تیل اور موٹا ایسا ہوائی تھا اس نے کہا کہ امیر المؤمنین! آپ گیارہوں کے اُٹے کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے کہا کہ تم بتاؤ کہ کیا اس وقت ہماری مملکت میں ہر شخص کو گیارہوں کی روٹی مل رہی ہے؟ اس نے کہا کہ ایسا تو میں نہیں کہہ سکتا! اس پر آپؐ نے فرمایا:-

”عمرؓ کو اس وقت اس کا یقین ہے کہ مملکت میں ہر شخص کو کم از کم جو کی روٹی مل رہی ہے۔ وہ گیارہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جب اسے اس کا اطمینان ہو جائیگا کہ ہر شخص کو گیارہوں کی روٹی میسر آرہی ہے۔“

آپؐ نے غور فرمایا کہ جو کچھ رعایا سے لیا جا رہا ہے اس کے عوض میں خدمات کس قدر انجام دے جا رہی ہیں کیا کسی کو ایسے کاموں کے لئے اتنا سستا مزدور مل سکتا تھا؟ بستا بھی اور پھر اس نے بھی! خدمت کے بغیر کچھ لینا تو ایک طرف، وہ تو خدمت کے بغیر مملکت کے لئے بھی کچھ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے! اس ضمن میں ایک آزاد شدہ غلام (سعید)

خدمت کے بغیر کچھ نہیں

کس نہ گم دور جہاں

کلیان کردہ واقعہ بڑا بصیرت افروز ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں آزادی حاصل ہونے کے بعد حکومت کے واجبات کی رقم ادا کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں! ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ————— اس پر آپ نے فرمایا کہ پھر اپنی رقم واپس لے جاؤ۔ جب تمہیں حکومت کی طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لانا۔ (شاہکار رسالت ص ۳۶۸)

آپ نے دیکھا کہ سربراہ مملکت تو ایک طرف، وہاں خود مملکت بھی نہ گم اگر ہوتی تھی، نہ قرآن، وہ حق اللہ است یعنی تھی اور یہ نہ محتاجی ہوتی تھے نہ گم اگر سی!

اور جب اس مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا، تو کوئی ذلیل بھی نہیں ہوتا۔ وہ مملکت، احترام آدمیت کی زبانی دعویدار نہیں تھی۔ عملاً بھی اس کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ایک دفعہ حص کے حاکم، حضرت عیسیٰ بن سعدؓ کے منہ سے ایک غیر مسلم (ذمی) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے۔ اخذک اللہ، خدا تجھے ذلیل کرے! سہوایہ الفاظ تو زبان سے نکل گئے، اس کے بعد اس قدر برداشت اور ناستف ہوا کہ باب خلافت میں اگر استغفے دے دیا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں۔ جو احترام آدمیت نہیں کر سکتا وہ خود بھی کسی عزت و احترام کا مستحق نہیں۔

یہ تھے وہ حکمران جو نہ گم اگر تھے، نہ قرآن۔ اقبالؒ کے الفاظ میں،

اُن مسلماناں کہ میری کردہ اند در شاہنشاہی، فیری کردہ اند
اور یہ تھی وہ مملکت جو اس بنیاد پر قائم ہوئی تھی کہ ہے
کس نہ گم دور جہاں مختلف کس نکتہ بر شرع میں، این است و بس
وہ جانتے تھے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور شریعت حقہ کا مقصود و مقصد کیا ہے!

عزیزان من! وقت تھوڑا ہے اور داستان دراز۔ اس لئے مجھے اختصار سے کام لینا ہے۔ ابھی تک ہم محنت کشوں کی متاجی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کا اگلا گوشہ، مالکان زمین اور مراد عین کی کشمکش ہے۔ اس باب میں قرآن مجید کا فیصلہ یہ ہے کہ زمین، تمام نوع انسان (بلکہ تمام ذی حیات) کے لئے سرچشمہ رزق ہے اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی۔ اور جب کوئی شخص زمین کا مالک نہیں ہو

ہم تک پہنچ گیا۔
علامہ اقبالؒ نے اس پورے تذکرہ کو بال جبریل کی اس نظم میں بڑی جستجی سے بیان کیا ہے جس کا عنوان

الْأَرْضُ لِلَّهِ !

اور نظم یہ ہے :
پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں سے کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھیم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھردی موتیوں سے خوشہ نگنم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھائی ہے خوںِ انقلاب؟
وہ خدا یا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

(بال جبریلؑ ص ۱۹)

جب زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی تو کسی مزارع کو زمین، بٹائی یا پٹہ پر دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ابو داؤد
میں حضرت ابن ابی نعیم کی روایت ہے کہ :-

”رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین کاشت پر لی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اس طرف
سے ہوا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے۔ اور کہتی کس کی؟ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میری
بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ
زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ زمین صاحب زمین کو واپس
کمر واد اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔“
(نشاہکار رسالت - ص ۳۸۲)

جب زمین پر کسی کی ملکیت ہی جائز نہیں، تو کوئی شخص زمیندار ہو سکتا ہے، نہ اس کا کوئی مزارع۔ لہذا نہ وہ
اس کا محتاج ہوگا، نہ وہ بیل۔ کس نگر و درجہاں محتاج کس۔

اور آخر میں ہمارے سامنے وہ گوشہ آتے ہیں جو ان تمام خباثت اور مفاسد کی جڑ اور بنیاد ہے۔ یعنی نظام
سرمایہ داری! قرآن کریم نے معاشی نظام کا بنیادی اصول یہ بتایا ہے کہ وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى ﴿۵۲﴾

معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ اس کے برعکس، نظام سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ معاوضہ سرمایہ کا ہے یعنی ایک شخص سرمایہ لگاتا ہے اور دوسرے لوگ محنت کرتے ہیں، خواہ اس کی شکل انڈسٹری (کارخانہ داری) کی ہو اور خواہ کامرس (تجارت) کی۔ یہ شخص ان محنت کشوں کی محنت کے حاصل میں سے معتد بہ حصہ لے جاتا ہے اور اسے اپنے سرمایہ کا معاوضہ کہتا ہے۔ قرآن کریم اسے ربو کہہ کر پکارتا ہے اور نہ صرف اسے حرام کہتا ہے بلکہ اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیتا ہے۔ سرمایہ، دولت جمع کرنے کا نام ہے اور قرآن کریم دولت جمع کرنے کو، جرم عظیم اور عذاب جہنم کا مستوجب ٹھہراتا ہے۔ قرآن مجید کی بکثرت آیات اسی موضوع پر ہیں۔ میں اس وقت صرف ایک آیت پر اکتفا کرتا ہوں۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَفْقَهُونَهَا فِي سَبِيلِ
اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۚ يَوْمَ يُخْمَلُ عَلَيْهِمْ فِي ثَوَارِ
جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَأُخْرُوسُهُمْ ط
هَذَا مَا كُنْتُمْ لَا تَفْقَهُونَ ۚ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ۝ (۲۴۱)

”جو لوگ سونا چاندی (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے
کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسول! تو انہیں الم انگیز عذاب کی ”بشارت“ سنا دے یہ عذاب
اس دن واقع ہوگا جب سونے چاندی کے ان جمع کردہ سکوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے
گیا اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹوں کو داغا جائیگا۔ اور ان سے کہا جائیگا کہ یہ وہ دولت
ہے جسے تم نے اپنے مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب اس جمع شدہ دولت کے لئے ہوئے
عذاب کا مزہ چکھو۔“

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، قرآن مجید میں اکتناز دولت کے خلاف اس قدر آیات ہیں، کہ ان کی روشنی میں
اس حقیقت کے سمجھنے میں ذرا بھی وقت پیش نہیں آتی کہ قرآن کریم نظام سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اگرچہ
مجھے اس کے بعد عنان گفتگو اقبالؒ کی طرف موڑ دینی چاہئے لیکن یہاں ایک ایسا سوال میرے سامنے آتا ہے
اور میرا خیال ہے کہ وہ آپ کے دل میں بھی ابھر رہا ہوگا، جس سے صرف نظر کر کے آگے بڑھنا نہیں جاسکتا۔ اور
وہ سوال یہ ہے کہ دولت جمع کرنے کے دیگر عنوانات کو چھوڑ دیتے۔ زکوٰۃ کو اسلام کا ایک ستون قرار دیا جاتا ہے
اور زکوٰۃ بہر حال جمع شدہ دولت پر ہی ادا کی جاتی ہے۔ اگر اسلام میں دولت جمع کرنا اس قدر ممنوع ہے تو پھر

کمرے۔ اور یہ کہ اُجرت یا شرکت پر کاشت کرنے والوں کو سرے سے حقوق ملکیت ہی حاصل نہیں۔ (۳۳)
اس سے نظام سرمایہ داری (رُبو) کے دروازے چھٹ کھل گئے اور مزارعت (بطائی یا پتہ پر زمین کاشت کرنا) اور
مضابہت (SLEEPING PARTNERSHIP) سب جائز قرار پائے۔ اقبال نے اس کے خلاف
مسلل جہاد جاری رکھا۔

نظام سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے۔ قرآن کریم نے اس
کا راستہ ہی بند کر دیا۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ط۔۔۔۔۔ اے رسول!
یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے دیں؟ ... قُلِ الْعَفْوَ ... ط
(۲۱۹) "فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہو، وہ سب!"

ہماری ملکیت نے ان۔۔۔۔۔ آیات کو یا تو منسوخ قرار دے رکھا تھا اور یا محض تلاوت کے لئے برقرار۔
ان کا حکم بہر حال منسوخ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اس اُمت میں بھی نظام سرمایہ داری رائج رہا اور باقی دنیا
بھی قرآنی نظام کی برکات سے محروم رہی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اگر کوئی جماعت، قرآنی نظام کو قائم کرنے
کے لئے نہیں اٹھتی، تو کائناتی قوتیں یا زمانے کے تقاضے، انسانوں کو اس کی طرف آنے کے لئے مجبور کر دیتے
ہیں۔ روس کا انقلاب انہی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔ اس میں فاضلہ دولت کے نظریہ کو شدت سے مسترد کیا گیا تھا۔
اقبال نے اسی کے پیش نظر کہا تھا کہ،

قوموں کی روش ہے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گہری گفتار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جنت کمر دار
جو حشر قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

ہمارے ہاں اُجکل معاشرہ کے ہر جزو اور کُل کو "مسلمان کرنے" کا جنون اعصاب پر سوار ہے۔ معاشی
اس کا خاص طور پر ہدف ہے۔ اس سلسلہ میں سود کے مسئلہ پر طبعی طول و طویل بحثیں
ہو رہی ہیں۔ پان پان سو صفحات پر مشتمل تصانیف شائع ہوئی ہیں۔ یہ کچھ اس مسئلہ
کے متعلق ہو رہا ہے جسے قرآن کریم نے دو لفظوں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلامی نظام قائم ہونے سے

رُبو

پہلے، عربی معاشرہ میں دبا کا کاروبار عام تھا۔ جب قرآن مجید نے دبا کو حرام قرار دیا اور مملکت کے خلاف بغاوت، تو سابقہ کاروبار کے سلسلہ میں فرمایا۔ **فَلَكُمْ مَرْوَسٌ اَمْوَالِكُمْ** تم صرف اپنا اصل زر لے سکتے ہو۔۔۔۔۔ **لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تَظْلَمُوْنَ** ۵ (۹، ۱۶) اس سے نہ تو تم پر کوئی زیادتی ہوگی کہ تمہیں تمہارا پیسہ واپس مل جائے گا۔ اس میں کچھ کمی نہیں ہوگی اور فرق مقابل پر بھی کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہوگی کہ اسے اصل سے کچھ زیادہ نہیں دینا پڑے گا۔ قرآن مجید کے ان چار لفظوں نے ساری بات واضح کر دی۔ جو کچھ راس المال (اصل زر) سے زیادہ لیا جائے گا، وہ مارجن ہوگا، خواہ اس کی شکل نقدی قرضہ کی ہو، مزارعت کی ہو، مضاربت کی ہو، بینک کی اصطلاح "شرکت منافع" کی ہو۔ سب دبا کے ٹمرہ میں آئے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ سود پر پان پان پر سو صفحات پر مشتمل تصانیف میں، قرآن کریم کی اس آیت کو کبھی سامنے نہیں لایا جائے گا۔ جو کچھ لکھا جائے گا وہ اس حقیقت کا غماز ہوگا کہ: سے

خود بے لگتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
یہ تو تھا سابقہ سودی کاروبار کے متعلق حکم۔ اسلامی نظامِ معیشت میں "قُبْلِ الْعُقُود" نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔ نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت ہوگی، نہ اس پر کچھ زائد لینے کا سوال پیدا ہوگا۔ اور نہ ہی کسی کو کسی سے کچھ مانگ کر ذلیل ہونے کی ضرورت پڑے گی۔ اسلامی نظام ہر ایک کی ضرورت، بطور اس کے حق کے پوری کرے گا۔

انقلابِ روس کے عہد میں اقبالؒ کو اسی "قُبْلِ الْعُقُود" کی جھلک دکھائی دی تھی جس سے اس کی خوش نظری نے اسے اس نتیجہ پر پہنچایا تھا کہ: سے

زمنے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
پیرانی سیاست گری خوار ہے زمیں، میر و سلطان سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا!

تماشا دکھا کہمداری گیا!

(ضمناً) "مداری" کا نظریوں تو (نظرِ بظاہر) "سرمایہ داری" کے قافیہ کے لئے لایا گیا ہے، لیکن اس میں ایک معنوی نکتہ بھی ہے۔ اب تو اس قسم کے مداری نہیں آتے۔ کچھ عرصہ پہلے جو مداری آتے تھے، وہ خالی ہاتھوں روپے پر روپیہ بناتے چلے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ روپیہ درحقیقت بنتا نہیں تھا۔ نظرِ ایسا آتا

تھا کہ روپیہ بین رہا ہے۔ یہی کیفیت نظام سرمایہ داری کی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے: لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ص..... (۱۳۱) سمجھایہ جاتا ہے کہ بڑے دولت بڑھتی ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اس سے قومی دولت بڑھتی نہیں گھٹتی ہے۔ یہ جو دولت بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے، داری کا ہتھ ناک ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اسی نظم میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ: ہ

گراں خواب چینی سنبھلے لگے ہمالہ کے چٹے اُبلنے لگے

حالانکہ یہ ۳۵-۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ جب ہنوز خود چینیوں کو بھی اس کا احساس نہیں تھا کہ ان کی شب تیرہ و تار کی سحر قریب ہے۔ لیکن قرآنی بصیرت کی روشنی میں حال کے واقعات و حوادث کے تجزیہ سے مستقبل کے متعلق اس قسم کی قیاس آرائی مشکل نہیں ہوتی۔ اسی بناء پر انہوں نے کہا تھا کہ ہ

عکس اس کا میرے اُئینہ اوراک میں ہے

یہ روس ادیبین کی بات تھی۔ یہ کہتے ہیں کہ مورجنگل میں ناچتا ہے تو اپنے رقص کی نازک خرامیوں اور اپنے رنگین پروں کی جلوہ پاشیوں میں وہ ایسا کھو جاتا ہے کہ اسے ماحول تو ایک طرف، خود اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں رہتا لیکن اس کے بعد جب اس کی نگاہ اپنے پاؤں پر پڑتی ہے تو رقص ختم ہو جاتا ہے۔ پرسمٹ جاتے ہیں۔ اور وہ نہایت پیر مردگی کے عالم میں نگوں سا ہو جاتا ہے۔

حضرت علامہؒ — زمانے کے انداز بدلے گئے نیاراگ ہے، ساز بدلے گئے — کی وجد فریادوں میں محو تھے کہ ان کی نگاہ ملتہا اسلامیہ پر پڑی۔ کیف و مستی کا وہ عالم، رقص طاؤس کی طرح مرجھا گیا اور انتہائی تسوہ گداز سے پکاراٹھے کہ ہ

مگر دل ابھی تک ہے زنا ز پوش

بتان عجم کے پکاری تمام

یہ اُمت روایات میں کھو گئی

مگر لذت شوق سے بے نصیب

لُغت کے بکھیروں میں الجھا ہوا

محبت میں یکساںیت میں فرد

یہ سالک مقامات میں کھو گیا

مسلمان ہے توحید میں گم جو شش

تمدن، تصوف، شریعت، کلام

حقیقت خرافات میں کھو گئی

لبھا تا ہے دل کو کلام خطیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خستہ حق میں مرد

حُجَم کے خیالات میں کھو گیا

بجی عشق کی آگ اندھیر ہے !
مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے !
(بال جبریل ص ۱۶۸)

مشیرانِ اہلس کی زبان میں : ے

ہے ازل سے ان عزیزوں کے مقدر میں سجد
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
یہ ہماری سعی و پیہم کی کرامت ہے کہ آج
ہے طوافِ وحج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نماز بے قیام
ہو کہیں پیدا تو مرجانی تہ ہے یا رہتی ہے خام
صوفی دُعا لو کیت کے بندے ہیں تمام
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام
(ارمغانِ حجاز)

اور خود اہلس کے الفاظ میں :-

جانتا ہوں میں یہ اُمتِ حاملِ قرآن نہیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
ایسے یاس انگیز حالات میں بڑے بڑے ادبِ عزم کے سینوں میں بھی اُمید کی کرن بجھ کر رہ جاتی ہے ، لیکن
اقبال؟ تو کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس کا ایمان اور پیغام یہ تھا کہ : ے

مسلم استی ! سینہ راز آرزو آباد دار
ہر زمان پیشِ نظر ، لا یخلف المیناد دار
وہ قوم کے بڑے بوڑھوں سے نا اُمید ہوا تو اپنی توجہ کامرگز آنے والی نسل کے نوجوانوں کو قرار دے لیا۔ وہ خدا
سے پورے بحرِ عالمِ خارج کے ساتھ دعائیں مانگتے تھے کہ ے

من کہ نویم دم ز پیران کہن !
دارم از روزے کہ می آید ، سخن
بر جوانان سہل کن حسرت مرا
بہر شاں پایاب کن ز رفت مرا

اور : ے

جوانوں کو میری آہِ حسرت
خدا یا آرزو میری بھی ہے
اور بال جبریل (کے ساتھی نامہ) کی اسی نظم میں ، جا بھی ابھی نمود و سبب گوش بن رہی تھی ، کہا کہ : ے
خرد کو غلامی سے آزاد کر
پھر ان شاہیں بچوں کو بالِ دیر سے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت حالات اُس زمانے سے بھی کہیں زیادہ مایوس کن ہیں، جب علامہ پیران کہیں سے ناامید ہوئے تھے، لیکن ان کی یاد میں اس تقریب کو افسردہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس کا اختتام ان کی اس دعا پر کرنا چاہتا ہوں جو ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی تھی۔ یعنی :۔

تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر! زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!
جوانوں کو سوزِ حب گہِ بخش دے مرا عشق، میری نظرِ بخش دے
مرے دیدہ نژ، کی بے خوابیاں! مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالہ نیم شب کا نیاز! مرے خلوتِ دلِ بخش کا گداز!
اُمسگیں مری، اُردو دین مری! اُمیدیں مری، جستجوئیں مری!
بہی کچھ ہے ساقی مستاعِ فقیر! اسی سے فیرِی میں ہوں نہیں امیر!

مرے قافلے میں لٹا دے اسے

لٹا دے اٹھکانے لگا دے اسے

وَبِنَا قَبَّلْ مِمَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِیْمُ

ایک سوال

میرا خطاب تو ختم ہوا، لیکن ایک سوال ہے جو مجھ سے ایک عرصہ سے پوچھا جا رہا ہے اور میں اسے اب تک ٹالتا چلا آیا ہوں۔ لیکن اب اس کے تقاضے اس قدر شدید ہو گئے ہیں کہ مجھے (بادلِ ناخواستہ) اسے سامنے لانا پڑ رہا ہے۔ سوال کے الفاظ کچھ اس قسم کے ہیں کہ ”ہم برسوں سے آپ کے درس میں بھی اور دیگر تعاریب میں بھی آپ کی زبانی پیغامِ اقبال سننے چلتے آ رہے ہیں، اور آپ کی تحریروں میں پڑھتے بھی ہیں۔ آپ کو جس قدر اقبال پر عبور ہے اور اسے آپ جس انداز سے قرآن مجید کی روشنی میں پیش کرتے ہیں، اس کی مثال نہیں ملتی۔ ملک میں علامہ اقبال سے متعلق اتنی تعاریب منعقد ہوتی ہیں۔ آپ ان میں کیوں شریک نہیں ہوتے تاکہ اس پیغام کا دائرہ وسیع ہو۔“

جواب : اس سوال کا دو نقطوں میں جواب یہ ہے کہ ان تعاریب میں وہی شریک ہو سکتا ہے۔ جسے

شرکت کی دعوت دی جائے۔ مجھے دعوت نہیں دی جاتی۔۔۔۔ اس لئے میں ان میں شریک نہیں ہوتا۔

لیکن اس پر مجھ سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ یہ لوگ آپ کو دعوت کیوں نہیں دیتے؟ اس کا پھر دو لفظی جواب یہ ہے کہ یہ ان حضرات سے پوچھئے کہ وہ مجھے دعوت کیوں نہیں دیتے؟ لیکن چونکہ اس سے بھی متفسرین کا اطمینان نہیں ہوگا اس لئے جو کچھ میں سمجھتا ہوں اسے عرضِ خستہ کر دینا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ حضرات مجھے اس لئے نہیں بلاتے کہ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآنِ کریم پیش کرتا ہوں (خواہ اس کا واسطہ کلامِ اقبال ہو یا پیغامِ قائدِ اعظم) اور قرآن ہماری قوم کے مزاج کے موافق نہیں۔ اس لئے ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ اس کی آواز عام نہ ہونے پائے۔ مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ میرے ہاں اپنے ذرائعِ ابلاغ موجود ہیں۔ لیکن اس سے جس طرح قومِ اقبال کی قرآنی فکر سے محروم رہ جاتی ہے اس کا افسوس ضرور ہوتا ہے۔ اقبالؒ سے متعلق تعاریب ہوں یا قائدِ اعظمؒ سے متعلق، انہیں رسمی طور پر منایا جاتا ہے اور یہ بھی اس وقت تک کیا جائے گا جب تک اس سے کچھ مفاد حاصل ہوتے ہوں۔ اس کے بعد فقط تاریخ کی کتابوں میں ان کے نام رہ جائیں گے۔ آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ داتا گنج بخش (علیہ السلام) کا عرس تو اس قدر دھوم دھماکے سے منایا جاتا ہے لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ یا حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق اتنا بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کی تاریخ وفات (بایں شہادت) کون سی ہے! دو ایک سال اُدھر سے، یومِ صدیقؓ اور یومِ فاروقؓ کی آوازیں تو سنائی دینے لگی ہیں لیکن بڑی مدہم سی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ داتا صاحبؒ کی تعاریب کے سلسلہ میں لاکھوں روپے کی یافت ہوتی ہے اور صدیقِ اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کی یاد منانے میں (کچھ ملنا تو ایک طرف) اگر وہ سے خرچ کرنا پڑتا ہے یا چندہ جمع کرنا۔ اگر اقبالؒ کی تعاریب کے سلسلہ میں بھی یہ صورت پیدا ہوگئی تو اس کی آواز صرف قوالوں کی ڈھولک کی تھاپ پر سنائی دیا کرے گی کہ ”طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی ایفون ہے۔“

ہماری قوم کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ ————— ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبرؐ کہیں ————— اور قرآنِ کریم کو تلاوت تک، اور اقبالؒ کو شاعری تک محدود (بلکہ مجبوس) رکھنے سے بھی مقصد یہی ہے۔ اور اس میں اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ قوم کی اسی ذہنیت کے پیشِ نظر، علامہ نے کہا تھا کہ: یہ اقبالؒ یہاں نام نہ لے، سلمِ خودی کا پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات بہتر ہے کہ بیچارے معمول کی نظر سے

”ابلیس کی مجلس شوریٰ“ میں آخری ریزولیشن یہ پاس ہوا تھا کہ ہے

مست رکھو و کمزور صبح گاہی میں اسے پنہاں کر دو مزاج خالق ہی میں اسے
اقبال سے متعلق تعاریب بھی اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اس نے سچ کہا تھا کہ ہے
وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی! میرے کام کچھ نہ آیا، یہ کمال نے نوازی!
یہ اس لئے کہ ہے

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کر گسولیں اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی
نتیجہ اس کا یہ کہ ہے
کوئی کارواں سے ٹٹا، کوئی بدگماں حرم سے کہ امیر کارواں میں نہیں ہوئے و نوازی!

اور : ع

علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساتی!

— واسم —

پرویز

پاکستان کا مطلب کیا؟

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ!

روم آزادی کی تقریب کے سلسلہ میں ہم اپنے خیالات و جذبات کا اظہار طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۸۱ء کے لمعات میں کر چکے ہیں۔ وہ سطور ماہ جولائی میں رقمزد ہوئی تھیں، لیکن جب ۱۳ اگست کی صبح نمودار ہوئی تو ہماری کیفیت یہ تھی کہ

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب اہِ اجڑ قطرہ نہ نکلا تھا، سوطوفان نکلا
لیکن ہم ان طوفانوں کو پھر قطرات میں منتقل کر دیا کہ صبرِ طلبی عشق کا یہی تقاضا تھا۔

انجھرنے کو تو تحریکِ پاکستان کی بہت سی یادیں اُفتخِ سینے سے ابھریں، لیکن ان میں سرفہرست وہ چند الفاظ تھے جن میں پاکستان کا مفہوم، مطلوب و مقصود اس جامعیت سے سمٹا دیا گیا تھا جس کی مثال کم ملے گی۔ معلوم یہ الفاظ کس نے کہے تھے، لیکن تھے ایسے مقبول کہ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں میں سے ہر ایک کی زبان پر تھے۔ وہ الفاظ تھے:-

پاکستان کا مطلب کیا؟ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ۱۳ اگست ۱۹۸۱ء کی شب کو لاہور ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے ایک انٹرویو میں حقیقت سامنے آئی کہ اس ترانہ کے خالق پروفیسر اصغر سوداوی ہیں۔ جنہوں نے اسے ۱۹۴۴ء میں لکھا۔ ہم سوداوی صاحب کی خدمت میں، ان کی اس زندہ جاوید تخلیق پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے آرزو مند ہیں کہ خدا اس قوم کو، اس سوداوی کی کہی ہوئی بات سمجھنے کا شعور عطا فرمائے۔

تحریک پاکستان کے دوران تو پاکستان کا مطلب — لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ — کہہ کر سمجھا دیا گیا، لیکن تشکیل پاکستان کے بعد کسی نے یہ نہ سمجھایا کہ خود لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا مطلب کیا ہے؟ تحریک پاکستان کے دوران، داعیان پاکستان اور اس کے مخالف علماء (مذہبی پیشواؤں) کے درمیان مابہ النزع مسئلہ ہی لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا مطلب اور مفہوم تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی پرستش "جائز نہیں اور داعیان پاکستان کہتے تھے کہ اس کا مطلب ہے: اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ (پہلا) یعنی خدا کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو "خدا کی پرستش" کی آزادی حاصل ہوگی۔ ان کے معتقدات میں کوئی دخل نہیں دے گا۔ وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ شعائر و ارکان اسلام کی ادائیگی پوری آزادی سے کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات ان کے فقہی قوانین کی رو سے طے پائیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ اسی کا نام اسلام ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا یہی مطلب ہے۔ اور اس کے لئے مسلمانوں کو الگ مملکت کی ضرورت نہیں۔

ہم اُن سے کہتے تھے کہ اللہ کے معنی پرستیہ (جس کی پرستش کی جائے) اور عبادت کے معنی پرستش نہیں۔ اللہ کے معنی صاحب اقتدار یا حکمران کے ہیں، اور عبادت کا مفہوم ہے محکومیت۔ اس اعتبار سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو حق حکومت حاصل نہیں۔ اور عبادت سے مراد ہے خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔ خدا کی حکمرانی کا عملی ذریعہ اس کی کتاب (قرآن مجید) کی حکومت ہے اور اسلام سے مراد ہے قرآن مجید کی حکمرانی۔ اس اسلام کی اجازت کوئی مملکت بھی نہیں دے سکتی۔ نہ ہی کسی غیر مسلم مملکت میں اس کا امکان ہے۔ کتاب اللہ کی رو سے، کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ انسانوں کی حکومت "کی کوئی شکل ہو، قرآن کی رو سے اس کی اطاعت، غیر اللہ کی اطاعت، فلہذا کفر اور ٹمک ہے۔" انسانوں کی حکومت ہیں، عہد پارینہ کی ملکیت سے لے کر عصر حاضر کی جمہوریت تک، سب شامل ہیں۔ حتیٰ کہ فقہی قوانین کی اطاعت بھی انسانوں کی اطاعت ہے کیونکہ وہ قوانین بھی ان باہرین قوانین کے وضع کردہ ہیں جو انسان ہی تھے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا صحیح مطلب، قرآنی حکومت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اور اس قسم کی حکومت اپنی آزاد مملکت میں ہی قائم ہو سکتی ہے۔ اسلام کا یہی تقاضا مطالبہ پاکستان کا جذبہ محرکہ تھا۔

تحریک پاکستان کے دوران، حقیقی نزاع، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے مطلب کا یہی اختلاف تھا۔ یہ جنگ اُد

تو انگریز یا ہندو کے خلاف تھی ہی نہیں کیونکہ وہ مذہبی سطح پر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اور اگر تھی بھی تو اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ بنیادی جنگ، داعیانِ پاکستان اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کے مابین تھی۔ ہندو اگر اس مطالبہ کے خلاف کبھی مذہبی دلیل پیش کرتا تھا تو اس لئے کہ اس کے مذہب کی دوسرے مذہب کو سیاست سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اور یا اس لئے کہ خود مسلمانوں کے علماء یہی دلیل پیش کرتے تھے (مثلاً) مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے نزدیک، اسلام کا حاصل ”خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی“ تھا۔ (یعنی دُستی پرستی کا تصور)۔ ان کے پیش کردہ اس تصور کو ہندوؤں نے اپنے اہتمام سے سارے ملک میں عام کیا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے جب ۱۹۳۰ء میں اللہ آباد کے مقام پر مسلمانوں کی جد امملکت کا تصور پیش کیا تھا تو ایسا ایک یا کسی ہنگامی جذبہ کے تحت نہیں کیا تھا۔ اُن کی ساری عمر ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کا مطلب سمجھنے میں گزر گئی تھی۔ انہوں نے (مشنوی رموز بے خودی) میں پہلے یہ بتایا کہ نزولِ قرآن سے پہلے انسانوں کی حالت یہ تھی کہ ہے

بود انسان در جہاں انسان پرست ناکس و نابود مند و زیر دست
اس میں ”انسان پرست“ کا ٹکڑا غور طلب ہے۔ اس میں ہر قسم کی انسانی حکومت آجاتی ہے۔ یعنی ہے
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہنرش بند ہا در دست دیا و گم دنش
یہ ملکیت کی ”انسان پرستی“ (غلامی اور محکومی) تھی۔ اس کے ساتھ ہے
کاہن و پایاد سلطان و امیر بہر یک نخیر صد نخیر گیر
یہ تھیا کہ بسی (یعنی مذہبی پیشواؤں کے فقہی قوانین) کی محکومی تھی۔ ملکیت اور تھیا کہ بسی کے گٹھ جوڑ سے
حالت یہ ہو چکی تھی کہ ہے

صاحب اورنگ و ہم پر کشت بانج بر کشت خرابِ او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضوان فروش بہر اس صید زبوں دلمے بدوش

(رموز بے خودی - ص ۱۱۹)

غریب و مفلس۔ محنت کش و مزدور۔ مزارع و کاشتکار بیچارے، دونوں ہاتھوں سے لٹے تھے۔ ایک طرف حکومت اپنے ٹیکس وصول کرتی تھی۔ دوسری طرف مذہب کے نام پر، ان کا خون نچوڑا جاتا تھا اس

کا نتیجہ یہ تھا کہ

از غلامی فطرت اودوں شدہ لغم ہا اندر نئے اودوں شدہ (الفصل)
نزد قرآن کے وقت... انسان کی یہی حالت تھی۔ وہ ایک طرف مستبد حکمرانوں کی ذلت آمیز اور اذیت
ناک زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے غضبناک اور قہراؤ و بندھنوں میں بندھا
ہوا، کہ انقلاب محمدیہ نے (وَيُضَعُّ عَنْهُمْ أَصْلَهُمْ وَالْأَغْلَى الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط (۱۵۷))
فرعونوں کی ان زنجیروں کو توڑ دیا اور ہماروں کی ان بندشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اس طرح، انسانوں کو
انسانوں کی محکومیت سے آزاد کر دیا۔

تانا بینے حتی بحق داراں سپرد	بندگاں را مسند خاقاں سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد	کوہکن را پایہ پر دینہ داد
وقت اودہر کہن پیکر شکست	نوع انسان را حصار نازہ بست
نازہ جاں اندر تن آدم دمسید	بندہ را باز از خداوند اس خسرو

(رموز بے خودی، صفحہ ۱۱۹-۱۲۰)

حضرت علامہؒ نے اس آخری مصرعہ میں قرآن کے انقلابِ عظیم کا حاصل چار لفظوں میں سمو کر رکھ دیا ہے جب
کہا ہے کہ ”بندہ را باز از خداوندان حمید“ یعنی انسانوں کو انسانوں کی محکومیت سے آزاد کر دیا۔ خواہ وہ انسان
قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کے ماتھے تھے اور خواہ مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ خداوند!

سوال یہ ہے کہ اس انقلابِ عظیم کا نقطہٴ ماسک یا بنیادی محرک کیا تھا؟ علامہ اقبالؒ نے (قرآن کریم
کی روشنی اور راہنمائی میں) بتا دیا تھا کہ یہ سب کہ شتم اور اعجاز تھا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا۔
یہ کلمہ انقلابِ آفریں دو گوشوں پر مشتمل ہے۔ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“

”لَا إِلَهَ“ ہر انسانی حکمرانی سے انکار، بلکہ اس کے خلاف اعلان بغاوت۔ اور ”إِلَّا اللَّهُ“ کتاب
اللہ کی حکومت کا اثبات۔ اقبالؒ کا سارا کلام اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔ وہ اپنی دوسری مثنوی ”پس چہ
باید کرد اسے اقوامِ مشرق“ میں کہتے ہیں۔

در جہاں آغاز کار از حرفِ لا است	ایں نخستیں منزل مرد خداست
پیش غیر اللہ لا گفتن حیات	نازہ از ہنگامہٴ او کا ناست

بندہ را با خواہ خواہی درستی
تخمس لا در مشت خاک اود پرین
لا مقام ضرب ہائے پے پے
ایں غور عداست نے آواز نے
(پس چہ باید کرد۔ ص ۱۹)

لا اِلهَ کو مسلک حیات قرار دینے والے کو قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ اقبالؒ اسے مردِ حق (یعنی بندہ آزاد) سے تعبیر کرتا ہے۔ مردِ حق کے متعلق وہ کہتے ہیں : ۱۔

مردِ حق از لا اِلهَ روشن ضمیر
می نہ گردد بندہ سلطان و میر
ما کلیسا دوست، ماسجد فروش
آورد دست مصطفیٰ پیمانہ نوش
در جہان بے ثبات اورا ثبات
مرگ اورا از مقامات حیات (ایضاً)
جاوید نامہ میں وہ خود خودِ خد (بجلی کی کڑک) بن کر یوں غلغلہ انداز ہوتے ہیں : ۲۔

لا اِلهَ گوئی؟ بگو از دوائے جاں
تا ز اندام تو آید بوائے جاں
ایں دو حرف لا اِلهَ گفتار نیست
لا اِلهَ جز تیغ بے زہار نیست
زیستن با سوز آوقہاری است
لا اِلهَ ضرب است ضرب کادی است
(جاوید نامہ - صفحہ ۲۳۴)

آپ نے خود فرمایا کہ مصوٰرِ پاکستان نے لا اِلهَ الا اللہ کا مفہوم کس دانشگاہ انداز میں سمجھایا تھا۔ لا اِلهَ انسانوں کی ہر حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ تھا، اودہ اس جنگ کے مضمرات سے ابھی طرح واقف تھے اسی لئے انہوں نے اپنی آخری تحریرِ ارمغانِ حجاز میں کہا تھا کہ : ۳۔

بنوِ توبرافہ دزم نگہ را ! کہ بنیم اندرون ہر دمر را
یوحی گویم مسلمانم، بلہ دزم کہ دامن مشکلات لا اِلهَ را ! (ایضاً ص ۱۹)
اس سے آپ نے اندازہ فرمایا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران جب کہا گیا تھا کہ :-
پاکستان کا مطلب کیا - لا اِلهَ الا اللہ

تو اس میں، لا اِلهَ الا اللہ کا مطلب کیا تھا؟ اس کا مطلب تھا - انسانوں کی ہر قسم کی حکومت کو ختم کر کے اس کی جگہ کتاب اللہ کی حکمرانی کا ثبوت کرنا۔ اسی کا نام توحید ہے۔ جس کی وضاحت اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی ہے :-

”جب توحید ایک عملی نظام کی شکل اختیار کر لے تو اس کا لازمی نتیجہ ”مسادات، محکمیت اور آزادی“ ہوگا۔ اسلام نہ کسی انسان کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے نہ مذہبی پیشواؤں کے مبتنیہ الوہیاتی اقتدار کو۔“

(خطبات تشکیل جدید، انگلریزی - ص ۱۳۷)

یہ تھی وہ قرآنی مملکت جسے مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ کے انقلاب آفرین ہاتھوں نے قائم کیا اور ساری دنیا میں اعلان کیا کہ اگر دیکھ لو کہ :-

کس دریں جاساتل و محروم نیست
عید و مولا، حاکم و محکوم نیست
نتیجہ تھا اس انسانیت ساز تغیر کا کہ :-

نقش قرآن تا دریں عالم نشست
نقشہائے کاہن و پاپا شکست

(جاوید نامہ - صفحہ ۹۰)

قرآن نے ملوکیت کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس قوم (ہم مسلمانوں) نے کیا کیا؟ اسے بھی اقبالؒ کے الفاظ میں سن لیجئے :-

خود طلسم قیصر و کسری شکست
نخود میر تخت ملوکیت نشست !
تا نہال سلطنت قوت گرفت
دین او نقش از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگر گمہ دو دگر

عقل و ہوش و رسم درہ گرد و گمہ
(جاوید نامہ - ص ۸۷)

یعنی جس قوم نے دنیا سے ملوکیت کا خاتمہ کیا تھا، اُس نے پھر نظام ملوکیت قائم کر لیا ! بظاہر یہ ایک سیاسی انقلاب تھا، لیکن (اقبالؒ کہتا ہے کہ) یہ سیاسی انقلاب نہیں تھا۔ اس نے دین پر ملوکیت کا ٹپتہ لگا کر اسے مذہب میں تبدیل کر دیا، کیونکہ دین ملوکیت کو اس آہی نہیں سکتا۔ اور یہ تبدیلی مذہبی پیشوائیت کے تعاون سے (بلکہ اس کے بل بوتے پر) رونما ہوئی۔

اُس دن سے لے کر آج تک ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، بانہوں میں بانہیں ڈال کر اُمت کو دین سے برگشتہ کئے چلی آرہی ہے۔ علامہ اقبالؒ اس (مروہ) اسلام کی جگہ قرآن کا الدین قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس الدین (یعنی قرآنی نظام حکومت) کے قیام کا امکان ہندوستان میں تو ایک

طرف، خود مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی نہیں، کیونکہ یہ مملکتیں بھی، ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا ملغوبہ تھیں۔ ہزار سال کی اس دہری غلامی سے ان کی یہ حالت ہو چکی تھی کہ :-

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، اندر نماز نش بود، و نیست
نارہا اندر نیازش بود، و نیست
نور و صوم و صلوات اوست اوست
جلوہ در کائنات اوست اوست
روح چوں رفت از صلوات از صیام
فردنا ہموار ملت بے نظام
سینہ ہا از گرمی ستر آں تہی !
از چنیں مردان چہ اُمید ہی
ہر کسے بر جادۂ خود تسد و دو
نافتہ مابے زمام و ہرزہ دو
(جادی نامہ ص ۲۳۵)

لیکن اس کے باوجود وہ (اقبال؟) اس سے مایوس نہیں ہوا۔ جس کی نگاہیں قرآنی بصیرت سے مستنیر ہوں وہ مایوس ہٹا ہی نہیں کہتا۔ وہ نامساعد حالات کی تہہ بہ تہہ تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھ لیتا ہے۔ انہوں نے اس کا حل یہ سوچا کہ ایک ایسا خطہ زمین حاصل کیا جائے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو، اور اس لوح سادہ پر قرآنی اسلام کا نقش ثبت کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس مجوزہ مملکت کا تصور پیش کرتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ اس سے ہم انگریز یا ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں گے، نہ ہی انہوں نے یہ کہا تھا کہ اس سے ہم پر معیشت کی راہیں کھل جائیں گی۔ یہ تمام مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ :-

”اس سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم اسلام پر سے اُس نقش کو مٹا سکیں جسے عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر رکھا ہے“
(خطبہ آلہ آباد)

یہ تھا ہمارے اس حین و سادہ لیکن عظیم انقلاب آفرین سلوگن کا مقصود کہ :-

پاکستان کا مطلب کیا ؟ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

یعنی اس قرآنی نظام کا قیام جو :-

۱۔ واضح رہے کہ ملوکیت سے مراد صرف بادشاہت نہیں۔ اس سے مراد ہر غیر قرآنی نظام ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو اور وہ کسی کے ہاتھوں متشکل ہو۔ اس وقت مسلمانوں کی مملکتوں سمیت، ساری دنیا میں ملوکیت مسلط ہے۔

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے
 نے کوئی فغفور و خاقان نے فقرو نشین
 (ابلیس کی مجلس شوریٰ)

لیکن اقبالؒ کے اس خواب کی جو تعبیر ہم نے مشکل کی، اُسے :-

کسی بیشکدہ میں بیاں کروں، تو کہے صنم بھی ہری ہری!

ہم نے اللہ کو تو (معاذ اللہ) ملک بدر کر دیا، اور فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کے آلہ تراش کر انہیں اپنا
 معبود بنا لیا۔ صدرِ اول میں تو پھر بھی قرآنی نظام قائم ہو جانے کے بعد، ہمارا تختہ الٹا تھا۔ یہاں ہمیں جھوٹوں بھی
 اس کا عکس تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کاہن دیا باکی وہی قوتیں جنہیں شکستِ فاش ہوئی تھی، یورش کر کے
 یہاں آگئیں اور انہوں نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا وہی مطلب یہاں عملاً ثابت کر دیا جسے وہ متحدہ ہندوستان
 میں اسلام کہہ کر پیش کر رہی تھیں۔ اُن کا وہاں دعوے تھا کہ اس اسلام کے لئے الگ مملکت کی ضرورت نہیں
 یہاں ان کے اس اسلام کو دیکھ کر جسے وہ پاکستان میں رائج کر رہے ہیں، ہماری نئی نسل نے کہنا شروع کر دیا
 ہے کہ اس اسلام کے لئے ملک کو تقسیم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

یوں ہم نے اپنی جیتی ہوئی بازی ہار دی ہے۔ اور قیامت بالائے قیامت، کہ ملک میں شاید ہی کوئی
 اُلجھ ہو جو اس شکست کے مضمرات کو دیکھ رہی ہو! ایسی حالت اس وقت ہوتی ہے جب کارواں کے دل
 سے احساسِ زبیاں جاتا رہا۔ اور احساسِ زبیاں کے جاتے رہنے سے اہل کارواں کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے
 کہ وہ، رہزن کو یہ کہہ کہہ دعائیں دیتے ہیں کہ:-

نہ لٹے دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتے؟

(غالب بہ ادنیٰ تصرف)

قوموں کی تباہی اس "بے خبر سونے" کا نتیجہ ہوتی ہے۔

پرویز

نذرِ اقبالؒ

اس سے پہلے ہمارے ہاں علامہ اقبالؒ کے یومِ وفات کی تقریب اپریل میں منائی جاتی تھی۔ لیکن اب اس کے علاوہ ان کے یومِ پیدائش کی تقریب بھی (نومبر میں) منائی جاتی ہے۔ اس نسبت سے طلوعِ اسلام کی نومبر کی اشاعت کے لمعات حضرت علامہ اقبالؒ کی تعلیم اور پیغامات کی نذر کے جلتے ہیں۔

۱۔ قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

عرشی صاحب کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ سے پوچھا: "خارج از قرآن ذخیرہ احادیث و روایات اور کتب فقہ و غیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟" انہوں نے فرمایا: "میر چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے تحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بحکمال و تمام آچکا ہے۔ خدا تعالیٰ کا منشادریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔" (البیان - دسمبر ۱۹۲۹ء)

۲۔ احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کیا جائے

مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہؐ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں۔ جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات

کے متعلق خاص طور پر اسی قسم کی کتاب کی اُجکل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مہر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علی ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں، اس پر ایک ادھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانہ حال کے مغربی اصول فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو ”چریح“ اور ”سٹیٹ“ میں امتیازِ کفر کے ان کو الگ کر دیا ہے۔ اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوام اسلامی کے لئے باعثِ برکت ہو گا یا شقاوت۔ عرض کہ مولوی صاحب یا ان کے رفقاء کو جو کلام الہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لطایف پر عبور رکھتے ہیں، اس طرف توجہ کمرنی چاہئے۔ میں اور مجھ جیسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیکڑا انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہو ہے نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں۔ ان پر قرآنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے ”جورس پروٹنس“ یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا ”مجتہد“ ہو گا۔ اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی ہنگامِ نظر اور قدامت پرستی نے ہمارا اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں سکھ حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ جتنا کے تمام دروازے بند ہیں، میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے، کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام کو یا زمانہ کی کوئی ٹپر کا جارا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(مکتوب بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، محرم ۱۳۵۸ھ)

۳۔ مسلمانوں کا منصب العین

انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو، ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویز شول کا، خونریزیوں کا، اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا

ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی اُمت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر مبنی ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے، بشرطیکہ توحید الہی کر انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشاء الہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے، بلکہ یہ رحمت اللعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تقوتوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی محبت کی تخلیق کی جائے جس کو **اصلة مسلمة للث** کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آ سکے۔ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں متعلقہ قومیت)

۴۔ اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیت کو دعوت دیتا ہے

۱۔ اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدہ کا، جو نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ دنیاں کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے، دراصل اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نفع انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اہلیت کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالم گیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نفع انسانی کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مانتا سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوونما اعداد تقاسم ہے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے، یا کہ دراصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمان کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے منحصر ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان

کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے۔ تعالو الی کلمۃ سوا عربینا و بینکم
(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔ متعلقہ فلسفہ سخت کوشی)

۲

اسلام کے مذکورہ بالا دعویٰ پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اول یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقرار
انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے
نظام اسلام کے کوئی اور نظام ذہن میں نہیں آسکتا، کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رُو سے
اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی
انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔
تاریخ ادیان اس بات کی شاہد و عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں ”دین“ قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں
کا، بعد میں نسلی قرار پایا، جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔
اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب
سے پہلے یہ پیغام دیا کہ چین نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ بلکہ خالص انسانی ہے، اور اس کا مقصد
بوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جا
سکتا، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکے ہیں، بلکہ اس کو صرف معتقدات پر مبنی کیا جاسکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق
ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے انکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک اُمت
کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی
اور شرف انسانیت کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ
پارہ ہو گئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے
ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی مکیا انجام ہوا
اور ہو رہا ہے ان کی اساس کے انتخاب کا، تو پھر کی اصلاح، غیر سلیم عقلیت کا دور، اصول دین کا اسٹیٹ کے
اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قریں یورپ کو دھکیل کر کس کی طرف لے گئیں، لادینی، دہریت اور
اقتصادی جنگوں کی طرف!

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں، مضمون متعلقہ وطنیت)

نبوتِ محمدؐ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہستی اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے۔ جس کی تشکیل اس قانونِ الہی کے تابع ہو، جو نبوتِ محمدؐ کو بارگاہِ الہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو، باوجود شعوب قبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لیتے کے، ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے، جو زمان، مکان، وطن قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوئی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدؐ، یہ ہے نصبِ العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرت انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوام عالم کی یا سہی معاشرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے، ان کو ایک رنگ گونہ میں جو کامِ اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین جانیے کہ دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکھ و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے بنی نوع انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیر سی پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں مضمون متعلقہ وطنیت)

۵۔ عالمگیر پیغام کے لئے بھی ایک سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے

سٹرڈنگٹن نے آگے چل کر میرے فلسفہ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالم گیر ہے لیکن باعتبار اطلاق و انطباق مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں برو کار لانا چاہیں، تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایسی ایک مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتی ہو، لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب متعلقہ فلسفہ سمعت کوشی)

۶۔ مذہب نجی معاملہ نہیں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے، اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں، لیکن اس کے نظام سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں، اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جمالی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں بھی ان کا اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہے کہ ان کا تعلق محض صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو، لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ اس کے برعکس یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجہ سے ایک ایسے نظام سیادت کی بنیاد ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمحل تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی بنیاد وحی پر ہے۔ لہذا اس کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو نزدیک کر دیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔

(خطبہ صدارت مسلم لیگ ۱۹۳۷ء)

یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کو کوئی کلیسا فی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقداً اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ

غصیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ (ایضاً)

۷۔ اسلام اپنے اصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا

اسلام ہدایت، اجتماعی انسانیت کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہدایت، اجتماعی انسانیت کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے۔

(بحار مولانا حسین احمد مدنی۔ متعلقہ قومیت)

(۲۱)

اُمت مسلمہ جس دین کی حامل ہے۔ اس کا نام دینِ قیم ہے۔ دینِ قیم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرائی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوم ہے۔ اس گروہ کے امور معاشی اور مادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے، بالفاظ دیگر قرآن کی رُوسے حقیقی، تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم، دینِ اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہو، نامعقول و مردود ہے۔ (ایضاً)

۸۔ مُلّا ئیت، تصوّف، ملوکیت

- ۱۔ مُلّا ئیت : کبھی علماء اسلام کے لئے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں، لیکن صدیوں کے مروجہ بعد خاص کمزور وال بغداد کے زمانہ سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے اور آزادی، اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ پس اُنیسویں صدی کے مصلحین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربہ کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔
- ۲۔ تصوّف : مسلمانوں پر ایک ایسا تصوّف مسلط تھا جس نے حقائق کی آنکھیں بند کر لی تھیں، جس نے

عوام کی قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے تہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اور عوام کی جہالت اور ضعفِ اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوتِ ارادی کو کمزور اور اس قدر کم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصرِ جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی روح سے آشنا ہو جائیں، جو مادہ سے گمراہی کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

(۳) - ملوکیت : مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے ملک کو نیچے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصد خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیا اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

(ختم نبوت - بحواب پندرہ جواہر لال نہرو)

۹۔ پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ دالگی

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ دالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

(خطبہٴ صدارت - ۱۹۳۰ء)

۱۰۔ کمیونزم خلافِ اسلام ہے

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو انیون تصور کرتے ہیں۔

لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروتوں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر مرا سر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی جو روحانیت میرے نزدیک منقضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ (مکتوب بنام غلام السبیدین، محرمہ ۱۳۷۱ھ، اکتوبر ۱۹۳۶ء)

۱۱۔ یہی اسلام کی منزہ شکل ہے

لیگ کو آخر العمل یہ طے کرنا ہو گا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفقہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذب نگاہ نہیں بن سکے گی (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئین جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصے میں آجائیں گی اور سب نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حق نہیں ہو گا) یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفقہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے اغلاس کا علاج کیا ہو؟ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تفورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے (مکتوب بنام قائد اعظمؒ محمد علی جناحؒ، مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

الْمِنْشَوُّ

ان موتیوں میں سے چند ایک جو اقبالؒ کے مکتوبات و دیگر تحریراتِ نثر میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔

۱۔ داخلی انقلاب

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔
(دہپا پہ پیام مشرق)

۲۔ نسل پرستی

تاریخ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب وحدتِ انسانیت کے لئے دقیانوسی اصول، مثلاً خونی شتے اور نعت و تاج کے علاقے ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحدتِ انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں، بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی قلب میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مطادو، و درہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہ ہو گا کہ اسلام فطرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطہ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے نسل ساز قومی کو بے کار کر دے۔ انسانوں کے سدھانے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔

(احمدیت سے متعلق - نہرو کے جواب میں)

۳۔ مذہب اور سیاست

اسلام، محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔
قدیم زمانے میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالص انسانی ہے اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے، عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے انکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، جو ایک اُمت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔
(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان)

۴۔ شریعت کا مقصود

اسلام نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا، بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود متعین کرتا ہے۔
ان حدود کے متعین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الہی ہے۔
(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

۵۔ دور انحطاط کے پیشوا

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیلی خنک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء، فلاسفہ، سیاستین وغیرہم کو ایک نئی تحریک خیال سے ابھارتا ہے۔ چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اُٹھتے ہیں اور اسندلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ہمتی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے اور انہیں خوش آئند و درخشاں بناتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت

کو رجائیت کے نگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہل قوم کے عملی فرائض کو شل اور ان کی روحانی قوت کو کوجھیرنا کہہ دیتے ہیں۔
(بیان متعلقہ احمدیت)

۶۔ مجوسی کلچر

جب کسی کلچر میں علامات زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں، اس کے تصورات اور اس کے واردات روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے دور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں، اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں تین ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیات روحانی کی تشکیل نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سونیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشوونما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق، اخبار لائٹ کے جواب میں)

۷۔ محاورہ عرب

ہندی مسلمانوں کی بڑی بد بختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے، اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے، یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لیے جاتے ہیں جو عربی میں ہرگز نہیں۔
(مرآج الدین پال کے خط - ۱۹۱۶ء)

۸۔ ملت کی حالت

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے، ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مہینت آگئی ہے۔ یہ گمراہی کو کہنے سے

ڈرتا ہے۔ صوفیاء اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفععت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ خوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے عرض راستہ نہیں۔
(پتھر دہری نیاز علی خاں کے نام خط - ۱۹۳۷ء)

۹۔ اضطراب

میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرے۔
(سید سلیمان ندوی کے نام خط - ۱۹۳۶ء)

۱۰۔ فکر سے محرومی

تو میں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔
(خطبہٴ صدارت - ۱۹۳۲ء)

۱۱۔ لیڈروں کا فقدان

اس وقت ہندوستان کے مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے، جو اسلام کی روح اور تقدیر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوت متحرک ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جاسکتے۔ دوسرا مرض احساسِ اجتماعیت کا فقدان ہے اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔
(خطبہٴ صدارت - ۱۹۳۰ء)

۱۲۔ احترام آدمیت

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

۱۳۔ وحدت انسانیت

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک مقبرہ ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔

۱۴۔ قومیت سے بلند

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جبرانی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید و تخلیق ہو، قابل احترام ہے۔
(دیباچہ پیام شرق)

۱۵۔ وطنیت

میں یورپی تصور کی وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے بلکہ اس لئے کہ اس میں منکر خدا مادیات کے جراثیم پائے جاتے ہیں، جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔
(خطبہ صدارت)

۱۶۔ مغربی سیاست

جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی، وہ خونریزی، سفاکی، استیلا اور ظلم کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے فوائد میں عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں، انہوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں، کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان ہم پہنچائے۔
(ریڈیو تقریر - ۱۹۳۸ء)

۱۷۔ تاریک ترین دور

اس زمانہ ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جاننے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔
(ریڈیو تقریر - ۱۹۳۸ء)

۱۸۔ قوانینِ الہیہ کا اتباع

جب تک اقوام کی خود ہی قانونِ الہی کی پابندی نہ ہو، امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔
(مولانا غلام احمد صاحبِ صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

۱۹۔ انحطاط کا جادو

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسور اپنے قاتل

کو اپنا مرتبی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

۲۰۔ ایرانی اثرات

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام (یعنی خدا کے عطا کردہ دین) سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے امتیازی نہیں، ان کے نظریاتی آئینہ بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کردوں، جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔

(منشی سراج الدین کے نام خط)

۲۱۔ تصوف

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اس ترک دنیا کے پردے میں تو میں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کی تباہی و بربادی میں ہو، چھپا کر دیتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

۲۲۔ تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی داعی آب ہوا میں پودیش پائی۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۱۶ء)

۲۳۔ جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے خالق، اور بارگاہی کی ذرا

کے متعلق شوگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے، تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔
علامہ اسلم جبراجپوری کے نام خط - ۱۹۱۹ء

۲۲۔ ہندی اور ایرانی صوفیائیں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ وحدانیت (وحدت الوجود) اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک محض میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔
(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط - ۱۹۳۶ء)

۲۵۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت SUBTLE طریقہ تفسیر کا ہے۔ اور یہ طریقہ وہی قومیں ایجاد یا اختیار کر سکتی ہیں جن کی فطرت گو سفندی ہو شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث (وحشت) وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبع موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا۔ یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لطیفہ کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعرا اسلام کی تردید و تفسیر کی ہے اور اسلام کی ہر محمود ٹٹے کو مذموم بیان کیا ہے۔
(سراج الدین پال کے نام خط - ۱۹۱۶ء)

۲۶۔ ابن عربی

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عربی ہے جس نے لمحات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص میں سوائے اتحاد و زندگی کے اور کچھ نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط - ۱۹۱۶ء)

۲۷. خوئے غلامی

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترقی ہو۔
(مولوی ظفر احمد صاحب مدنی کے نام خط - ۱۹۳۶ء)

۲۸. قرآن کا مسلک

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔
(سید سلیمان ندوی کے نام خط - ۱۹۳۲ء)

۲۹. شاعری

میرزید نظر حقانی اخلاقی و ملی ہیں۔ زبان میرے لئے نالونی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فنِ شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلدہ ہوں۔
(پروفیسر شجاع کے نام خط - ۱۹۳۱ء)

۳۰۔ شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطلع نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مد نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط - ۱۹۱۹ء)

حقیقت خرافات میں کھوکھی

(خصوصی درس تقریبِ یومِ اقبالؒ ۲۲ اپریل ۱۹۸۳ء) (پرویز)

عزیزانِ گرامی! قدرِ اسلام و رحمت!

آج کل سڑکوں پر بجلی کے ققمے اویزاں ہوتے ہیں۔ پادرو ہاؤس میں بیٹھا ہوا الیکٹریشن ایک ٹن دبا نہ ہے تو سارے ققمے بیک وقت روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے بچپن کے زمانے میں سڑکوں پر مٹی کے تیل سے جلنے والی لمپیں ہوتی تھیں۔ لمپیں جلانے والا۔ ایک ایک لمپ روشن کرتا چلا جاتا تھا۔ وہ اپنے حلقہ کا آخری لمپ جلا کر نگاہوں سے ادجھل ہو جاتا اور اس کی جلائی ہوئی لمپیں رات بھر راستوں کو روشن کئے رکھتیں۔ تاریخِ انسانیت عبارت ہے اسی قسم کے لمپ جلانے والوں سے جن کے نورِ بصیرت اور حسنِ کردار سے روشن شدہ شمعوں سے انسانی زندگی کی گزرگاہیں فروزاں ہیں۔ وہ ان شمعوں کو اپنے فائدے کے لئے نہیں جلاتے تھے وہ تو انہیں جلا کر اگے بڑھ جاتے تھے ادا ان کے بعد آنے والوں کی راہیں ان سے مستنیر ہوتی تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ :-

قدم قدم پر جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ
بر سوچ کر کوئی پیچھے بھی اُ رہا ہوگا

ابھی، خونِ جگر سے شمعیں روشن کرنے والوں میں ایک تابندہ و درخشندہ نام حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا بھی ہے جن کے یومِ وفات کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ حضرت علامہ کا سب سے پہلے عمومی احسان، عالمگیر انسانیت پر ہے جس کی تاریک راتوں کو انہوں نے نورِ سحر سے روشناس کرایا۔ دوسرا احسان ملتِ پاکستانیہ پر ہے جس کے راہِ گم کر وہ قافلے کو انہوں نے نشانِ منزل عطا کیا۔ اور ایک ذاتی احسان اس ذوقِ ناچیز پر بھی ہے جس کا فہم قرآن ان کے نورِ بصیرت کا رہینِ کرم ہے۔ اگلا لیسانہ ہوتا تو اسے آپ آج کئی سائیں

یوڑھ شاہ کے مزار پر دھونی رمائے بیٹھا دیکھتے۔

علامہ اقبالؒ کا قلبِ حزین ملت کے درد سے لبریز تھا۔ ان کی ساری عمر اسی کے غم کی خور تباہ فشاںی میں

گذری۔ ان کا سارا کلام اسی سوز و ساز و درد و داغ کی داستانِ خوش چکاں ہے۔ دیکھئے

ملت کا درد

وہ ارمنانِ حجاز کی ایک سادہ سی نظم میں پہلے ملت کی ذبوں حالی پر کس طرح خون کے آنسو روتے ہیں۔ جب کہتے ہیں کہ۔

آتی ہے دم صبح صد اعشیں بریں سے
کس طرح ہوا کند تر انشیرِ تحقیق؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
مہر و مہ داغ نہیں محکوم ترے کیوں؟
اب تک ہے ڈال گہرچہ لہو تیری رگوں میں
نہ گہری انکار نہ اندیشہ سبے باک!

یہاں تک تو اُمتِ محرم کی نجات و زبوں حالی کا مرثیہ تھا۔ اس کے بعد چار لفظوں میں اس کے اسباب کو اس
حسین ایجاز و جامعیت سے مرتکز کیا دیا ہے کہ ہماری ساری تاریخ اس میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ فرمایا۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری! اے کشتہ سلطانی و طائفی و پیری!

دوسری جگہ ہے۔

چار مرگ اندر پیئے اس دیر میسر
سود خوار و والی دُملا و پیر

ان کے نزدیک بھی وہ چار غفاریت ہیں جنہوں نے اُمت کے جسہ ناتواں سے خون کا آخری
قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔ یعنی ملوکیت۔ نظامِ سرمایہ داری۔ خانقاہیت اور ملامتیت! ان
کا کلام انہی چار امراض کی تشریح اور ان کا پیغام انہی سے جان چھڑانے کی تلقین ہے۔ میں آج کی نشست میں ان
کے صرف ایک گوشے یعنی ملامتیت کی اقبالی تشریحات و تلقینات پیش کر دوں گا۔ لیکن پہلے دو امور کا تمہیداً سمجھ
لینا ضروری ہے۔

۱۔ آپ تاریخِ انسانیت کا پہلا صفحہ ایٹھ: آپ کو ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی استبدادی قوتیں شانہ
بشانہ چلیے نظر آئیں گی۔ جہاں تک تسلط و غلبہ کا تعلق ہے۔ یہ دونوں قوتیں یکساں دکھائی دیں گی لیکن حکمران طبقہ
کے مقابلہ میں مذہبی پیشوائیت کی زنجیریں زیادہ محکم اور سنگین ہوتی ہیں۔ حکمرانوں (پادشاہوں۔ راجاؤں) کو اپنا

غلبہ و تسلط قائم رکھنے کے لئے پولیس اور فوج کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مذہبی پیشوائیت کو ان میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اس لئے کہ حکمرانوں کا تسلط محکموں کے جسم پر ہوتا ہے اور مذہبی پیشوائیت کا غلبہ ان کے قلب اور دماغ پر۔ حکمرانوں کے خلاف سرکشی کے خیالات ذہنوں میں ابھرتے اور بعض اوقات بغاوت کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن مذہبی تسلط کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کے کسی حاکم کے خلاف کسی کے دل کی گہرائیوں میں شہ پہلک بھی کھڑی نہ ہو تو وہ ڈرتا ہے، روتا ہے، گڑ گڑاتا ہے، معافیاں مانگتا ہے، مفتیں مانگتا ہے، کٹارے ادا کرتا ہے۔ ”نادیدہ خوف“ اس کے اعصاب پر ایسی کڑی گرفت رکھتا ہے کہ وہ سر اٹھانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔ ملکی حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کے غلبہ اور خوف کی ایک بین مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ گزشتہ فروری میں قانون شہادت کے خلاف، کچھ خواتین نے احتجاجاً جلوس نکالا۔ حکومت نے اسے خلاف قانون قرار دے کر مؤاذہ کیا۔ بعض گمفاریاں بھی عمل میں آئیں۔ لیکن انہوں نے اسے ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔ نہ کسی کی آنکھ میں آنسو آئے۔ نہ دل میں دھڑکن پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی:-

فتویٰ کی گرفت

”جمیعت العلماء جموں و کشمیر کے مرکزی ڈپٹی چیف آرگنائزر مولانا عبدالمہدیزاں جی نے فتویٰ دیا ہے کہ قانون شہادت کے خلاف حال ہی میں لاہور میں لکالے جانے والے جلوس میں جن شادی شدہ خواتین نے حقہ لیا ہے ان کے نکاح ٹوٹ گئے ہیں۔ اب انہیں جائز تصور نہیں کیا جانا چاہیے۔ مولانا نے ایسی خواتین کے شوہروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ نکاح کی تجدید کے لئے شرعی طریق کار اختیار کریں۔ ایک بیان میں مولانا چشتی نے کہا کہ جن خواتین نے جلوس میں شرکت کی ہے انہوں نے خدا اور قانون پاک کی تعلیمات کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ انہوں نے ایک مقدس قانون کو چیلنج کیا ہے۔ چنانچہ ان کے نکاح جائز نہیں رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے کہا کہ جن سیاسی جماعتوں نے اجتماعی اور افراد نے نجی طور پر عورتوں کی حمایت میں جلوس میں شرکت کی ہے۔ وہ بھی خدا اور اس کے رسول کے مجرم ہیں۔ انہوں نے مذہبی تعلیمات کی توہین کی ہے اس لئے وہ پھانسی کے مستحق ہیں۔“

(جنگ لاہور۔ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۸۳ء)

سنا گیا ہے کہ جن عورتوں کے خلاف یہ فتویٰ صادر ہوا، ان میں سے جو زیادہ ”مذہب زدہ“ تھیں، ان کا برا حال ہے۔ امید ہے آئندہ، خواتین محتاط رہیں گی اور صرف غیر شادی شدہ عورتوں کا جلوس نکال کریں گی۔

تھا۔ ڈر کے مارے ان کا رنگ زرد تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ جیم پر لہرہ طاری تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔
ڈری۔ سہمی ہوئی پوچھتی تھیں کہ اب کیا ہوگا؟

یہ ہوتا ہے مملکتی حکمرانی اور مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی میں فرق!

یہ تو پھر بھی ایک ہنگامی حادثہ تھا۔ یہاں آئے دن ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں کہ کسی زود رنج خاوند نے
عفتہ میں اکہر بیوی کو ”طلاق۔ طلاق۔ طلاق“ کہہ دیا۔ عفتہ فرد ہونے پر مولوی صاحب سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا؟
انہوں نے فرمایا کہ تمہاری بیوی پر طلاق پر لگتی ہے۔ سہمے ہوئے کہا کہ حضرت! اس کے ازالہ کی کوئی صورت؟ فرمایا
کہ ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ تمہاری بیوی کسی غیر مرد کے ساتھ نکاح کر کے ایک رات اس سے ہم بستر ہو۔
صبح کو وہ اسے طلاق دے۔ پھر وہ تم سے از سر نو نکاح کرے تو تم میاں بیوی کی زندگی بسر کر سکتے ہو۔ ورنہ
نہیں۔ بال بچوں، بلکہ بعض اوقات، ”دودھ، پوت“ والی بڑھیا بیوی کانپ اٹھتی ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ اس
کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ عفتہ میں حاکمت تو اس کے خاوند سے سرزد ہوئی۔ یہ سزا اسے کیوں مل رہی ہے؟
لیکن مولوی صاحب گرج کہ فرماتے ہیں کہ یہ شریعتِ حق کا حکم ہے۔ اس کے خلاف چوں چراں نہیں کی جاسکتی۔
آپ سوچئے کہ کسی دنیاوی حکومت کی گرفت اس قدر اعصاب شکن ہو سکتی ہے؟ اس قسم کا ہوتا ہے مذہبی
پیشوائیت (تھیا کر لسی) کی حکومت کا تسلط!

(۲) اور بھی وجہ ہے جو خود ملوکیت کو بھی مذہبی پیشواؤں کی تائید کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جب تک برہمن،
مکھنیشری (راجہ) کے ماتھے پر اپنی توشیح کا ٹھپہ (ٹیکہ) نہ لگا دے وہ گڈی پر براجمان نہیں ہو سکتا۔ جب تک پادری، بادشا
کے سر پر مقدس پانی کا چھٹا نہ دے دے وہ جائز حکمران تسلیم نہیں کیا جاتا۔ جب تک مقتیانِ کرام سلطان المعظم
کے بطل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) ہونے کا اعلان نہ کر دیں۔ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض قرار نہیں پا
سکتا۔ یہ (ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا) گٹھ جوڑ ہے جو حکمرانی کے شکنجے کو مستحکم رکھتا ہے۔
بختِ نبی اکرمؐ کے وقت غلامی کے ان بندھنوں کی یہی حالت تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

لاد انسان، درجہاں انسان پرست ناکس و نابود مند و زیر دست

زیر دست انسان بالا دستوں کی غلامی کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی اپنی نہ کوئی ہستی تھی، نہ وجود۔
ترشح شخص تھا نہ مقام، نہ

سلطوت کسریٰ و قیصر ہزنش بندہ ہا در دست و پاؤ گردنش

لے واضح رہے کہ یہ خدا کا حکم نہیں، انہی حضرات کی خود ساختہ ”شرعیات“ کا فیصلہ ہے۔

قیصر و کسری (ملوکیت) اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر، اسے ٹوٹنے میں مصروف تھی۔
 کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہر یک پنجر صد پنجر گیر
 ایک طرف کسری و قیصر اور سلطان و امیر اور دوسری طرف، مذہبی پیشوا۔ ایک شکار کے پیچھے سینکڑوں
 شکاری :-

از غلامی فطرتِ آدموں شدہ • لغمہ ہا اندر نئے اُدھل شدہ
 صدیوں کی غلامی سے اس کی فطرت پست ہو چکی تھی۔ اس کی رگوں میں خونِ زندگی منجمد ہو گیا تھا۔ اس
 میں نہ حرکت باقی رہی تھی نہ حرارت۔ وہ جیتا جاگتا انسان نہیں۔ مٹی شدہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔
 یہ تھی انسان کی حالت ظہورِ اسلام کے وقت۔ قرآن آیا اور اس نے نوعِ انسان کی غلامی کے ایک ایک بندھن
 کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ اس نے ملوکیت کی زنجیروں کو توڑا تو اس کے ساتھ ہی اس مذہبی پیشوائیت کے حلقہ
 ہائے زناد بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ قرآن نے اعلان کر دیا کہ باور رکھو! یہ احبار و رہبان لوگوں کا مال نام جائز طوطو
 پر کھا جاتے ہیں۔ انہوں نے مذہب کو کاروبار بنا رکھا ہے۔ یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم خدا کی طرف لے جانے والے
 راستے کی طرف تمہاری راہ نمائی کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ”يُضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ“
 خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ خود ہیں۔ یہ اور سرمایہ داروں جیہم کا ایندھن ہیں۔
 اس طرح اس نے نوعِ انسان کو غلامی کی ان تمام زنجیروں سے رہائی دلادی :-
 نقشِ قرآن تا دریں عالم نشست نقشِ ہائے کاہن و پاپا شکست

دورِ ملوکیت

انسانی حریت و آزادی کا یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہا جب تک قرآنی نظام
 مملکت قائم رہا۔ اس کے بعد خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی اور ملوکیت کے ساتھ
 ہی اس کے لازم عناصر سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت بھی وجود پذیر ہو گئے۔ خود مسلمانوں نے ملوکیت کے تختوں
 اور مذہبی پیشوائیت کی مسندوں کے ان ٹکڑوں کو جنہیں انہوں نے ابھی کچھ عرصہ پہلے توڑ کر پھینک دیا تھا۔ اپنی مڑگا
 عقیدت سے ایک ایک کسے چٹا اور اپنی منہدم کردہ مسندوں کو بار و گیم استوار کر کے ان پر مسلط ہو کر بیٹھ گئے۔
 آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ حیرت انگیز نظارہ کہیں نہیں دیکھا ہو گا کہ :-

خود طلسمِ قیصر و کسری شکست خود سر تختِ ملوکیت نشست
 اس طرح سلاطین، اقدارِ مملکت بزورِ شمشیر یا در اشا حاصل کمر کے تختِ حکومت پر متمکن ہو گئے،

اور علماء حضرات برسرِ ممبران کے حق میں نصرتِ خداوندی کی دعائیں مانگتے رہے اور ان کی قصیدہ خوانی اور چابوسی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ یا تھی کی تاریخ کے مطابق خلیفہ یزید بن عبدالمک کے عہد میں، چالیس شیوخ نے آکر گواہی دی کہ :-

”خلفاء قیامت کے دن بغیر حساب کے بختے جائیں گے“

(تاریخ یافعی ص ۲۲۴ - بحوالہ طلوع اسلام - جولائی ۱۹۶۴ء)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے لکھا تھا کہ :-

”انہی دنوں مٹھن کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس نے اس عقیدہ کو اپنا دین بنالیا تھا۔ چنانچہ ابو بکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا اس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ ظلم و جور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ افعال کا صدور بادشاہ وقت سے اگر ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں۔ ہاں بادشاہ کے سوا عوام کو کوئی کنا درست ہے اور وہ بھی صرف زبان کی حد تک۔ ہتھیار تو ہر حال کسی کے مقابلہ میں اٹھانا شرعاً جائز نہیں“

(احکام القرآن - جصاص - جلد دوم - ص ۳۲ - بحوالہ ”امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی“ ص ۲۵)

جاہ پرستی کچھ آج ہی کے تملق پیش گان کا شیوہ نہیں۔ اقتدار اور قصیدہ خوانی کا چرلی دامن کا ساتھ چلا رہا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس سارے دور میں کوئی بھی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ہوگا جس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہو لیکن جیسا کہ ہر مستبد نظام میں ہوتا ہے۔ ان کی آواز چھوڑ، ان کے آثار تک کو مٹا دیا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے ہاں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی تاریخ تو پوری تفصیل کے ساتھ انبار در انبار موجود ہے لیکن ان کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا نام تک بھی کہیں نہیں ملتا۔

ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ان سلاطین میں کوئی نیک سیرت نہیں تھا۔ لیکن جب ملوکیت کا نظام ہی خلافِ قرآن تھا تو کسی بادشاہ کے انفرادی طور پر نیک ہونے سے وہ نظام تو اسلامی نہیں ہو جاتا۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ خلافِ اسلام نظام مسلسل اور متواتر جاری رہا۔ یہ سعادت ہمارے زمانے کے حصے میں لکھی تھی کہ اس میں ملوکیت، اور اس شجرۃ الزقوم کے برگ و بار (نظام سرمایہ داری، خانقاہیت اور ملائیت) کے خلاف بھرپور آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز تھی، حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی، جس نے کہا تھا کہ :-

مرے گلوں میں ہے اک نغمہ جبریلِ آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

لیکن اس نے درودِ دل نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس صورِ اسرائیل کو اسی جہانِ کون دیکھاں میں بھونکے۔ اس نے ایسی بھرپور آواز میں، جس سے یہ چار سو، لہز اٹھے پکار کر کہا کہ :-

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است نظامِ خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقر اُن گیتی پس ہم کہ در دینش ملوکیّت حرام است

(ارمغانِ حجاز ص ۱۲)

”دنیا میں انسان ابھی تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے لگہ چہ غلامی کی شکل بدل گئی ہے۔ اسے ابھی تک کوئی انسانیت ساز نظام میسر نہیں آیا۔ میں اس شاہنشاہِ بوریہ نشین و گیتی پسناہ کے در کا غلام ہوں جس نے اعلان کیا کہ اس کے نظام کی رُو سے ملوکیّت حرام ہے۔ اس نے غلامی کی ہرزخی کو توڑ دیا۔“

اقبالؒ نے اس ایک فقرہ مستانہ سے، ہماری تاریخ اور اس کے مضمرات کی، جسے ہم خود فریبی یا ابلہ فریبی کی بنا پر اسلامی تاریخ کہتے چلے آ رہے تھے اور اب تک یہی کہہ رہے ہیں۔ حقیقت بے نقاب کر کے رکھ دی۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ آج کی نشست میں میرا یہ موضوع نہیں۔ میرا موضوع مذہبی پیشوائیت ہے جس کی طرف مجھے زود پلٹ آنا چاہیے۔

مُلّا سے مراد

لیکن ایک اہم نقطہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ علامہ اقبالؒ (یا خود میں) جب ملّا پر تنقید کرتے ہیں تو اس سے کسی خاص فرد یا افراد کے گمراہی کی تنقید یا (خدا نکر وہ) تحقیر مقصود نہیں ہوتی۔ ملّا یا ملازم درحقیقت ایک انسٹیٹیوشن، ایک نظام، ایک مسلک کا نام ہے (جیسے عیسائیت میں چرچ یا ہندو مت میں برہمنیت) اس مسلک کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ اسلاف سے چلا آ رہا ہے وہ اسلام میں سند و حجت، قولِ فیصل اور حرفِ آخر ہے۔ وہ ابدی ہے اور غیر متبدل۔ نہ اس پر تنقید کی جاسکتی ہے۔ نہ کسی قسم کی ترمیم و تفسیح، وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ وہ ممکن العمل ہو یا نہ۔ اسلام بہر حال وہی ہے اس سے اختلاف مستوجبِ سزا ہے اور انکار کفر کے مرادف ہے۔ جس سے مسلمان مُرتد ہو جاتا ہے اور مُرتد کی سزا موت ہے۔ یہ ہے وہ مسلک

مشرک جس کی اقبال مخالفت کرتا ہے کیونکہ اس قسم کے مسلک کی نہ اسلام میں گنجائش ہے نہ جواز۔ اسلام سے مراد کتاب اللہ کی راہ نمائی میں علم و عقل سے کام لینا اور مذہبی پیشوائیت کے مسلک میں نہ کتاب اللہ کا کوئی عمل دخل ہوتا ہے نہ علم و عقل سے کچھ واسطہ۔ علم و عقل سے اسے کس قدر واسطہ ہوتا ہے اس کے لئے صرف ایک مثال پیش کر دینا کافی ہوگا۔ کچھ عرصہ ادھر کی بات ہے۔

”سودی عرب کے شہر مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی کے صدر نے اعلان کیا کہ زمین ایک جگہ پر قائم ہے اور سورج اس کے گرد چکر لگاتا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف تصور کرے تو اسے پھانسی پر لٹکا دینا چاہئے۔ سودی عرب ہی کی ایک اخبار میں صدر یونیورسٹی شیخ عبدالحزیز بن باز کا مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ چاہے کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو گئی ہو لیکن اب بھی اگر لوگوں کو صحیح راستے پر لایا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ بنی نوع انسان خود دیکھتے ہیں کہ زمین اپنی جگہ ساکت ہے اور سورج اس کے گرد گردش کر رہا ہے۔ طلوع ہوتا ہے اور پھر غروب ہوتا ہے۔ آپ نے مزید لکھا کہ آج کے دعوے کے بموجب زمین اگر گردش کرتی ہو تو پھر شہر، درخت، پہاڑ، دریا اور سمندروں میں استقامت نہ ہوتی، اگر زمین گردش کرنے لگے تو مشرق کے شہر مغرب میں اور مغرب کے شہر مشرق میں دیکھنے لگیں گے۔“

(بحوالہ طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۶ء)

اقبال ملازم کے اسی مسلک پر تنقید بھی کرتا ہے اور بعض مقامات پلاس میں اور حقیقی اسلام میں

تقابل بھی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ صدر اول کے بعد، ہماری تاریخ، لوکیٹ کی تاریخ ہے جو اسلام کی نقیض ہے۔ ظاہر ہے کہ جو نظام ہی اسلام کا نقیض ہو اس میں جو کچھ اسلام کے نام سے ہوگا اسلام کا نقیض ہوگا۔ اقبال نے اپنے کلام میں، غیر اسلامی عقائد، نظریات، تصورات، مسائل و مشارب کے لئے ”عجمی اسلام“ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے مروجہ اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

بتان عجم کے پجاری تمام	تمدنِ تصوف - شریعت - کلام
مگر لذتِ شرق سے بے نصیب	نہا تھا ہے دل کو کلامِ خطیب
لغت کے بکھیر دل میں الجھا ہوا	بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا

حقیقت خرافات میں کھو گئے یہ اُمتِ روایات میں کھو گئے

بھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلمان نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے!

سادی دنیا کی مساجد میں مؤذن، دن میں پانچ مرتبہ، میسنارہ
مسجد پیریا لاڈ ڈسپیکر کے سامنے کھڑے ہو کر، باواز بلند اعلان

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

کہتا ہے کہ:-

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

وہ یا تو ساری عمر ان الفاظ کو بلا سمجھے دہراتا رہتا ہے اور اگر سمجھتا ہے تو یہ کہ خلع کے سوا کسی کی پرستش نہیں ہو سکتی۔ اسے اللہ کے ہی معنی بتائے گئے ہیں لیکن جب اسلام ایک زندہ حقیقت تھا تو اللہ کے معنی تھے۔ حصارِ اقتدار، وہ جسے حق حکومت حاصل ہو۔ مؤذن اعلان یہ کرتا تھا کہ اسے اہل دنیا! کان کھول کر سن لو کہ:-
”میں اس حقیقت کی شہادت دیتا ہوں کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں۔ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔“

اُپ نے غور فرمایا کہ یہ کس قدر زلزلہ انگیز اور انقلاب انگیز اعلان ہے۔ جو سادی دنیا کے در و دیوار کو ہلادیتا ہے۔ پھر اسے بھی سوچئے کہ شہادت یا گواہی تو اسی کی قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے۔ جو اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو۔ وہ مؤذن جس مقام پر کھڑا اعلان کر رہا ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کسی کو حق حکومت حاصل نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ (کم از کم جہاں تک میری نگاہ جاتی ہے) حکومت صرف خدا کی قائم ہے۔ کسی انسان کی نہیں۔ اور یہ اعلان ساری دنیا میں قدم قدم پر ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ تھا اذان کے سب سے پہلے جزد کا مفہوم حقیقی اسلامی نظام کے زمانے میں۔ اس مفہوم کا ملوکیت کے لئے قابلِ قبول ہونا تو ایک طرف وہ اسے خود سن سکتی تھی نہ اس کی اجازت دے سکتی کہ کوئی اور بھی اسے سن پائے۔ مشکل اس کی یہ تھی کہ وہ ان الفاظ کو تبدیل بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس مشکل کا حل مذہبی پیشوائیت نے مہیا کر دیا۔ اس کے لئے اللہ کا ترجمہ کر دیا ”وہ جس کی پرستش کی جائے“ اب یہ اعلان بالکل بے ضرر ہو گیا۔ یہی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے۔ وہ الفاظ تو وہی رہتے دیتی ہے۔ ان کا مفہوم بدل دیتی ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن مٹا کی اذان اور، مجاہد کی اذان اور پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کہ گس کا جہاں اور بے شاہیں کا جہاں اور ضمناً۔ اقبال نے جو کچھ کہا ہے ”الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں“ تو یہ صحیح نہیں۔ الفاظ میں تو بے شک تفاوت نہیں۔ لیکن یہ معانی کا تفاوت تو ہے جو مٹا کی اذان، اور مجاہد کی اذان میں فرق پیدا کرتا ہے۔ وہ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

اندازِ بیاں گہر بہت شوخ نہیں ہے شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات
یا وسعتِ افلاک میں یکسر مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیحِ مناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست

یہ مذہبِ مٹا و مجادات و نباتات

لیکن یہ بھی اقبالؒ کی خوش فہمی تھی جو کہا تھا کہ ”شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات“ مٹا کے دل میں قرآن کی بات اُتر ہی نہیں سکتی۔ خود ارشادِ خداوندی ہے کہ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (۵۶) قرآن کے مطالب و مقاصد تک اسی کی رسائی ہوگی جو دل و دماغ کو غیر قرآنی خیالات و معتقدات سے پاک صاف کر کے اس کی طرف آئے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہنے!

وہ رمزِ شوق جو پوشیدہ لالہ میں ہے طریتی شیخِ فقیہانہ ہو تو کیا کہنے!

توحید کے مقابلہ میں سب سے بڑے بُت، فرقہ پرستی کے ہیں۔ جسے قرآن نے شرک کہہ کر پکارا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر فرقہ کے اسلام کی انتہا کسی نہ کسی شخصیت پر جا کر ہو جاتی ہے اور یہی شخصیت پرستی توحید کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جو شخص بھی کسی فرقے کے ساتھ متمسک ہے۔ اس کی قرآن تک رسائی نہیں ہو سکتی جب تک ان بتوں کو کعبہ ذہن سے نکال باہر نہ کیا جائے، خدا اس کے اندر قدم نہیں رکھتا۔ یہ حقیقت ہے کہ :

کھو یا گیا جو مطلبِ ہفتاد و دو ملت میں سمجھ گاہ توحید تک بیزنگ نہ ہو ادراک

۱۔ مروجہ اسلام میں اس کے معنی یہ لئے گئے کہ قرآن مجید کو نہادھو کر با وضو چھونا چاہئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جسم کی پاکیزگی بھی اچھی چیز ہے لیکن یہاں بات لطیفہ قلب و دماغ کی ہو رہی ہے جسکے بغیر قرآنی مفہیم سمجھنے نہیں آسکتے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔

بیرنگی اور اک ہی کو **الْمُطَشَّرُونَ** کہا گیا ہے۔

اقبالؒ نے جاوید نامہ میں ترکی کے مشہور مدبر، سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی زبانی عجمی اسلام کے ان علمبرداروں کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ میرے نزدیک اس سے بہتر تصویر کشی اور تحقیقت نگاری

کارِ ملا

شاید ہی کہیں اور مل سکے، غور سے سنئے کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ کہتے ہیں: ۱۔
دین حق از کافری رسوا تر است زانکہ ملا موہن کا فر گہ است
اللہ کا دین ملا کے ہاتھوں، کفر سے بھی زیادہ ذلیل و رسوا ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس کا کام یہ رہ گیا ہے کہ (بجائے
اس کے کہ وہ کافروں کو مسلمان کرے)، اُلٹا مسلمان کو کافر بنا کر ملت کی چھانٹی کر تاجلا جاتا ہے۔ اس کا شبوہ
ہی کافر گری ہے۔ ۲۔

شبنم مادر نگاہِ مایم است از نگاہِ اویم ما شبنم است

ہماری نگاہوں میں اُمت کا ہر فرد متنازع گہراں بہا ہے کہ: ۱۔
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ
لیکن ان کے نزدیک اپنے فرستے کے سوا سب مسلمان جہنم کا ایندھن ہیں۔ ان کی قیمت پر کراہ جتنی بھی نہیں۔
از سنگِ فیہائے اُس قسَمِ فروش دیدہ ام روح الامیں را در فروش
یہ قرآن فروش جس نے مذہب کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے ایسی عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے کہ ان سے جبریل امینؑ
تک بھی تلملا اٹھتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ان لوگوں کی دین فروش کی متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ایک مستقل موضوع ہے اور فیصل
کا متقاضی جس کے لئے سرِ دست نہ فرصت ہے نہ گنجائش۔ اختصاراً یہ ایک شعر ہی کافی ہو گا کہ ۳۔
بہی شیخ حرم ہے جو چہا کہ بیچ کھاتا ہے گلیم بوذر و دلق او پس و چادر ز ہری
بات جاوید نامہ کی نظم کی ہو رہی تھی۔ اس کا اگلا شعر ہے: ۴۔

زانسوائے گردوں و شش بیگا نہ نزد او اُم الکتاب افسانہ
حقائق قرآنی کے سرچشمہ، یعنی علم خداوندی سے وہ شناسا تک نہیں۔ اس کے نزدیک خدا کی کتاب، قصے، کہانی
اساطیر الاولین کے سوا کچھ نہیں (معاذ اللہ) افسانوں کا مجموعہ!
بے نصیب از حکمتِ دینِ نجس آسمانش تیرہ از بے کو کبی

وہ اس دین سے جسے حضور نبی اکرمؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ قطعاً بے خبر ہے۔ جس آسمان کے نیچے وہ زندگی بسر کرتا ہے اس میں ایک چمکتا ہوا ستارہ بھی نہیں اس لئے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا رہتا ہے،

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گہ د ملت از قال و اقوالش فرد فرد
وہ بے حدنگ نظر ہے۔ کور ذوق ہے اور اس کے ساتھ یہودہ گو بھی۔ اس کی بحث و جدل سے اُمت
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔ ملت فرقوں میں بٹ چکی ہے۔

مکتب و مِلّٰ و اسرار کتاب کور مادر زاد و نور آفتاب
صدیوں کی کورانہ تقلید اور علم و عقل سے نفرت و عداوت کی وجہ سے اس کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں سلب
ہو چکی ہیں۔ اس لئے خدا کی کتاب کے رموز و حقائق کا سمجھ سکتا اس کے بس کی بات نہیں۔ ایسے ہی جس طرح
کسی پیدائشی اندھے کو لاکھ سمجھاؤ۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آسکتا کہ روشنی کسے کہتے ہیں؟
اقبالؒ کی حق گوئی اور تلخ نوائی کا مقطع یہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اس موضوع میں حرف آخر کا حکم رکھتا
ہے کہ :

دین کافر، فکر و تدبیر جہادِ دین مِلّٰ فی سبیل اللہ فساد

کفار کا کیش و مسلک تو یہ ہے کہ جہاد للبقار اور تسخیر کائنات کے لئے کیا
کیا تدبیریں سوچی اور اختیار کی جائیں اور ان حضرات کا مذہب و مشرب
یہ کہ خدا کے نام پر کس طرح فسادات کھڑے کئے جائیں۔

یوں تو اقبالؒ کا سارا کلام ہی بلند ترین حقائق اور حسین ترین شریعت کا مرتع ہے۔ لیکن بعض مقامات
پر اس کی رعنائی، گوہر تابناک کی طرح جگمگا اٹھتی ہے۔ مثلاً کے برپا کردہ فساد کو "فی سبیل اللہ فساد کہنا اقبالؒ
ہی کا حقہ ہو سکتا تھا۔

اس "فی سبیل اللہ فساد" کو انہوں نے دوسرے مقام پر ذرا شوخ انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا
ہے کہ قیامت میں :

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن نہ سکا
عرض کی میں نے الہی مری تعمیر معات
نہیں فردوس مقام جہل قال و قال !
ہے بد آموزی اقوام و ملل کام اس کا
حتیٰ سے جب حضرت ملا کو ملا حکم بہشت !
خوش آئی گئے اسے حور شراب و لب کشت !
بحث و تمکد اس اللہ کے بندے کی مرشت !
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ نکشت !
فساد کا آدین جرثومہ نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور ان حضرات کے مذہب و مسلک کی بنیاد ہی نفرت پر ہوتی ہے۔
اس سے بڑھ کر نفرت اور کیا ہوگی کہ یہ اپنے فرقہ کے سوا تمام (غیر مسلم تو ایک طرف خود) مسلمانوں کو چھٹی قرار
دیتے ہیں۔ یہ نفرت فریق مقابل کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی بدستور (بلکہ پہلے
سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ) باقی رہتی اور نمودار ہوتی ہے۔ ترکی کے ملاح آنا ترک اور اس کی پارٹی کے خلاف
تھے۔ یہ ۲۲-۱۹۲۱ء کی بات ہے۔ اس کے چالیس پینتالیس سال بعد :-

”آنا ترک کے ایک ساتھی، عمران اوکتم کی میت نماز جنازہ کے لئے جامع مسجد میں لائی گئی۔ تو
خطیب نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرنا شروع کر دیا کہ وہ اس مرتد کی نماز جنازہ نہیں پڑھائیں گے
اور نہ ہی دوسرا کوئی مسلمان نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس پر آنا ترک کے ایک اور ساتھی، جنرل عصمت
الوزا کے بڑھے اور انہوں نے اعلان کیا کہ جب تک عمران اوکتم کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جاتی وہ
گھر واپس نہیں جائیں گے۔ ان کے اس اعلان پر بہت سے لوگ جن کی داڑھیاں تھیں ان کی طرف
بڑھے۔ جب صورت حال نازک ہو گئی تو ترکی کی فوج کے جنرل نبی الپرتم نے پستول نکال لیا۔ انہوں
نے کہا کہ اگر کسی شخص نے ۸۵ سالہ جنرل الوزا کو ہاتھ لگایا تو وہ گولی چلانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس
طرح جنرل الوزا کو زخمی سے بچا لیا گیا۔ (بحوالہ مشرق ۶ مئی ۱۹۶۹ء)

عمران اوکتم (جن کے جنازہ کے ساتھ یہ کچھ کیا گیا) ترکی کی سپریم کورٹ کے صدر تھے اور ان کا جرم یہ تھا کہ
آنا ترک اور عصمت الوزا کے ساتھیوں میں سے تھے۔ آنا ترک اور عصمت الوزا کے ساتھ ہزار اختلاف کے باوجود
ایک دنیا جانتی ہے کہ اگر ۱۹۲۲ء میں یہ جانا بزا اپنے مرتدھیلیوں پر رکھ کر آگے نہ بڑھتے تو یہ خطیب صاحب اور
ان کی مسجد اہل صلیب کے تسلط میں ہوتی۔ لیکن مولوی صاحبان کو اس سے کیا غرض۔ ان کا کام تو مسلمانوں
کو کافر اور مرتد قرار دینا، ان کی زندگی میں ان کی بیویوں پر طلاق وارد کرنا اور مرنے کے بعد ان کی نماز جنازہ کو ناجائز
قرار دینا ہے۔ اس کے مظاہرے آپ آئے دن یہاں بھی دیکھتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت کی پرورش اور حوصلہ افزائی کرتی ہی اس لئے ہے کہ یہ اس کی اپنی بقاء اور استحکام کا ذریعہ بنتی ہے۔ بنو ہاشم شیر حاصل کرنے والے مستبد حکمران کو تطلّ اللہ علی الارض کی حیثیت سے منوانا مذہبی پیشوائیت ہی کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ اربابِ اقتدار، لاکھ زور لگاتے، از خود ایسا بن سکتے تھے۔ نہ منوا سکے۔ انا ہی نہیں۔ اربابِ اقتدار جو کچھ کرنا چاہتے اس کے جواز اور عین مطابق اسلام ہونے کا فتویٰ ان حضرات سے حاصل کر لیتے تھے۔ اس طرح ان حکمرانوں کی رعایا ان کے ظلم و استبداد اور سلب و نہب کو بطیب خاطر برداشت کر لیتی تھی کہ دین کے یہ مدعی اسے منشاء خداوندی کہہ کر عوام کو مطمئن کر دیتے تھے۔

اقبال کے الفاظ میں۔

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پر رضا مند تاویل مسائل کو بناتے ہیں بہانہ
ان کی اس قسم کی دین فروشی اور دیدہ دلیری کو دیکھ کر اقبالؒ کا دل درد مند پکارا اٹھتا تھا کہ: سہ
سینہ افلاک سے اٹھتی ہے آہ سوزناک مرد حق ہوتا ہے جب مرعوب سلطانِ امیر
یہ سیاستِ ملوکیت کی انتہائی چابکدستی تھی کہ اس نے امورِ مملکت تو خود اپنے ہاتھ میں رکھے اور نکاح طلاق وغیرہ مسائل مذہبی پیشوائیت کے سپرد کر کے انہیں مطمئن کر دیا کہ حکومت کا ایک شعبہ ان کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ امورِ سیاست سے بر حضرات یکسر بے بہرہ رہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران جس طرح یہ لوگ ہندو عیار کے ہاتھوں میں کھلونے بن کر کھیلے رہے۔ اسے دیکھ کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟

اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دورِ رکعتِ امام!

(غیر منقسم) ہندوستان میں، جب تحریکِ خلافت کے زمانے میں علماء حضرات کو پہلی بار سیاست میں لایا گیا، تو ان کی اس میدان میں ہتی ماندگی اور ناجذبہ کاری کی بنا پر اقبالؒ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے اکبر شاہ خاں صاحب (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:-

”اے نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ در مولویوں کا اثر مرستہء عمان کی تحریک سے بہت کم ہو گیا

تھا۔ مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتویٰ کی خاطر ان کا اقتدار پھر ہندو مسلمانوں میں قائم کر دیا

ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔“

پھر انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ اپریل کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ :

”تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ ادھام میں جکھڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو بحیرہ تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی انگلیں کو محسوس کرنے لگ جائے۔“

علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ ان علماء کو میدان سیاست میں لانے کی جو غلطی قوم نے کی ہے اس کا احساس اس زمانے تک کسی کو نہیں ہوا تھا، سو اس کا احساس تحریک پاکستان کے زمانے میں ہوا۔ ہندوؤں نے انہیں اپنا آلہ کار بنایا اور قوم کی بیشتر توانائیاں وقت اور پیسہ ان کی مخالفت کی مدافعت میں ضائع ہو گیا۔ یہ کہتے تھے کہ جب ہندو ہمیں مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے تو مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کی ضرورت کیا ہے؟ یہ وہی مذہبی آزادی تھی۔ جو انہیں اپنے دور ملکیت میں حاصل تھی۔ یہ اسی کو اسلام کی آزادی سمجھتے تھے۔ اسی بناء پر علامہؒ نے کہا تھا کہ :-

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنیؒ ان علماء کے سرخیل کچے جاتے تھے۔ وہ حقیقی اسلام کے مبادیات تک سے کس قدر نا آشنا تھے۔ اس کا اندازہ اس بحث سے بخوبی لگ سکتا ہے جو مسلم قومیت کے مسئلہ پر ان کے اور علامہ اقبالؒ کے مابین ہوئی تھی اس کی یہی وجہ تھی کہ ان کے نصاب تعلیم سے علوم سیاسیات اور قرآن و دینوں خارج تھے۔ جبہ وقتہ میں بلکوس حضرات، اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے متعلق بار بار کہا کرتے تھے کہ یہ مغرب زدہ انگریز پرست، اسلام نا آشنا، سٹر قسم کے لوگ محمد و مبین ہیں۔ یہ کیا باتیں اسلام کے کہتے ہیں؟ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہؒ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ :-

مجھ کو تو سکھا دی ہے افریغ نے زندگی اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمان!

اس وقت ہمارے ایوانِ قانون سازی میں جو دھول اُٹ رہی ہے، اس کے ذمہ دار کبھی انہی حضرات کے باہمی اختلافات ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۱ء میں بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ ہم نے اپنے اختلافات مٹائے ہیں اور قانون سازی کی متفق علیہ بنیاد فراہم کر لی ہے۔ وہ بنیاد کیا تھی؟ یہ کہ ملک کے قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہوں گے۔ اس باہمی اتفاق کی حقیقت کیا تھی اس کے متعلق اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ

اختلافات

کتاب کا لفظ تو محض برائے وزن بیت تھا۔ جہاں تک سنت کا تعلق ہے (سنت کا کوئی متفق علیہ مجموعہ تو ایک طرف۔ سنت کہتے کسے ہیں؟ اس پر بھی سب کا اتفاق نہیں۔ ان کے سب فرقوں کی سنت الگ الگ ہے۔ اسی پر تو ان کے فرقوں کی بنیاد ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں سوچئے کہ کیا اس بنیاد پر ملک کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے جسے یہ سب اسلامی تسلیم کر لیں۔ ہم حیران تھے کہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت بھی ہمارے واضحین قوانین کو نظر نہیں آئی؟ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ دھند چھٹ رہی ہے اور روشنی کی کرن ان حضرات کو دکھائی دینے لگی ہے۔ اگلے دنوں، مجلس شوریٰ کے صدر محترم خواجہ صفدر صاحب نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ:

”ملک میں مکمل اسلامی نظام کی راہ میں فقہ کا اختلاف ایک رکاوٹ ہے۔ ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان اختلافات کو ختم کئے بغیر ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ حماقت ہوگی۔۔۔۔۔ انہوں نے ایک بار پھر کہا کہ مختلف مکاتب فقہ کا باہمی فقہی اختلاف تاخیر کا باعث بن رہا ہے اور ہمیں زیادہ سوچ بچار کے بعد ایسا متفقہ لائحہ عمل تیار کرنا ہے جو انتشار کی راہیں بند کر دے۔“ (جنگ - لاہور - ۲۷ مارچ ۱۹۸۳ء)

ان (مزعومہ) کوششوں کے بارے میں جو اختلافات مٹانے کے سلسلہ میں کی جا رہی ہیں۔ خواجہ صاحب نے دوسرے موقع پر فرمایا:-

”ان فقہی اختلافات پر علمائے کرام غور کر رہے ہیں۔ ان کا حل نکالا جائے گا۔ یہ اختلافات طے کئے بغیر فوری طور پر اسلامی قوانین کا نفاذ انتشار کا باعث بنے گا۔“

(جنگ - لاہور - ۲۶ مارچ ۱۹۸۳ء)

ہم نہیں سمجھتے کہ محترم خواجہ صاحب جیسا پختہ کار، صاحب دانش و بینش سیاست دان اتنی سی بات بھی نہ جانتا ہو کہ جو علماء ہزار برس میں اتنا سا باہمی اختلاف بھی نہ مٹا سکے ہوں کہ نماز میں آئین اویچی آواز سے کہنی چاہئے یا نیچی

اُدا سے اور تراویح اٹھ پڑھنی چاہئیں یا نہیں، وہ ان فقہی اختلافات کو مٹا سکیں گے جو ملکی قوانین کی تدوین کی راہ میں حائل ہیں؟ ہم سے تو غالب زیادہ معاملہ فہم تھا جو جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ، ”ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟“

ان کے یہ اختلافات آج کے پیدا شدہ نہیں (اقبال کے الفاظ میں) ”دیرینہ ہے تیرا مرض کوڑنگا ہی“۔ یہ روایات اور فقہ کے اولین دور ہی میں پیدا ہو چکے تھے۔ اس کی ایک مثال علامہ محمد اسلم حیراج پوریؒ نے اپنی کتاب، ہمارے دینی علوم، میں ان الفاظ میں پیش کی ہے :-

”روایا کا یہ اختلاف دیار و امصار، یعنی حجاز و عراق وغیرہ پر محدود نہیں تھا بلکہ ایک ہی مقام میں مختلف اور متضاد روایتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ عبدالوارث بن سعید کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ”میں مکہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں عراق کے نامور فقہاء، حج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے میں امام ابو حنیفہؒ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بیع میں بائع اگر کوئی شرط لگائے تو کیا وہ جائز ہوگی؟ جواب دیا کہ بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی۔ پھر میں نے ابن ابی لیلیٰ سے بھی جا کر یہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کے بعد ابن شبر مہر سے جا کر دریافت کیا۔ بولے بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔“

میں نے دل میں سوچا کہ سبحان اللہ! یہ تینوں فقہاء ایک ہی جگہ کے ہیں اور ان میں ایک ہی مسئلہ میں راویوں کا اس قدر اختلاف!

اب دوبارہ میں ابو حنیفہؒ کے پاس گیا اور ان سے یہ سب باتیں کہیں، فرمایا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں۔ مجھے تو حدیث ملی ہے :-

حدثني عمر و بن شعيب عن أبيه عن جده قال قال

رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع و شرط

”یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ شرط ممنوع فرمائی۔“

یہ سن کر میں ابن ابی لیلیٰ کے یہاں پہنچا اور ان سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ حدیثی

ہشام عن عودة عن أبيه عن عائشة قالت امرني رسول

الله أن اشترى بريمية فاعتقها فاشترط أهلها الولاء

لأنفسهم فقال رسول الله ﷺ ما كان من شرط ليس في كتاب الله فهو باطل۔

”یعنی حضرت عائشہؓ فرمائی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کر دوں۔ اس کے مالکوں نے شرط یہ کی کہ وہ ان کی رہے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔
اب ابن شبرمہ کے پاس آیا۔ انہوں نے سب کچھ سُن لیتے کے بعد کہا کہ حد ثنی مسعر بن کدام عن محارب بن دثار عن جابر قال بُعِثَ النَّبِيُّ بَعِيرًا أَوْ شَرِطَتْ لِي حِمْلَانَهُ إِلَى مَدِينَةٍ۔“ یعنی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا اور میری شرط یہ منظور کی گئی کہ اس پر لہ کر مدینہ تک جاؤں گا۔“

اس پر علامہ موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں، چار سطروں میں جو تبصرہ فرمایا ہے وہ اپنے مقام پر منفرد ہے۔ فرماتے ہیں :-

”مگر اس کا الزام صرف روایات کے اختلاف پر نہیں بلکہ مذہبی انفرادیت پر بھی ہے۔ اگر اجتماع مرکز، فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں میں بڑے کہ وہ فرقوں میں تقسیم نہ ہو جاتی۔ اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔“

روایات اور فقہ کے یہ اختلاف اسی ایک مسئلہ میں نہیں۔ زندگی کے ہر گوشے اور ہر معاملہ میں یہی کیفیت ہے اور مشکل یہ ہے کہ کوئی فرقہ اپنے معتقدات یا مسائل میں ذرا سی تبدیلی کے لئے بھی تیار نہیں۔ ان حالات میں آپ سوچتے کہ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ یہ حضرات کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر سکیں یا کسی ایسے ضابطہ پر متفق ہو سکیں جس میں ان کے اختلافات کی گنجائش نہ ہو۔ ایسا سمجھنا خوش فہمی ہے۔ یہی نہیں خود فریبی ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ان کا تشخص ان اختلافات کی غیر متبدل حدود سے متعین ہوتا اور قائم رہتا ہے۔ یہ اختلافات مٹ جاتیں تو ان کی جدا گانہ ہستی ہی ختم ہو جائے۔ توجید کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اختلافات کے ثبت باقی نہیں رہتے۔ غالب نے کس قدر عمیق اور بلیغ انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ :-

ہم متحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایں گئیں
یہ حضرات بڑے دعوے سے کہا کرتے ہیں کہ اس بات کا ثبوت کہ ہمارے اختلافات مٹ سکتے
ہیں، تحریک نظام مصطفیٰ کا متحدہ محاذ ہے جس میں مختلف فرقوں کے علماء اپنے اختلافات مٹانے ہوئے
شانہ نشانہ جادہ پیما تھے۔ ان حضرات کے اختلافات کس حد تک مٹ چکے تھے۔ اس کا اندازہ دو ایک
واقعات سے لگائیے۔ مفتی محمود (مرحوم) نے حیدرآباد پریس کلب میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے
مودودی صاحب (مرحوم) کے متعلق فرمایا تھا:-

”مودودی نے جمعیت العلماء کے مولویوں کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ مودودی کو فتویٰ دینے کا حق
حاصل نہیں ہے۔ میں اب تک پندرہ ہزار فتوے دے چکا ہوں اور وہ سب مجلہ کتابوں میں موجود
ہیں۔ میں آج اس پریس کلب میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مودودی، گمراہ، کافر اور خارج از اسلام
ہے۔ اس سے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا، ناجائز
اور حرام ہے۔ اس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے۔
وہ امریکہ اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے۔ اب وہ موت کے آخری کنارے پہنچ چکا ہے
اور اب اسے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کا جنازہ نکل کر رہے گا۔“
(ہفت روزہ زندگی۔ لاہور۔ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۶۹ء)

متحدہ محاذ میں شمولیت کے باوجود، نہ مفتی صاحب نے اپنے اس فتویٰ کو واپس لیا تھا اور نہ ہی مودودی
صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

جمعیت العلماء اسلام اور جمعیت العلماء پاکستان، دونوں اہل سنت والجماعت کے حنفی فرقہ سے تعلق رکھتی
ہیں۔ دونوں متحدہ محاذ میں شامل تھیں لیکن اس کے باوجود باہمی اختلافات کی کیفیت یہ تھی کہ:-
”۲۵۔ اگست ۱۹۷۷ء کی شام، پاکستان متحدہ محاذ کے بڑے بڑے لیڈر جب افطاری کرنے لگے
تو اسلامی اخوت اور نظام مصطفیٰ کے قیام کے دعوے داروں کے درمیان ایک عجیب منظر دیکھنے
میں آیا۔ یہ لیڈر جب افطاری کر چکے تو نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگ وہاں یہ دیکھ کر حیران
رہ گئے کہ مفتی صاحب اور نواب زادہ نصر اللہ شاہ دس بارہ آدمیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑے۔“

اور ان نمازیوں کی امامت مفتی صاحب نے کی۔ جب کہ مولانا نورانی اور میاں طفیل محمد دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ یہاں شاہ احمد نورانی نے جماعت کرائی اور تحریک استقلال کے میاں محمود علی قصوری نے بھی نورانی صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔

(مسادات - ۲۶، اگست ۱۹۷۷ء)

اس سے واضح تر، مولانا نورانی کی وہ تقریر ہے جو معاصریشیا کی (۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء) کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے فرمایا تھا:-

”ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں اور مولانا عبدالستار نیاز سی، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور مولانا سید حسین الدین شاہ صاحب، یہ ابھی تین چار روز پہلے (۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء - جمعرات) کا ذکر ہے کہ ہم سب جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لئے گئے تاکہ دارالعلوم اور ایک مسجد کاسنگ بنیاد ان سے رکھوایا جائے تو جب ان سے باتیں ہو رہی تھیں، انہوں نے یہ فرمایا، میں نے سنا ہے کہ آپ بڑے وسیع القلب ہیں، آپ میں بڑی رواداری ہے۔ آپ میں بڑی فراخ دلی ہے اور پھر فرمانے لگے کہ اسی فراخ دلی کا نتیجہ ہے کہ جب آپ سہالہ میں تھے۔ قید کے ان لمحات میں رواداری اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلاں صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے یہ رپورٹ ملی ہے۔ میں سن رہا۔ جب ان کی بات ختم ہو گئی تو میں نے جواباً عرض کیا۔ جنرل صاحب بڑا افسوس ہے۔ آپ کو غلط اطلاعات دی گئیں۔ ہم میں الحمد للہ بڑی وسعت قلب ہے لیکن گستاخ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہیں۔ ہم میں رواداری ہے لیکن حضور پر نورؐ کی شان میں تہمتیں کرنے والے کے لئے کوئی رواداری نہیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہل سنت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلویؒ کا لکھا ہوا مجموعہ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے جس میں علماء حرمین شریفین کے فتویٰ موجود ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے۔ ہم الحمد للہ! اس فتوے پر عمل کرتے ہوئے کوئی بھی شخص ہو خواہ ڈیرہ اسماعیل خان کا ہو، ملتان کا ہو، ایچھرہ کا ہو کسی شاہم رسولؐ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اور میں نے کہا۔ جناب والا! یہ چار چار ٹکے کے لوگ ہیں، ہم تو حرمین شریفین کے سجدی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے یہ ملا جو چار ٹکے کے ہیں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ

کو یہ غلط اطلاع ملی ہے، آپ مطمئن رہیں، ہمارے مسلک میں ایسی رواداری، فراخ دلی اور وسعت قلبی نہیں ہے۔ ہمارے قلب میں شاہم رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہ آج ہے نہ آئندہ ہوگی اور اس کے لئے لوگ بہت سی باتیں کہتے ہوں گے۔ قومی اسمبلی میں بھی اذان ہوتی تھی علامہ ازہری موجود ہیں۔ ان لوگوں کا رخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رخ ان سے دوسری طرف۔ اس کے دیکھنے والے ایک نہیں، دو نہیں بے شمار لوگ ہیں؟

(بحوالہ طلوع اسلام۔ بابت فروری ۱۹۷۸ء ص ۶۷)

یہ بھی نظامِ مصطفیٰؐ کے لئے جہاد میں ان کی صفوں میں اتحاد کی عملی شکل! وہ اتحاد کسی مذہبی مقصد کے لئے تھا ہی نہیں، سیاسی مفاد کے لئے تھا۔ مقصد مذہبی ہوتا تو اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جوں ہی وہ مقصد ختم ہوا، وہ اتحاد بھی کالعدم ہو گیا۔

ملوکیت کا مفاد اسی میں ہوتا ہے کہ یہ حضرات ایسے بے کار مسائل کے متعلق بحثوں میں الجھے رہیں جن کا زندگی کے عملی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اور قوم تشقت و انتشار کا شکار رہے۔ مثلاً، سے

ابن مریم مرگیا یا زندہ جاوید ہے
آئے والے سے میرج نامری مقصود ہے
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

میں صفات ذات حق حق سے جدا یا عین ذات
یا مجتہد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

غرضیکہ :-

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
جس اسلام کی قوم کو تلقین کی جاتی ہے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنی
اسی نظم میں جس کے چند اشعار پیش خدمت کئے گئے ہیں۔ ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے کہلوا یا ہے :-

ہے اذل سے ان عزیز ہوں کے مقتدر ہیں بخود
آرزو آدل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
یہ ہماری سچی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
ان کی فطرت کا تعاضا ہے نماز بے قیام
ہو کہیں پیدا تو مرجانی ہے یا رہتی ہے خام
صوفی و مثلاً ملوکیت کے بندے ہیں تمام

اور آخر میں یہ کہ :-

ہے طواف حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام

اس کی تیغ بے نیام کے کُند ہو کر رہ جانے کی اس سے بڑی اور زندہ شہادت کیا ہو سکتی ہے کہ ابھی کل کی بات ہے فلسطین اور لبنان کی سرزمین بے گناہ مردوں، مظلوم عورتوں اور معصوم بچوں کے خون سے لالہ زار بنتی رہی اور اب تک بن رہی ہے۔ لیکن مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک دیکھئے تو ان آزاد مملکتوں کے مسلمانوں کی تلواریں سب کی سب کُند ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایک بھی فضا میں نہیں ابھری۔ اور اس تمام دوران میں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں مسلمان حج کا مقصد سے فریضہ ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے اور عرفات کے میدان میں دشمنان اسلام کی ذلت و خواری کی دعائیں مانگ کر اپنے ممالک کی طرف واپس آتے رہے ہیں اور اب تک یہ سلسلہ جا رہا ہے۔ آسام کے مسلمان، یا بھڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں یا ڈھور ڈنگ کی طرح اپنے گھر و سے باہر مانگے جا رہے ہیں۔ خونِ مسلم کی اس بے پناہ ارزانی کے خلاف کہیں سے آواز تک نہیں اٹھتی۔ البتہ ایک ایک مسجد کے چار چار لاڈلے سپیکروں سے ذکر و فکر کی مٹھلیں گرم کر کے جنت میں مٹلاتے تعمیر کرانے کے اعلانات مسلسل و پیہم فضا میں گونجتے رہتے ہیں۔ یہ سب اس اسلام کی برکات ہیں جس کے بیج ہمارے دورِ طو کثیت میں بوئے گئے اور جسے آج استعماری قوتوں کی نوازش ہائے گداں مایہ سے پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ اقبالؒ بہت پہلے اس گمراہ کو سمجھا گیا تھا کہ :-

پس راکفت پیسے خرقر بازے ترا ایس نکتہ باید حذر زجاں کرد
بہ نمرودان اس دور آشنا باش ز فیض شاں برابری توں کرد

(ارمغانِ حجاز)

”ایک عیارِ جُبہ پوش نے اپنے بیٹے سے کہا کہ میں نہیں ایک گمراہ بتلاتا ہوں جسے اچھی طرح گمراہ میں باندھ لو۔ وہ گمراہ ہے کہ اس دور کے نمرودوں کے ساتھ یاد نہ رکھو، اور ان کے فیوض و اکرام سے ”اسلام کا جھنڈا“ بلند کرتے رہو۔“

اس دور کے نمرودوں نے اس مقصد کے لئے سب سے پہلا دانہ اس وقت پھینکا جب انہیں کمیونزم کی یلغار کو روکنے کے لئے، مسلم ممالک کی تائید اور حمایت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس کے لئے انہوں نے انہیں سیاسی دعوت نہیں دی۔ ان کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا۔ انہوں نے آواز دی کہ :-

” دنیا کے خدا پرستو! اؤ! اس الحاد اور بے دینی کے خلاف متحہ مماؤ بنائیں۔“
 قرآن کی دوسے جس طرح پچیس خدا کا منکر ہے اسی طرح مغرب کی عیسائی اقوام بھی اس کی منکر ہیں۔ وہ ان دونوں میں فرق نہیں کرتا اور دونوں کو اس خدا پر ایمان لانے کے لئے کہتا ہے، جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس دعوت پر گھی کے چراغ جلانے اور اس پر بجیک کہتے ہوئے ان کی طرف دوستی (کیا؟ ذی دوستی) کا ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ اگر سرمایہ دار اقوام مغرب کا یہ ہلاک فی الواقعہ مسلمانوں کی حمایت چاہتا ہے تو انہیں یہ دعوت ان کی مذہبی پیشوائیت کو دینی چاہیے۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے بلیک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

” اگر یہ ہلاک فی الواقعہ چاہتا ہے کہ کمونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ اسے مسلم ہلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سچے کام ہنے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں... مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جبر پالیسی اب تک چلی آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو سکے؟“

(اخبار نسیم، مورخہ ۱۶، ۲۰، دسمبر ۱۹۵۵ء)

بات بالکل واضح تھی۔ مسلم ممالک کے عوام مذہب پرست واقعہ ہوئے ہیں۔ اس لئے اس ہلاک سے جو کچھ کہا جا رہا تھا وہ یہ تھا کہ تم ان ممالک کے حکمرانوں کے بجائے وہاں کی مذہبی پیشوائیت سے معاملہ کرو۔ وہاں کے عوام کا تعاون بھی نہیں حاصل ہو جائے گا اور حکمرانوں کا بھی، کیونکہ جب ہم کہیں گے اس ہلاک کی حمایت اسلام کا تقاضا ہے تو ان (حکمرانوں) کو جرأت نہیں ہوگی کہ وہ اس کے خلاف جاسکیں۔ اس ہلاک اور ہماری مذہبی پیشوائیت میں اس باب میں کس قسم کی سودا بازی ہوئی اس سے پہلے تو یہ راز ہی تھا لیکن اب اس تحریک کی شکل میں مبین ہو گئی ہے۔ جسے فنڈ امینٹل ازم کہا جاتا ہے۔ اس کے مراکز مغربی ممالک میں ہیں اور شاخیں مسلم ممالک میں (سرطان کی طرح ابھیلی ہوئی ہیں۔ زروسیم کے چٹھے وہاں سے اُبلتے ہیں اور ان کے صدقے، ان کی منشاء کا ”اسلام“ ساری دنیا میں پھیلا یا جا رہا ہے۔ اسلامک مشن، اسلامک سنٹرز، اسلامک کانفرنسیں

اسلامک سیمینار۔ اور نامعلوم کیا کیا "اسلامک" ؟ اور پھر، اس مقصدِ جلیلہ کی خاطر، ہمارے مذہبی راہ نما جس طرح سال کا اُدھا اُدھا حقہ، ان ممالک کے اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں گزارتے ہیں، وہ کس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے ؟ اس تناظر میں آپ کی سمجھ میں یہ بات اُجائے گی جسے اس دیدہ ورنے پچاس سال پہلے کہا تھا کہ :-

بہ نمرودانِ اِس دور آشنا باش ز فیضِ شاہِ براسی، تو اں کہد
 اس طرح وہ خطہ ٹل گیا جو ہمارے دور کی ملوکیت اور سرمایہ داری کو عفریت کی طرح ڈراتا تھا کہ :-
 عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے لیکن بخوف ہونہ جائے اسکا شرع پیغمبر کہیں
 ان سے کہہ دیجئے کہ آپ ان خرقہ بازوں سے ساز باز رکھئے اور چین کی نیند سوئیے۔ یہ شرع پیغمبر کو کبھی اسکا راہ نہیں
 ہونے دیں گے کہ اس سے تمہارا ہی نہیں، خود ان کا مفاد بھی وابستہ ہے۔

والسلام

پروردگار

خلق خدا کی گھات میں زند و قیہ مسر پر

سزیزان گرامی قدر اسلام و رحمت

آج کی تقریب اُس جلیل القدر، نادرہ روزگار ہستی کی یاد میں منعقد کی گئی ہے جس کا نام ہمارے محسنین ملت کی فہرست میں سرعنوان آتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے ارباب دانش و پیش کو فکری اور تخلیقی اُفق پر ایک جہان نو سے روشناس کرایا۔ اسلامیان ہندوپاک کو اس الوہیاتی حقیقت سے متعارف کرایا کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے جس کا احیاء اور قیام صرف اپنی آزاد مملکت میں ممکن ہے اور پھر اس آزاد مملکت کے اسلامی خط و خال متین کہہ کے اس کے حصول کی راہیں متعین کیں۔ آج اگر ہمارا شمار دنیا کی آزاد قوموں میں ہوتا ہے تو یہ بنیادی طور پر اسی کی نگارہ دور رس اور حقیقت شناس کا تصدق ہے اور اگر اس خط زمین میں کبھی صحیح اسلامی (قرآنی) مملکت کا قیام عمل میں آیا، تو وہ بھی اسی قرآنی مفکر کے تصورات کی رہین منت ہوگی۔ خدا رحمت کند اس عاشقان پاک طینت را۔

علامہ اقبالؒ کو ایک شاعر یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ شاعر ہوا مفکر، وہ اپنے خیالات کی دنیا میں مستغرق رہتا ہے اور اسے دنیا کے ممکنات (انسان کی عملی زندگی) سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس شاعر اور مفکر کی کیفیت اس سے مختلف تھی۔ اس کی فکر کی ابتداء دنیا کے ممکنات کے سنوارنے سے ہوئی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ :-

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے سستی اندیشہ ہائے افلاک

یہ اس لئے کہ اُن کی فکر کا سرچشمہ خدا کی کتاب تھی، جس نے مومن کی زندگی کے سلسلہ میں اِتِّسَا
فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً پہلے کہا ہے اور فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً اُس کے بعد (پہلے) بِالْعَاطِرِ دیکھ، وہ

انسان کی موجودہ دنیا سنوارنے سے اس کی اخروی زندگی سنوارتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس کے نزدیک اخروی زندگی موجودہ زندگی کے تسلسل کا نام ہے۔ حیات ایک جڑے رول ہے جو یہاں سے وہاں تک مسلسل چلی جاتی ہے اس لئے جیسی یہاں کی زندگی، ویسی وہاں کی زندگی۔ مَن كَانَ فِي هَذِهِ اَعْمٰی فَلْهُوَ فِيْ الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (۱) جو یہاں اندھا ہے، وہ وہاں بھی اندھا ہوگا۔

وہ کل کے غم و عیش پر کچھ حق نہیں رکھتا جو آج خود افروز و مجسمہ سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائے شگامہ مندو جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

دنیاوی زندگی کا مدار سامانِ زلیت پر ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں رِزْق

رونی کی اہمیت

کہا جاتا ہے، اور ہمارے ہاں اسے ”رونی“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کیم نے رزق یا رونی کو کس قدر اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے فقہ آدم کے تمثیلی انداز میں جنت کی خصوصیت یہ بتائی ہے: وَكُلَّامِنْهَا رَغْدًا حَيْثُ شِئْتُمْ اَسْ (۲) اس میں جہاں سے کسی کا جی چاہے پیٹ بھر کر کھائے۔ یعنی اس میں رزق کے معاملے میں ”میری ادھر تیری“ کی تفریق نہ ہو۔ اس کا دسترخوان تمام نوبہ انسان کے لئے یکساں بچھا ہو۔ جہاں سے ہر شخص، اپنی ضرورت کے مطابق، بلا تکلف لے لے۔ دوسرے مقام پر اس کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کر دی: اِنَّ لَكَ اَلَا تَجُوعُ فِيْهَا لَا تَعْمٰی (۳) اِنَّكَ لَا تَظْمَؤُ فِيْهَا وَلَا تَضْحٰی (۴) اس میں بھوک، پیاس اور دھانسی کا سامان ہر ایک کے لئے یکساں موجود ہوگا، کوئی اس سے محروم نہیں ہوگا۔ یہ تو رہی جنت میں آدم کی زندگی۔ حضرت ابراہیمؑ جب خدا کے گھر کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو خدا سے پہلی دعا یہ مانگی کہ وَارْزُقْ اَهْلَكَ مِنْ التَّمْرَاتِ ... (۵) ”وہاں کے رہنے والوں کے لئے سامانِ رزق فراہم کیا جائے“۔ اس نے اقوامِ عالم کے لئے زندگی کی جن آسائشوں کا ذکر کیا ہے، ان میں رزقِ مرفہٰ رست ہے۔ سورہ نحل میں تمثیلاً ایک بستی کا ذکر ہے جو نعماءِ خداوندی سے متبع تھی۔ اس کے متعلق کہا کہ يٰۤاَيُّهَا رِزْقُهَا رَغْدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ ... (۶) ”اس کی طرف ہر گوشے سے سامانِ زلیت چلا آتا تھا“۔ اس نے قریش کو جن انعاماتِ خداوندی کی یاد دلائی تھی۔ اس کے متعلق کہا تھا: اَطْعَمْتُم مِّنْ جُوعٍ لَّوْ اَمْنْتُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۷) ”وہ رونی کی طرف سے مطمئن، اور خطرات سے مامون تھے“۔ اس نے بھوک اور خوف کو خدا کا عذاب بتایا ہے۔ جس بستی کا تمثیلی ذکر اوپر کیا گیا ہے کہ اسے سامانِ زلیت کی فراوانیاں حاصل تھیں۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ جب اس نے کفرانِ نعمت کیا تو: فَاذْقُمَا اللّٰهُ لِبَاسِ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ ... (۸)

”اس پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط ہو گیا۔ جہاں جتنی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ اس میں ضروریاتِ زندگی کی فراوانی ہوگی، اس کے ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی کہہ دی کہ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا۔ جو قوم قوانینِ خداوندی سے اعراض کرتے گی، اس کی روزی تنگ ہو جائے گی، وہ بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد ہے۔ وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى (۱۲۴) جس کی روزی یہاں تنگ ہوگی وہ قیامت میں بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔“

رزقِ کریم

لیکن قرآنِ کریم نے رزق کے ساتھ ایک شرط عائد کی ہے۔ یعنی رزقِ کریم، باعزتِ رونیٰ رزق حاصل کیا جاتا ہے، اور ایک وہ جس میں عزت و آبرو برقرار رہتی ہے۔ قرآنِ کریم کی رُوسے، ایمان و اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں جو مملکت حاصل ہوتی ہے، اسے استخلاف فی الارض، یعنی اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ (وَعَنْ اَللّٰهِ الَّذِیْ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَعْمَلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفْنَهُمْ فِی الْاَرْضِ ... (۲۵) اور اس اسلامی مملکت میں جو رزق حاصل ہوتا ہے، وہ اسے رزقِ کریم کہہ کر پکارتا ہے۔ قَالَ ذٰلِیْنِ اٰمَنُوْا وَاَعْمَلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ (۱۲۵) جو لوگ ایمان و اعمالِ صالحہ کے حامل ہوں گے، انہیں خطرات سے حفاظت بھی ملے گی اور رزقِ کریم، باعزتِ رونیٰ بھی۔ اس نے اسے رزقِ طیب بھی کہا ہے۔ یعنی خوشگوار، زندگی بخش اور پاکیزہ رزق۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نعمت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِیْ اِسْرٰٓءِیْلَ مُبَوَّأً صَدِیْقٍ وَّرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ ... (۱۲۶) بنی اسرائیل کو مکین عطا کیا اور رزقِ طیب۔ یہی مومنین کے متعلق کہا۔ مہاجرین اور مجاہدین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ (۱۲۷)۔ یہ بچے اور سچے مومن تھے۔ انہیں خطرات سے حفاظت اور رزقِ کریم حاصل تھا۔ اس کو اکلِ حلال کہا گیا تھا۔

اقبالؒ نے قرآنِ کریم کے اس بنیادی حکم کو پالیا تھا، اور حیرت ہے کہ اسے اس نے ابتدائی عمر ہی میں پالیا تھا۔ اس نے کالج کی تعلیم فارغ ہونے کے دو تین سال بعد جو اپنی سب سے پہلی کتاب تصنیف کی، اس کا موضوع تھا۔ ”علم الاقتصاد“ وہ فلسفہ کے طالب علم تھے۔ اقتصادیات ان کا مضمون نہیں تھا، لیکن ان کی نگاہ میں معاشیات کی اس قدر اہمیت تھی کہ انہوں نے سب سے پہلے اسی موضوع کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا۔ یہ کتاب علم میں شائع ہوئی تھی۔ جب ان کی عمر تیس تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں انہوں نے کہا تھا:-

”اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سبیل رواں میں، اصول مذہب اقبال اور غریبوں کی آپس“

سبھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے مشاہد اور تجربہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہر اور باطنی قوی کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا لوگوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوی انسان پر بہت برا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے بجائے آئینہ کو اس قدر رنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی، اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلم اول، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مذہب قوی محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ ثقافت مدارج، بجائے اس کے کہ قیام تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کہہ سنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک درو مند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحہ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے؟

(اقبال اور قرآن جلد ۱ صفحہ ۱۷۸)

یہ ایک فلسفہ کے طالب علم، نوجوان کے احساسات میں۔ آپ نے غور فرمایا کہ ان کا سینہ اسی زمانے میں غریبوں اور مفلسوں کے ساتھ ہمدردی کے جذبات سے کس قدر گداز تھا۔ اس کے بعد حصول تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے نظام سرمایہ داری کے خوبچاں، انسانیت کش مظاہر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ واپسی کے بعد انہوں نے ۱۹۱۱ء میں علیگڑھ میں وہ محرکہ آراء تقریر کی جس کی صدائے بازگشت آج تک برصغیر پاک و ہند کے درو پوار سے سنائی دیتی ہے (مولانا ظفر علی خان (مرحوم) نے اس تقریر کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ ملت بیضا پر عمرانی نظر۔ اس میں اقبالؒ نے کہا تھا:-

یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصاد

حالت نہایت ہی افسوس ناک اور قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں

جہاں کی آبادی کا جزو غالب مسلمان ہیں، معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اُجرت، غلیظ مکان

ملت بیضا پر عمرانی نظر

اور ان کے پیٹ بھر دینی ٹکے لئے ترستے ہوئے بچوں کا حسرتناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاپرواہی کے کسی اسلامی معلم میں جانکلو۔ ایک تنگ و تنابیک کو چہ پر تہا رسی نظر پڑے گی، جس کے وحشت زاسکوت کے ظلم کو وہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لاجبت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھاتی ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صد ہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے، لیکن آج فاقہ کمر رہی ہیں۔ کئی دن سے آناج کا ایک دانہ تک منہ میں اڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے اگے ہاتھ پساریں؟

اس کے بعد علامہ اقبالؒ عمر بھر بھوک اور افلاس کے خلاف مصروف جہاد رہے۔ اس کا علاج قرآن کا معاشی نظام تھا جس کا قیام اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور عطا فرمایا تھا۔ اپنی آزاد مملکت اور اس میں رزق کیم، باعزت روٹی ہر ایک کے لئے۔ اقبالؒ کا ابلسی نظام سرمایہ داری کے خلاف جہاد اس مقصد کے حصول کے لئے تھا۔

نظام سرمایہ داری کی بنیاد محنت کش طبقہ کا استحصال (EXPLOITATION) ہے۔ ہانگب دوا میں ان کی زہرہ گداز نظم ”خضر راہ“ کا ایک گوشہ اس استحصال کے خلاف نعرۃ انقلاب ہے۔ اس میں اقبالؒ کے سوال کے جواب میں ”خضر“ کہتا ہے۔

بندۂ مزدور

بندۂ مزدور کو حب کہ میرا پیغام دے
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ داری حیلہ گم
دست دولت آفریں کو مزدوریوں ملتی رہی
مکھ کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار

خضر کا پیغام کیا ہے؟ یہ پیغام کائنات
شاخ آہو پیر ہی صدیوں تک تیرا بہت
اہل ثروت نیسے دیتے ہوں غریب کو زکوٰۃ
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اچھ کہ اب ہنرم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں نیسے دور کا آغاز ہے

نظام سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) پر ہوتی ہے۔ اسی

العفو

دولت کے بل بوتے پر سرمایہ دار، دوسروں کی محنت کے حاصل کو چھین لیتا ہے۔ قرآن کی زبان میں فاضلہ دولت کو العفو کہہ کر پکارا گیا ہے اس کے نظام میں العفو کسی کے پاس نہیں رہتا۔ وَيَسْأَلُكَ مَاذَ اَيُنْفِقُونَ ۚ قُلِ الْعَفْوَ (۱۱۹) یہ سمجھتے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضرورت کے لئے دے دیں کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے، سب کا سب۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کے پاس فاضلہ دولت رہے گی نہیں، تو نظام سرمایہ داری خود بخود ختم ہو جائے گا۔ روس میں جب کمیونزم کا غلغلہ بلند ہوا تو وہ نظام سرمایہ داری کے خلاف انقلابی نعرہ تھا۔ اقبال نے اس سے محسوس کیا کہ زمانے کے تقاضے، شاید قرآن کے معاشی نظام پر پڑے ہوئے پردے اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گہری گفتار
انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدیج وہ اسرار
قراں میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جنت کردار
جو حشر قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو سردار

کیونکہ نظام سرمایہ داری کے خلاف برہنہ آواز تھی لیکن ذرا آگے چل کر اقبال

کیونکہ کا سقم

کی ننگی حقیقت شناس نے دیکھ لیا کہ کیونکہ کے فلسفہ کی رُو سے وہ جذبہ محرکہ میسر نہیں آسکتا جو العفو کے بارگاہ کا متمثل ہو سکے، اس لئے روس کا نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انہوں نے روس کو اس سے متنبہ کیا اور کہا:-

ایک ہی جونی نظام علی جستمہ اور اساس مجھے!

یہ اساس محکم قرآنی نظام میں مل سکتی تھی۔ چونکہ قرآنی نظام کا قیام، نظام سرمایہ داری کا تختہ الٹنے کے بغیر ممکن نہ تھا، اس لئے علامہ اس کے

لینن خدا کے حضور

خلاف، مختلف اسالیب و انداز سے ستیزہ کار رہے۔ ان میں سب سے زیادہ دلکش انداز وہ ہے جسے بال جبریل کی دوہیں مربوط نظموں میں اختیار کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے وہ لینن کو بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں۔ وہ خدا سے ان سوالات کے جواب مانگتا ہے جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے ہیں۔

وہ خدا سے کہتا ہے کہ ہمیں تو خدا کے متکبر و تکبر اور بے دین کہا جاتا ہے۔ لیکن میں، بعد ادب یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ۔

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سلطنت
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی مغرب کے خداوند، درختِ نہ فلذات

اہلِ مشرق، یورپ کے حکمرانوں کے پرستار ہیں اور اہلِ یورپ دولت کے پرستار، میں پوچھنا یہ
چاہتا ہوں کہ وہ انسان کہاں بے ہیں جو تیرے پرستار ہیں؟ مجھے تو وہ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

اقبالؒ نے لیتن کے مکالمہ پر دیکھے میں ایک بے باک حقیقت کو عیاں کیا ہے۔ یعنی اس

لیٹن

حقیقت کو کہ اس وقت دنیا میں خدا کی حکمرانی کہیں بھی نہیں، مشرق کی محکوم قوموں

کے خدا، مغرب کے حکمران ہیں۔ اور مغرب کے حکمران، دولت کے محکوم۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد مقامات
پر دہرایا ہے۔ کہیں کہا ہے کہ۔ نہ دیہ میں نہ حرم میں خودی کی میداری۔ کہیں یہ کہ۔ یہ تیرے کافر و مومن تمام
ذاتی۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں ہے۔

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

اس اعراض کے بعد پھر لیتن کی طرف آئے وہ خدا سے کہتا ہے۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبیر یہ حکومت پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جہاد، سود ایک کالا کھول کے لئے مرگِ مناجات

اس کے بعد وہ ذرا کھل کر بات کرتا ہے اور کہتا ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں میں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات

میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تیری منتظرِ یومِ مکافات

یہ سوال فرشتوں کے دل کو بھی وقفِ اضطراب کے ہوئے تھا۔ جسے حضرت

علامہؒ اگلی نظم میں سامنے لائے ہیں، قرآن میں، قصہٴ آدم کے سنن میں،

فرشتوں کا گیت

وجود حقیقت تمثیلی انداز میں خود آدمی کی داستان سہما کہا گیا ہے کہ خدا نے ملائکہ سے کہا کہ (إني محبا علىٰ

فی الخوض خلیفتم...) ط (دیکھا) میں دنیا میں ایک صاحب اختیار مخلوق پیدا کر رہا ہوں اس پر

فرشتوں نے کہا: اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ؟ ﴿۱۰۰﴾ "بادالہا! کیا تو کمرہٴ ارض کو ایسی مخلوق کے سپرد کرنا چاہتا ہے جو وہاں خونریزیاں اور فسادانگیزیاں کرے گی؟" جواب ملا: اَلَيْسَ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۰۱﴾ "ہم وہ کچھ جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔" لے

یہ سن کر فرشتے خاموش ہو گئے۔ خاموش تو ہو گئے، لیکن دل میں یہ کھٹک رہی کہ دیکھیں اس مخلوق جدید میں کون سے جوہر نمایاں ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے، صرف خدا جانتا ہے۔ اس کے لئے وہ تائیدِ انسانیّت کا مشاہدہ کرتے رہے، لیکن، نہ صرف یہ کہ انہیں اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا، دورِ حاضر میں پہنچ کر انسان کی خونریزیوں اور فسادانگیزیوں نے انتہائی شدت اختیار کر لی۔ اس پر فرشتوں کا پیمانہ ضبط لبریز ہو گیا، اور انہوں نے جرات کسے کہہ ہی دیا کہ "حضرت کا اللہ شاہد بجا، اَلَيْسَ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ" لیکن واقعہ یہ ہے کہ ص

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
خلق خدا کی گھات میں، رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
دانش و دین و علم و فن، بندگی ہو کس تمام
عشق گہر کٹائے کا فیض نہیں ہے علم ابھی
نقش گہر ازل تیرا نقش ہے نامِ اہم ابھی
تیرے جہاں میں ہے وہی گہر و شمس و شام ابھی
بند ہے کوہِ گہر ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

قرآن کریم کا مقصود و منشاء ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں افرادِ انسانیہ کی مضمحلہ حیثیتوں کی اس طرح نشوونما ہو کہ وہ ایسا انسان بن جائے جو مشیتِ ایزدی کے معیار پر پورا اُترے۔ لیکن وہ انسان کو اس مقام تک انتہائی طریق سے نہیں، ارتقائی انداز سے پہنچانا چاہتا ہے۔ اور ارتقائی انداز سے منازلِ بڑی سست رفتاری سے طے ہوتی ہیں۔ عجلت پسند انسان اس آخری منزل کو اپنے سامنے جلد دیکھنا چاہتا ہے،

انسان سازی کے تخلیقی مراحل

ط۔ ان امور کی وضاحت میری کتاب، مطالب الفرقان جلد دوم ص ۱۱۱ میں ملے گی۔
ص۔ اس نظم میں جو کچھ فرشتوں کی زبان سے کہلوا رہا ہے، وہ درحقیقت انسان کے موجودہ معاشرہ کی بے نقاب تصویر ہے۔

اور نظام فطرت کی اہستہ خرابی سے مجھنڈا اٹھتا ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر مستوع انداز سے بیان کیا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ :-

مرد ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا وہ مشتبہ خاک ابھی آوار گاہن راہ میں ہے
اور کبھی بارگاہِ خداوندی میں یہ پُرسوز گلہ کرتا ہے کہ :-

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا کہ پیدائی تیری اب تک حجابِ آمیز ہے ساقی! خستہ
فرشتوں کی وہ شکایتِ رنگیں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، دراصل خود انسان کے قلبِ مضطرب کی بیستہ
دھڑکن ہے کہ یہ منازلِ برق رفتاری سے طے کیوں نہیں ہوتیں؟ اس کا جواب خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل
ہے۔ قانونِ مکافات کے معنی یہ ہیں کہ ہر باطل نظام کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد میں تخریبِ مضمر
ہوتی ہے لیکن وہ رفتہ رفتہ اُس مقام کی طرف بڑھتا ہے اس کی رفتار تو بڑھتی ہی جاتی ہے، لیکن جب
وہ آخری لمحہ آجاتا ہے تو وہ نظام اور وہ قوم، جو اس باطل نظام کی حامل ہوتی ہے، اس طرح تباہ و برباد ہوتے
ہیں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ قرآن اپنے اس دعویٰ کی صداقت کی شہادت میں اقوام
سابقہ کے تاریخی شواہد پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم ان سے خود اندازہ لگا لو کہ باطل کے تخریبی نظام کا انجام
کیا ہوا کرتا ہے۔ وہ قومِ ثمود کے متعلق کہتا ہے کہ اس کے سرخٹوں نے زمین

باطل کا انجام

اور اس کی چراگاہوں اور چشموں پر اس طرح قبضہ جما رکھا تھا کہ غریبوں اور
کمزوروں کے مویشی پانی پینے تک کو ترس جاتے تھے۔ انہیں ہتھیار سمجھایا لیکن وہ اپنی اس مستبدانہ روش سے
باز نہ آئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قَدْ مَدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فَنَسَوُهَا (۱۹) خدائے
اپنے قانونِ مکافات کی ٹوسے، ان کے جرائم کی بنا پر ان پر اس طرح روڈ رولر (ROAD ROLLER)
پھیر دیا کہ سب اوپر نیچے برابر ہو گئی۔ غریب اور امیر کا امتیاز مٹ گیا۔ طبقاتی تقسیم ختم ہو گئی۔ وہ، قومِ مدین
کی داستان کے ضمن میں کہتا ہے کہ ان کی تجارت سراسر فریب کاری تھی۔ جس سے وہ غریبوں کو لوٹتے تھے۔
جب وہ اس سے باز نہ آئے تو ان کی بستیاں اس طرح برباد ہو گئیں، کَانَ لَّهُمْ يَغْنَوُ فِيهَا ط (۲۰) ،
”گویا ان میں کبھی کوئی بسا ہی نہ تھا۔“ وہ قومِ لوط کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے، جَعَلْنَا
عَالِيَهَا سَافِلَهَا (۲۱)۔ ”اس کی بلندیاں، پستیوں میں بدل گئیں۔“ وہ ہر ظالم قوم کے انجام کے
متعلق کہتا ہے، فَطُغْ دَابِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ط ... (۲۲)۔ ”ان کی جڑوں تک کٹ جاتی ہیں۔“

دوسری جگہ ہے، وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرِيبٍ يَذُرُطَّيْعَتُهُمْ فَبُذِلَتْ مُسْكِتُهُمْ لَعْنَةُكَ لَمَّا ظَنَّوْا أَنَّ بَعْضَ صَمَرِ الْآلِ قَلِيلٌ ط ... (۲۸) ۵۰۔ کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنہیں رزق کی فراوانیاں حاصل تھیں؛ لیکن چونکہ تقسیم رزق کا نظام ظالمانہ تھا، اس لئے وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ یہ ہیں ان کے اُجڑے ہوئے کاشتکار جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی رہا ہے۔ ان کی بستیوں کے کھنڈرات ان کی بربادی کے نوہر خواں ہیں۔ ایک آیت میں ان کی تباہی کی ایسی مثال دی ہے جس سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ کہا کہ وہ اپنی بربادیوں کو دیکھ کر چیختے چلاتے رہے۔ لیکن کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ (۱۵) ”تو ان کو وہ قوم ایسی ہو گئی جیسے کٹا ہوا کھیت ہو، یا جُعا ہوا شعلہ“۔

خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے باطل نظام کی حامل قوموں کا یہی انجام ہے، جسے اقبالؒ نے انتہائی اثر انگیز مسماتی انداز میں فرشتوں کے نام، فرمانِ خداوندی

فرمانِ خدا

کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ کہا کہ خدا نے فرشتوں کی شکایت سُن کر کہا ہے

اُٹھو! میری دنیا کے عزیزوں کو جگھا دو کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے کنبشِ فرومایہ کو شاہین سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

کچھ عرصہ پہلے، کمیونسٹ فوجان، ”گھیراؤ۔ جلاؤ“ کے اپنے تحریبی پروگرام کی تائید میں اقبالؒ کا یہ شعر گلی، گلی، کوچے کوچے گاتے پھرا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ دیکھئے! اقبالؒ جیسا مفکر بھی جلائے، مٹائے کی تلقین کرتا ہے۔ انہیں کون بتاتا کہ اقبال جلائے مٹانے کی تلقین نہیں کرتا۔ وہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے باطل نظام کے انجام کا نقشہ کھینچتا ہے کہ جس قوم میں ظلم و استبداد اس حد تک پہنچ جاتے کہ کاشتکار سال بھر محنتِ شاق سے اپنا لہو پسینہ ایک کر دے، لیکن اس کی فصل کو زمیندار اٹھا کر اپنے گھر لے جائے، اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جس فصل سے کاشتکار کے بچوں کو محروم کیا گیا تھا، خود زمیندار اور اس کے بچے بھی اس سے محروم رہ جایا کرتے ہیں۔ تباہی و بربادی کا ایسا بے پناہ سیلاب آتا ہے جو ان سب کو بہا کر لے جاتا ہے۔ فرشتوں کے نام فرمانِ خداوندی کے ایک حصے کو آپ دیکھ چکے۔

مذہبی پیشوائیت کی پرکاری

اس کے بعد اگلے حصے میں اقبالؒ نے اس حقیقت پر سے پردہ

اٹھایا ہے کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کا نظام مذہبی پیشواؤں کی خدا فریبیوں کے بل بوتے پر قائم ہوتا ہے۔ جابر

خلی خدا کی گھات ہیں

حکمران اور خون آشام سرمایہ دار، غریبوں اور کمزوروں کو کچلتے چلے جاتے ہیں، اور مذہبی راہنما انہیں تھپکیاں دے دے کہ سلاتے رہتے ہیں کہ یہ سب خدا کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ حکومت اور دولت خدائے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں وہ جسے چاہے امیر بنادے اور جسے چاہے فقیر کر دے۔ خدا کی مرضی کے خلاف لب کشائی کہہ نا تو ایک طرف، دل میں بھی اس کے خلاف احساس شکایت پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ انسان کو راضی برضا رہنا چاہیے۔ ان حاکموں اور سرمایہ داروں کو اس دنیا میں یہ کچھ مل رہا ہے، تمہیں آخرت میں جنت عطا ہوگی۔ وہ اپنے اس قسم کے سحر کار و عظموں اور سامانی نصیحتوں سے غریبوں اور مظلوموں کو ایفون پلاتے رہتے ہیں۔ مستقبل نظام ملکیت اور خون آشام نظام سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے ضروری ہے کہ مذہبی پیشوائیت کو ختم کیا جائے۔ اس لئے فرشتوں کے نام فرمان خداوندی میں کہا گیا ہے

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پڑے پیران کلیا کو کلیا سے ہٹا دو
”حتیٰ را بسودے صنماں را بطورافے“ بہتر ہے چارغ حرم و دیر بھبھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرنے کی سکون میرے لئے مٹی کا حرم اور بسا دو
آپ اقبالؒ کے پیغام کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے، وہ آمریت اور سرمایہ داری کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کو بھی انسانیت کے لئے باعث عذاب قرار دیتا ہے۔ وہ امت کی تباہی کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے :-

چادر مرگ اندر پیئے ایں دیر میر سود خوار و والی و مولا و پیر
دوسرے مقام پر کہا ہے :-

باقی نذر ہی تیری وہ آئینہ منیری اے کشتہ بر سلطانی و مملاتی و پیری
اصل یہ ہے کہ ملکیت کا استبداد اور سرمایہ داری کا استحصال پنپتا ہی مذہبی پیشوائیت کی مقدس سحر کاریوں کے بل بوتے پر ہے۔

اقبالؒ ”نظام سرمایہ داری کو کاروباری طبقہ تک محدود نہیں رکھتا۔ وہ نظام زمینداری کو بھی اس کا جزو قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے متعلق فرمایا کہ وہ تمام ذریعہ انسان کے لئے ذریعہ رزق ہے۔ اس لئے اسے تمام افراد انسانیت کے لئے یکساں کھلا ہونا

نظام زمینداری

چاہئے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس بنیادی حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔ میں یہاں اس کے صرف ایک مقام پر اکتفا کروں گا۔ سورۃ واقعہ کی چند آیات میں اسے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا ہے:-

”تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشوونما ہوتی ہے۔ اور سوچو کہ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے کسب و ہنر کی رُو سے۔ مثلاً تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے، اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے؟ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ ایسا تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رُو سے ہوتا ہے؟ اَفَرَأَيْتُمْ مَتَاعَ حَرْثُونَ ؕ اَمْ اَنْتُمْ تَنْزِلُوْنَہُمْ اَمْ نَحْنُ الَّذِیْنَ عَمَلْنَا

(۵۶/۶۳-۶۴)

اس کے بعد کہا کہ تم اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی کا ہی نہیں، خود تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانون دلویت ایسا کرتا ہے؟ (۵۶/۶۸-۶۹)

اس کے بعد کہا کہ تم اس آگ (حرارت) پر غور کرو جس سے تم اتنے کام لیتے ہو۔ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں سے حرارت کو یوں مسترد کر دینا، تمہاری کارگیری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے۔ اَفَرَأَيْتُمْ اَلنَّارَ الَّتِیْ تُوقَدُونَ ؕ اَمْ اَنْتُمْ اَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِیْنَ (۵۶/۷۰-۷۱)

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو کہ اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر! تم کسی بیج سے بھی غور کرو، بہر حال اس نتیجے پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہذا اس کے ماحصل میں تمہارا حصہ صرف تمہاری محنت کے بقدر ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے، کے مالک نہیں بن سکتے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامان پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو۔ اور ہمارا حصہ ہمیں دے دو۔ سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ تک کیسے پہنچائیں؟ جواب دیا مَتَاعًا لِّلْمُحْصِنِیْنَ (۵۶/۷۱) ”یہ انہیں دے دو جو اپنا رزق پیدا کرنے سے معذور ہیں“۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔

اقبالؒ نے اس پورے تذکرہ کو بال جبریل کی اس نظم میں بڑی برجستگی سے بیان کیا ہے، جس کا

عنوان ہے :-

الْأَرْضُ لِلَّهِ !

اور نظم یہ ہے !
 پاتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سجا ؟
 کون لایا کھینچ کر پتھم سے بادِ سزا کا ر ؟ خاک یہ کس کی ہے ، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
 کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب ؟ موسموں کو کس نے سکھائی ہے خوشے اُٹھانا ؟

وہ خدا یا یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں !

تیرے آباء کی نہیں ، تیری نہیں ۔ میری نہیں ! (ابال جبریل صفحہ ۱۶۱)
 ظاہر ہے کہ جب زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی ، تو نہ کوئی شخص زمیندار ہو سکتا ہے ، نہ اس کا کوئی مزارع جسے زمین بٹائی یا پٹہ پر دی جائے۔ اس باب میں حضور نبی اکرمؐ کا ایک فیصلہ حقیقتِ ثابتہ ہے۔ صحاحِ ستہ کے ایک مجموعہ ، ابوداؤد ، میں حضرت ابن ابی نعیمؒ کی ایک روایت ہے کہ :-
 ”رافع بن تھعلجؓ نے ایک زمین کاشت پر لی ، وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اس طرف سے ہوا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی ؟ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کرنا ہو۔ زمین صاحب زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔“

مزارعت

(شاہسکار رسالت صفحہ ۲۸۲)

یہاں حضورؐ نے فرمایا کہ مزارعت بھی سودی کاروبار یعنی ربوہ ہے۔ اسلام کے معنی نظام کے سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ ربوہ کسے کہتے ہیں۔

ربوہ کا مفہوم

زمانہ نزول میں قرآن میں عربوں میں ”سرمایہ داری“ کی اصطلاح رائج نہیں تھی۔ اس کی بجائے ربوہ کی اصطلاح عام تھی۔ اس لئے یوں سمجھئے کہ ربوہ سے مراد نظامِ سرمایہ داری ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (۱۰۱) ، معاوضہ محنت کا ہے۔ اس کے برعکس نظامِ سرمایہ داری میں معاوضہ مرہ
 CAPITAL یعنی روپے) کا ہوتا ہے۔ لہذا ، اسلامی نظام اور نظامِ سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اپنے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ قرآن کریم میں مختلف جرائم کی مندرائیں مذکور ہیں۔ لیکن ربوہ کے

متعلق کہا ہے کہ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو، فَأَذْفُوهُمَا بِسَبِّ مَنِ اللَّهُ وَمَرْسُولُهُ... (۹۱:۵) اے خدا اور رسولؐ کی طرف سے اپنے خلاف اعلان جنگ سمجھو۔ بالفاظ دیگر، قرآن کی رو سے ربو اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ یعنی جس طرح اسلام اور نظام طوکیئت یکجا نہیں ہو سکتے، اس طرح اسلام اور نظام سرمایہ داری بھی یکجا نہیں رہ سکتے۔ جب کہا کہ تم اس سے باز آ جاؤ، تو اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی۔ فَلَكُمْ دَعْوَىٰ أَمْوَالِكُمْ... (۹۱:۵) ”تم صرف اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو، اس سے ایک پیسہ بھی زائد نہیں لے سکتے کہ وہ ربو ہوگا“ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے :-

- ۱۔ اسلام اور نظام سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔
- ۲۔ نظام سرمایہ داری کے معنی ہیں، محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا معاوضہ لینا، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ زمانہ تبدیل قرآن میں ربو کی تین شکلیں رائج تھیں :-
 ۱۔ دست بدست (ذاتی) قرضوں پر سود۔ قرآن کریم نے یہ کہہ کر اسے ختم کر دیا کہ تم صرف اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ اس سے ایک پیسہ بھی زائد نہیں۔ حتیٰ کہ اگر مقرض تنگ دست ہو تو اصل زر بھی چھوڑ دو تو بہتر ہے۔ (۹۱:۵)
 ۲۔ زمین کو طبائی یا پیڑ پر دینا۔ پہلے اسے ربو قرار دیکھنا چاہئے اور جب زمین مملکت کی تحریک میں لے لی گئی تو اس قسم کی کوئی شکل باقی نہ رہی۔
 ۳۔ اٹان عرب، بالخصوص قریش، تجارت پیشہ بھی تھے، اور لوگ دوسروں کے کاروبار میں روپیہ لگا کر، نفع میں شریک ہو جاتے تھے۔ قرآن کریم نے اسے بھی ربو قرار دے دیا۔ فرمایا :-

مضاربت

وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبَا لِّيَرْبُوْا فِيْ أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللَّهِ... (۹۱:۵)
 جو روپیہ تم دوسروں کے مال میں شامل کر دیتے ہو کہ وہ بڑھتا رہے، تو یہ ربو ہے، جو اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا۔“

اس طرح مضاربت یا مشارکت کو بھی ختم کر دیا۔ المختصر اس نے حَرَّمَ الرِّبَا... (۹۱:۵) کہہ کر ربو کی پھل کو حرام قرار دے دیا۔ اور اس جرم کی سنگینی کو یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ اس کے مرتکب اور کفار ایک ہی

جہنم میں اکٹھے ہوں گے۔ (۱۳)

اس طرح اس معاشرہ میں رزق، کریم اور طیب ہو گیا۔ یعنی قرآن کی رو سے وہی رزق کریم اور طیب ہے جسے اپنی محنت سے حاصل کیا جائے۔ (جو محنت کرنے سے معذور ہو اس کے رزق کی فہم داری مملکت کے سر پر ہوگی) ربوہ کے ذریعے رزق حاصل کرنے والا چونکہ محنت نہیں کرتا، اس لئے اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں، اور آہستہ آہستہ اس میں محنت کرنے کی صلاحیت اور استعداد ہی نہیں رہتی۔ یہی وہ رزق ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے۔

لے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پروا ذیست کو تاہی
محنت کر کے کمانے کی صلاحیت، ربوہ سے، مفلوج ہو جاتی ہے اور ہوس زر اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ ہر وقت مضطرب و بیقرار ادھر ادھر مارے مارے پھرتا رہتا ہے۔

کَمَا يَقُومُ الَّذِي يَخْبِطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ط (۱۴) جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔

یہ تھا دورِ محمد رسول اللہ والذین معہ کی اسلامی مملکت کا نظام، جس میں کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوتا تھا، اور ہر فرد کو رزق حلال میسر تھا، یعنی عزت کی روٹی۔

دورِ ملوکیت

اس کے بعد ہمارا دورِ ملوکیت آگیا، اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس کے ساتھ ہی نظام سرمایہ داری اور نظام مذہبی پیشوائیت بھی ڈر آیا اور چونکہ خود مملکت غیر اسلامی تھی، اس لئے وہ سب کچھ جسے قرآن نے ناجائز اور حرام قرار دیا تھا، جائز اور حلال قرار پا گیا۔ صرف اس کا نام بدل گیا۔ اس کے لئے مذہبی پیشوائیت نے جواز کی راہیں ہموار کر دیں۔ قرآن مجید نے دولت جمع کرنے والوں کے لئے عذابِ جہنم کی وعید سنائی تھی، یہ تہدید اس شدت اور کھرا سے آئی تھی کہ ان آیات کی تفسیر تو کجا، تاویل تک ممکن نہ تھی۔ اس کے جواز کی ایک اور راہ تراشی گئی۔ قرآن کریم میں ہے :-

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُمْسِكُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۚ يَوْمَ يُحْمَلُ عَلَيْهَا فِيْ فَا رِجَالُهُمْ فَتَكْوَىٰ بِهِمَا جُنُجُهُمْ
وَجُنُوبُهُمْ وَظُرُوسُهُمْ ۚ هَٰذَا مَا كُنْتُمْ لَا تَفْهَمُونَ ۚ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (۲۴)

”جو لوگ سونا یا چاند کی (مال و دولت) جمع کرتے ہیں، اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں

رکھتے۔ اے رسولؐ! تو انہیں الم انجیز عذاب کی بشارت "سنا دے یہ عذاب اس دن واقعہ ہوگا جب سونے چاندی کے ان جمع کردہ سکوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، اور ان سے ان کی پیشانیوں پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے اپنے مفاد کے لئے جمع کر لیا تھا۔ سو اب اس جمع شدہ دولت کے لئے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو۔"

بات کس قدر صاف اور نکھری ہوئی ہے۔ اب وہ روایت ملاحظہ فرمائیے

زکوٰۃ کی وضعی روایات

جسے نظام سرمایہ داری کے جائز قرار دینے کے لئے وضع کیا گیا :-

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی (وَالَّذِينَ يَكْنُزُونَ
الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ...) تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گہرا
خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس حکمت کو دور کہہ دوں گا۔ پس عمرؓ
رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبی اللہ! یہ آیت آپؐ کے صحابہؓ پر گہرا
گہر رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال
کو پاک کر دے.... ابن عباسؓ کہتے ہیں حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوش مسرت سے اللہ کے
(ابوداؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ)

لیجئے! ایک وضعی روایت کی روش سے، اکتنا نذر شیر مادر کی طرح حلال قرار پا گیا اور اس طرح نظام سربراہ داری کے لئے پھیلائی گئی۔

زمین پر ذاتی ملکیت تسلیم کر لی گئی، اور اس طرح بٹائی یا پٹہ کو عین مطابق اسلام قرار دے دیا فقط اس کا نام مزارعت رکھ دیا۔

کسی کے کاروبار میں دہیہ لگا کر منافع میں شریک ہو گئے۔ اس کا نام مضاربیت رکھ دیا، جو حلال و طیب ہے۔ قرآنی آیت کے الفاظ اپنی جگہ برقرار اور محفوظ رہے اور وضعی روایات اور ان پر مبنی فقہ کی رد سے وہ سب جائز یا گیا جسے ان آیات نے ناجائز و حرام قرار دیا تھا۔ اقبالؒ نے اس صورتِ حالات پر پاک

اُہ جگر سوز کیا تھا کہا ہے :-

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پاژند
اس کے بعد وہ سلطنتیں ختم ہو گئیں جن کے عہدِ اقدار میں یہ تبدیلیاں ہوئی تھیں، ان کے مملکتی اُمین و
قوانین نسیا منسیا ہو گئے۔ ان کے معاشرہ کے خط و خال مٹ گئے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کی قرآنی تحریفات
جنہیں شرعی قوانین کا نام دیا گیا تھا، بدستور اُگے بڑھتی گئیں اور رفتہ رفتہ عین اسلام بن گئیں۔ اس پر صدیاں
گزر گئیں، اور آج تک ————— ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دین ————— عصرِ حاضر میں
زمانہ کے تقاضوں سے سرمایہ داری کے قہر کُہن میں کچھ تزلزل کے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے تو علامہ اقبالؒ
کی کچھ دھارس بندھی کہ یہ کابوس سینۂ انسانیت سے اُتر گیا تو قرآن کے معاشی نظام کے لئے راہ ہموار ہو چکی
یہی وہ احساسات تھے جن سے کیف اندوز ہو کر انہوں نے اپنی مشہور مثنوی - ساقی نامہ - میں جھوم جھوم
کہہ کہا تھا :-

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ————— ہے ساز بدلے گئے
پیرانی سیاست گرمی خوار ہے زمین میر و سلطان سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مدارِ سی گیا

لیکن ان وجدِ آفرینیوں میں جب ان کی نگاہ ملت اسلامیہ پر پڑی تو ان کی امیدیں
بایوسیوں میں بدل گئیں۔ انہوں نے بعدِ حسرت و یاس، انتہائی غم و الم کے عالم

عجی اسلام

میں کہا :-

مسلمان ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زنا پر پوش
تمدنِ تصوف، شریعت، کلام بُتانِ عجم کے چُٹبازی تمام
حقیقتِ خرافات میں کھو گئی یہ اُمت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلمان نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

ہماری مذہبی پیشوائیت کے نزدیک سب سے بڑا جہاد یہ قرار دیا گیا کہ جہاں کسی نے سرمایہ داری کے

خلاف ایک لفظ بھی کہا، انہوں نے اسے کمیونسٹ قرار دے کر، کفر والحاد کے فتوؤں سے نواز دیا۔ مغرب کی سرمایہ پرستانہ اقوام کے لئے ان کا یہ اسلام بڑا سازگار تھا۔ انہوں نے اُسکے بڑھ کر ان کی ہمت افزائی کی اور دے، دے، دے، قدمے، قلمے اس اسلام کے فروغ کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ انہی اقوام کے نمائندہ ابلیس کے مشیروں نے کہا تھا کہ:-

یہ ہماری سچی پیہم کی کرامت ہے کہ آج صوفی و علما، ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا کھنڈ ہو کہ رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام
اور خود ابلیس نے یہ کہہ کر، انہیں اطمینان دلایا تھا:-

جانتا ہوں میں یہ اُمت حامل قرآن نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دین
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری باتیں بے یار بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستین
(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

آپ کو یاد ہو گا کہ روس کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی روک تھام کے لئے، امریکہ نے مسلمانانِ عالم کو مخاطب کر کے کہا تھا:-

”دنیا کے خدا پرستو! آؤ۔ ہم متحد ہو کر اس الحاد اور بیدینی کا مقابلہ کریں۔“

ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس دعوت پر لبیک کس طرح
کہا گیا اس کا اندازہ اس خبر سے لگائیے جو روزنامہ امروز (لاہور)
کی یکم دسمبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا:-

”امریکن سفارت خانہ کے پروفیسر، ڈاکٹر ویلبر نے گورنمنٹ کالج میاں نوالی کے طلباء کو لیکچر دیئے
جن میں کمیونزم کی مخالفت کی۔ ان کے ساتھ جماعت اسلامی، لاہور، کے رہنما بھی تھے۔ اور
مقامی امیر، مولانا گلزار احمد بھی۔“

(حوالہ امروز۔ یکم دسمبر ۱۹۵۲ء)

اس کے بعد جب ۱۹۵۵ء میں حکومت پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنے روابط قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو امریکہ
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کراچی اور لاہور میں پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں کہا:-

”اگر یہ (امریکن) بلاک فی الواقع چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ اسے حکمرانوں کی مزدورت ہے جو عوام پر سطلی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی محرک ہے۔ یہیں مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو۔“

۱۔ جماعت اسلامی کا ترجمان اخبار تسنیم بابت ۲۰، ۱۶ دسمبر ۱۹۵۵ء

ان روابط کا تو ہمیں علم نہیں کہ یہ قائم ہوئے یا نہیں اور اگر ہوئے تو ان کی نوعیت کیا تھی، البتہ

مودودی مرحوم اور نظام سرمایہ داری

جو معاشی نظام (مرحوم) مودودی صاحب نے پیش کیا وہ خالص سرمایہ دارانہ تھا۔ اسے انہوں نے اپنی کتاب ”مسئلہ ملکیت زمین“ میں تفصیل سے پیش کیا تھا۔ اس کے دو ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے :-

”اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور ملکیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائزہ ذرائع سے جائزہ چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلاحد و نہایت رکھی جاسکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ یا انفعاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے بے کار کر دیا جائے۔“

(مسئلہ ملکیت زمین، پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء ص ۵۲-۵۳)

اگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

”آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائزہ ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں

اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جس طرح وہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا اور پیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مولیشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست خود کرو اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیوں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں۔ مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔“ (ایضاً ۴۳ - ۴۲)

صدر پاکستان نے بھی بھارت کے جو یہ ”سٹیٹ“ کو ایک انٹرویو کے دوران فرمایا تھا کہ:-

مودودی مرحوم اور نظام سرمایہ داری

”اسلام کی رو سے ایک شخص جب قدرتی چاہے دولت جمع کر سکتا ہے۔ بس اس پر اسے ٹیکس ادا کرنا ہو گا۔“ (طلوع اسلام اگست ۱۹۸۲ء ص ۱۱)

اس سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے پنجاب زکوٰۃ کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:-
”بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام مسادات کا دین ہے اس لئے فضل الحی کے پاس بھی سوروپے ہونے چاہئیں، ضیاء الحی صاحب کے پاس بھی سوروپے ہونے چاہئیں۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ قرآن کی طرف توجہ دیجئے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور ہمارا یہ دین ایمان ہے

کہ اسلام کی روح قرآن اور سنتِ رسولؐ میں ہے تو آپؐ یہ بتائیے کہ اگر مساوات کا مسئلہ قرآن کے نظریہ کے اندر یہ ہونا کہ کوئی تزیب نہیں ہوگا۔ کوئی مسکین نہیں ہوگا تو پھر قرآن میں اسکا ذکر کیوں آیا ہے۔ یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے اللہ تعالیٰ نے غیر حضرات سے کہا ہے کہ اپنے اموال میں سے ایک مقررہ رقم ان لوگوں کو دیں جو اس کے مستحق ہیں۔

(الاعتصام ۹ جولائی ۱۹۸۲ء)

ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ یہ اسلام، حضرت علامہؒ کے سامنے نفاذ انہوں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ ایک خطہ زمین حاصل کیا جائے جس میں ایسا قرضی نظام متشکل ہو سکے جس میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی ہو اور اس طرح اُمتِ ملوکیت، آمریت، سرمایہ داری اور تھکیر لسی کی زنجیروں سے آزاد ہو جائے اس کے لئے انہوں نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اس تصور کو پیش کرنے کے بعد وہ برابر پھار رہے کہ:-

مردی زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمران ہے اک وہی، باقی بُتانِ آذری
الارضُ لِلّٰہ کے انقلابی نعرہ سے وہ نظامِ زمینداری کے قصرِ تعیش میں تزلزل پیدا کرتے رہے۔ وہ سرمایہ داروں کو براہِ راست مخاطب کر کے کہتے رہے کہ:-

کارخانے کا ہے مالک مردِ ناکردہ کار عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سڑی دار
(بانگِ درا صفحہ ۳۳۵)

سرمایہ داروں کو وارننگ | جب زمامِ تحریکِ پاکستان، قائدِ اعظمؒ کے ہاتھ میں آئی، تو انہوں نے بھی زمینداروں اور سرمایہ داروں کو لٹکا کر کہہ دیا کہ پاکستان میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سیشنِ واقعہ ملی

۱۹۴۲ء میں پوری شدت کے ساتھ کہا :-

” اس مقام پر زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلسی نظام کی نوسے، جو انسان کو ایسا بدست کر دیتا ہے کہ وہ کسی محقول یا پت کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گارٹھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مٹا رہے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں، وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خد کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اس کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمین کے بدلے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چیلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ، ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے؟“

پاکستان میں آمریت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف ان انقلاب آفرین غلغلوں اور طنطنوں کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا۔ لیکن قوم کی بد قسمتی کہ جب یہ ذرا انجرا تو اُس وقت نہ وہ مفکر اعظم (اقبالؒ) موجود تھا، نہ قائد اعظمؒ اور (اقبالؒ کے الفاظ میں) شاہیں کا یہ نشین، زانوں کے تصرف میں چلا گیا۔ یہاں آمریت، مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کے عفاریت نے ہجوم کر کے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا، اور رتو کا طوفان بالخصوص، سیلاب کی طرح اُمنڈ آیا۔ قرآن کریم نے قانون کو، نظام سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ وہ یہودی تھا، اور یہودی اسی نظام کے سہارے زندہ چلے آ رہے ہیں۔ ان کی مملکت چھین گئی۔ حکومت باقی نہ رہی، کوئی وطن نہ رہا۔ وہ دنیا میں خانا خراب صحرائوں کی طرح سرگرداں پھرتے رہے۔ ایں سومانہ و ایں سورمانہ، لیکن انہوں نے اپنے نظام سرمایہ داری کو اسی قدر محکم بنیادوں پر استوار رکھا کہ دنیا کی بڑی بڑی مملکتیں ان سے بہودی نظام بینکاری کی دست نگر ہیں، اور اس حد تک کہ ان کی سیاست بھی انہی کے اشاروں پر چلتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :- ”فرنگ کی رگ جاں، پنجہ یہودی میں ہے۔“ انہوں نے اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہا تھا کہ :-

خلق خدا کی گھات میں

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے بھڑی سود خوار
جن کی روباہی کے آگے، بیچ ہے زور پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پتے ہوئے پھل کی طرح
دیکھتے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ
یہودیوں نے ساری دنیا میں بنکوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ بنکوں کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ
روپیہ محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہیں، لیکن وہ درحقیقت ربو کا عالمگیر نظام ہے جس کے اثرات بڑے دور رس ہیں
علامہ اقبالؒ کی نگہ حقیقت شناس بہت پہلے بھانپ لیا تھا کہ :-

شیوہ تہذیب نو آدم درسی است پروہ آدم درسی سوداگری است
ایں بنوک، ایں فنک چالاک یہود نورحی از سینہ آدم ربو

(پس چہ باید کرد)

یہ اس لئے کہ بنکوں کا سارا کاروبار ربو کے سر پر چلتا ہے، اور ربو وہ ابلیسی نظام ہے جس سے سینہ آدم
نورحی سے محروم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے حرام اور خدا و رسولؐ کے خلاف بغاوت اس لئے قرار
دیا ہے کہ اس سے محفل انسانیت کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ دین کا سارا دار اکل حلال پر ہے، اور
ربو کے نظام میں اکل حلال کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کو بڑی شدت سے
واشگاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

نامدانی حکمت اکل حلال برجاعت زیستن گردد وبال
آہ! یورپ زین مقام آگاہ نیست چشم آدینظر بنور اللہ نیست
انداند از حلال و از حرام حکمت خام است و کارش نامنام
نامت و بالانہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب ددیں سودائے خام

(مثنوی - پس چہ باید کرد اے اقوام شرق)

آپ ربو یعنی سرمایہ داری کے نظام کی تخریب کاری کا اندازہ اس سے لگائیے کہ (حضرت علامہؒ کے
الفاظ میں) اس میں دین تو ایک طرف، تہذیب و دانش تک باقی نہیں رہتے۔

علامہ اقبالؒ نے یہ وارننگ اقوام یورپ کو دی تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ جس اسلامی مملکت کا خواب وہ
دیکھ رہے ہیں، اس میں یہ تباہ کن کاروباران سے بھی زیادہ شدت سے پھیلے گا۔ بنکاری کا سودی نظام تشکیل

پاکستان سے پہلے بھی اس بڑے صغیر میں کارفرما تھا لیکن محدود سرمایے پر۔ پاکستان میں یہ پھیلتا چلا گیا اور اب ملک گیر ہو رہا ہے۔ انگریز کے کافرانہ دور حکومت میں سود کو سود (INTEREST) کہا جاتا تھا، لیکن مسلمان عوام کے دل میں سود کے لفظ سے تکدر پیدا ہوتا تھا۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ اسے سود نہیں بلکہ منافع (PROFIT) کہا جائے۔ اس طرح ایک لفظ کی تبدیلی سے، خدا کے حرام کردہ کو حلال کر لیا۔ موجودہ حکومت چونکہ اسلامی ہونے کی مدعی ہے، اس لئے اسے اس تبدیلی کے لئے شرعی سند کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ پاکستان میں اقامت دین کے داعی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ :-

”روپیہ جمع کرنے والوں کو سود دینے کے بجائے بینک ایسے منصوبے تیار کریں گے جن کے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے برابر کے حقدار ہوں گے۔“

(ایشیا، ۵ نومبر ۱۹۷۸ء بحوالہ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۹ء)

آپ کو غالباً علم ہو گا کہ بینک نہ کوئی اپنے تجارتی منصوبے تیار کرتا ہے، نہ خود کاروبار کرتا ہے۔ وہ کرتا یہ ہے کہ لوگوں سے کم شرح سود پر روپیہ لے کر، اسے کاروباری لوگوں کو زیادہ شرح سود پر قرض دے دیتا ہے۔ ان سے جو سود وصول ہوتا ہے، اس سے زائد حصہ خود رکھ لیتا ہے اور باقی روپیہ جمع کرانے والوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ یہ خالص سودی کاروبار ہوتا ہے۔

قیمت ہے کہ ہمارے مذہبی حلقوں سے بھی اب یہ آواز بلند ہوتی شروع ہو گئی ہے کہ بینک کے منافع ہر شکل میں سود ہے۔ جماعت اہل حدیث کے ترجمان، ہفتہ وار الاعتصام میں ایک مقالہ قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت بابت ۲۰ مئی ۱۹۸۴ء میں تحریر ہے :-

یہ منافع نہیں، سود ہی ہے

”بعض لوگ بینک کے نظام کو سود نہیں، بلکہ تجارتی منافع پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ لیکن ادھر نصف صدی کے اندر اس موضوع پر اس قدر بحث ہو چکی ہے۔ اردو زبان میں بھی اتنا لٹریچر آ گیا ہے کہ مزید اضافے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے اور علماء حقانی کی کثیر تعداد نے دلائل سے ثابت کر دیا

ہے کہ یہ سود ہی ہے، منافع نہیں اور اب اسی پر سارے عالم کے تقریباً تمام اہل حق کا اتفاق ہے۔

یہاں ہم ہماری ”اسلامی مملکت“ اسے منافع قرار دیتی ہے، سود نہیں۔ اس کا دوبارہ کو مزید ”اسلامیانے کے لئے“ دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک کا نام رکھا ہے ”بلا سود بینکاری“ اور دوسرا کو کہا گیا ہے ”باسود بینکاری“۔ یہ بھی صرف الفاظ کا فرق ہے۔ دونوں کا مدار سود پر ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بلا سود بینکاری میں شرح سود پہلے سے متعین کر دی جاتی ہے اور بلا سود بینکاری میں اس شرح کا تعین منافع (یعنی سود) تقسیم کرتے وقت کیا جاتا ہے۔

رہو سے زکوٰۃ | اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ بلا سود بینکاری کی مجموعی رقم (یعنی روپیہ جمع کرانے والے اصل زر اور منافع کی مجموعی رقم) سے اڑھائی فیصد وضع کر لیا اور اس کا نام زکوٰۃ رکھ دیا۔ ایسے تو خود لفظ زکوٰۃ کے معنی پاکیزہ نشوونما کے ہیں، لیکن قرآن کریم نے یہ کہہ کر اس کی مزید وضاحت کر دی، **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ ...** (۱) ”اے جماعت مومنین (خدا کی راہ میں) اپنی پاکیزہ کمائی خرچ کرو۔“ اس لئے کہ **لَا يَسْتَوِي الْغَنِيُّ وَالْغَنِيُّ وَالْغَنِيُّ ...** (۲) ”غنی اور طیب کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔“ یہاں یہی نہیں ہوا کہ طیب طیب کو باہم ملا دیا گیا، بلکہ اس آمیزش کے بعد جو رقم وضع کی گئی، اسے زکوٰۃ قرار دے دیا۔ اس زکوٰۃ میں دینی مدارس کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اس لئے حضرات ”علماء کرام“ میں سے کوئی اس کے غلط لب کشائی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اسے جھولیاں پھیلا پھیلا کر وصول کرتے ہیں۔

تھا جو ناخوب، بستر تاج وہی خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

لیکن اس طرح زکوٰۃ وصول کرنے سے بھی مسئلہ کما حقہ، حل نہیں ہوا۔ چنانچہ صدر مملکت نے، کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

”زکوٰۃ کے نظام اور حدود کے نفاذ سے اچھے نتائج حاصل ہو رہے ہیں، اگرچہ بہت سی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ زکوٰۃ کی رقم (۳۳۳) کروڑ روپے وصول ہوئی ہے لیکن گداگروں کی فوج ابھی موجود ہے۔ بیواؤں کی بڑی تعداد امداد سے محروم ہے۔ (جنگ لاہور، اپریل ۱۹۸۴ء)

لیکن وزیر خزانہ محترم غلام اسحقی خان صاحب نے اعتراف کر لیا ہے کہ بینک کا منافع بھی سود ہے۔ انہوں نے پاکستان سوسائٹی آف ڈویلپمنٹ اکاؤنٹس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ :-
 ”سود کو ختم کرنے کی پوری کوششیں کی جا رہی ہیں جب کہ سود کی جگہ منافع کو لے آنا بھی جدید سرمایہ دارانہ طریقہ ہے اور قطعی طور پر اسلامی نہیں ہے۔ اس لئے ہم سرمایہ داری کو جدید سرمایہ داری سے بدلنا نہیں چاہتے۔“

(روزنامہ جنگ، لاہور، مودھ ۱۸ مارچ ۱۹۸۲ء)

عمرت و راز باد کہ میں ہم غنیمت است، لیکن سود کا خاتمہ کرنے کے لئے سارا نظام سرمایہ داری بدلنا ہو گا کہ اس کے بغیر سود کا خاتمہ ہو نہیں سکتا۔

سود خوری کے شرعی حیلے

انگریز کے کافرانہ نظام تک ہمارے ہاں ”سود خور“ کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ”سود خور“ سے مراد ہوتی تھی، نجی قرضوں پر سود لینے والا۔ یہ کاروبار ہندو بنیا کیا کرتا تھا۔ مسلمانوں میں ایک خاص ٹائپ کے پٹھان، بالخصوص بلوچی و غیزو کے علاقہ میں، اس کے لئے بدنام تھے۔ ہمارے ہاں اس قسم کے قرضے، بینکاری یا سیونگزم اسکیموں کے دائرہ کار میں نہیں آتے، اس لئے ان قرضوں پر منافع کو بہر حال سود سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ہمارے مفتیانِ عظام نے ایسے حیلے بنا دیئے جن سے یہ حرام بھی حلال ہو جائے۔ مفتی محمد ابوسعید غلام سرور قادری (ایم اے اسلامک لاء) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ”معاشیاتِ نظامِ مصطفیٰ“۔ اس میں پہلے سود کے خلاف اسلامی احکامات کا ذکر ہے، اور اس کے ایسے حیلے درج کئے گئے ہیں جن کی رو سے سود لیا بھی جائے اور اس کا گناہ بھی نہ ہو۔ ایک آدھ حیلہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

پہلی تدبیر

ایک شخص کسی کو دس روپے قرض دے کر، اس سے دو روپے زائد لینا چاہتا ہے ظالم

ہے کہ یہ دو روپے سود ہوں گے۔ لیکن اس جرم اور گناہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا، قرض لینے والے کی کوئی چیز دس روپے میں نقد خرید کرے اور اسے قرض لینے والے کے ہاتھ مدت معینہ کے لئے بارہ روپے میں ادھار بیچ دے۔ اس مدت کے بعد قرض لینے والا، قرض دینے والے کو بارہ روپے ادا کر دے؟

اس فقہی حیلے سے زائد و زور روپے حلال و طیب قرار پائیں گے۔

اس قسم کی کئی ایک تدابیر اس کتاب میں درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:-

”امام ابو یوسفؒ ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے منافع بھی ہوگا اور ثواب بھی ملے گا۔ ثواب اس لئے ملے گا کہ اسے سود نیچے حرام سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔“

(بحوالہ: فتویٰ قاضی خان مع عالمگیری، جلد دوم ص ۲۸۰-۲۷۹ حصہ ۱)

اور خود صاحب کتاب کہتے ہیں:

”لیکن افسوس کہ مسلمان دین فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر سود ایسی لعنت میں مبتلا ہیں۔“

افسوس، صد افسوس کہ شاہین نہ بناؤ۔ دیکھئے دتیری انکھنے نے فطرت کے اشارے؟

(بحوالہ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۳-۲۲)

اب آپ نے غور فرمایا کہ مردود صاحب (مرحوم) نے کیوں کہا تھا؟ کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔

قرآن کریم نے نظام سرمایہ داری (دبلا) کو حرام قرار دیا تھا، کیونکہ اس میں یہ ہوتا ہے کہ:-

اُمّتے برأتتے دیگرے چوروں دانہ میں می کارواؤں حاصل برود

کھیتی کسی کی ہے، اس میں مولیسی کسی اور کے چرے ہیں۔ کاشت کوئی کرتا ہے، پیداوار کوئی اور لے جاتا ہے۔

از ضعیفان نان ربودن حکمت است از تن شاں جان ربودن حکمت است

اس میں، مفلسوں، ضعیفوں کے ہاتھ سے روٹی پھین لینا، یعنی ان کے جسم نانو ان سے جان کشید

کر لینا کارگیری کہلاتا ہے۔ اس کے بعد کہا تھا کہ:-

ناتہ وبالا نہ گمرد ایر سے نظام دانش و تہذیب و دیں سوائے خام

جب تک یہ نظام تہ وبالاتہ ہوگا، دین تو ایک طرف، عقل و خرد، تہذیب و تمدن تک باقی نہیں رہیں گے یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ قرآن کریم نے اس نظام کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ جس مسلک یا شعار کو حرام قرار دیتا ہے تو وہ کوئی آدمی جس سے نہیں ہوتا۔ وہ ہر اس علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے نظام ربو مسلمانوں کے لئے اس لئے حرام قرار دیا کہ اس سے ان کا دین باقی نہیں رہتا لیکن دیگر نوع انسان سے کہا ہے کہ یاد رکھو! یہ نظام دشمن تہذیب و دانش ہے۔ اس سے تم سطح انسانیت سے نیچے گھر جاؤ گے۔ انسانیت کی بقا اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس نظام کو حرام قرار دیا ہے، اسے حرام سمجھا جائے۔

گر جہاں داند حرامش را حرام
تاقیامت نختہ ماند این نظام
دوام اور پائندگی قرآن کے معاشی نظام ہی کو حاصل ہوگی کیونکہ اس میں تہذیب و دانش پروان چڑھیں
گئے ان تہذیبات و تفریحات کے بعد علامہؒ نے اس کی وضاحت کر دی۔

نیست این کار فقیہاں اے سیر
بانگاہے دیگرے او را نگر
نظام سرمایہ داری کو مٹا کر قرآن کا نظام قائم کرنا، مذہبی پیشوائیت کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے
کہ یہ خود دوسروں کی کمائی پر زندہ رہتے ہیں۔ قرآن کا نظام تو یہ تھا کہ
کس نہ گمرد در جہاں محتاج کس
نکتہ شرع مبین اس است و بس

لیکن

مکتب و مٹلا سخن ہا ساختند
مومنایں این نکتہ را شناختند
آتش او در ضمیر او فُسر
زندہ قوم بود از تاویل مُسر
مذہبی پیشوائیت یہ ہیں ہونے دیگی
نکتہ شرع مبین یہ تھا کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج
نہ رہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت نے قرآن حکیم کے

اس اصل الاصول کو اس طرح مسخ کر دیا ہے کہ یہ سرتاپا حرکت و حرارت قوم، لکھ کا ٹھہر بن کر رہ گئی۔ یہ سب
دین فروش ہیں۔ قرآن حکیم نے کہا تھا کہ ان کا شیوہ یہ ہے کہ یُکْتَبُونَ الْکِتَابَ بِأَیْدِیْهِمْ
ثُمَّ یَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ کہہ کر فریب دیتے
ہیں کہ وہ ارشادات خداوندی ہیں۔ یہ سب اس لئے کہ لیسٹروایہ ثَمَنًا قَلِيلًا۔ تاکہ اس سے
چار پیسے کماتے جائیں اور نہیں جانتے کہ قَوْلُ لَّهُمْ مِمَّا کَتَبْتُ أَعِدُّ لَهُمْ ذُوْیْلُ لَّهُمْ مَا

يَكْبُوتَ ۝ (۹۱)

”ان کے یہ فتویٰ اور ان کے ذریعے حاصل کردہ روٹی انہیں لے ڈوبے گی۔“

اس سے :

عقل و نقل افتاد در بندِ ہوس منبرِ شاں منبرِ کاک است و بس
یہ منقولی بات کہیں یا معقولی، مقصدان کا اپنی مفاد پرستی ہوتا ہے۔ ان کا منبر و روٹی پیچنے والے
کا خزانہ بن کر رہ گیا ہے۔

زیرِ کلیماں نیست اُمیدِ کُشود آستیں ہا بے یارِ بیضا، چہ شود ؟
یہ وہ صاحبانِ ضربِ کلیم نہیں جن کا ثقیانِ مبینِ فرعون، ہامان و قارون کو ہرپ کر جائے۔ ان کی
آستینوں میں چھپے ہوئے ہاتھوں میں ایمان کی شمعیں نہیں۔ لہذا ان سے کُشودِ کار کی کوئی اُمید نہیں
رکھنی چاہیے۔

یہ تھے وہ ساترین و سامرین جن سے پیچھا چھڑانے کے لئے حضرت علامہؒ نے پاکستان کی آزاد مملکت
کا تصور دیا تھا تاکہ اُمتِ مرحومہ کو حلال کی روٹی مل سکے۔ اگر وہ جانتے کہ اس مملکت کا حشر یہ ہونا ہے
تو وہ کبھی اپنے نالائیم شبی اور فغانِ سحری کو اس کے لئے وقف نہ کرنے۔ انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی
(مرحوم) کے اعتراض کے جواب میں اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا کہ :-

”مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزوں کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا
ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے یہ مطلب نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اولین
مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے۔۔۔۔۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے
قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا، جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت
قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد ؟

کہا جاتا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری اس دور کا اقتصادی تقاضا ہے۔ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں اگیر ہی بات

لے اس کے بغیر چارہ اس لئے نہیں کہ ہم میں قرآن کا معاشی نظام اختیار کرنے کی ہمت نہیں۔

ہے تو اسے اختیار کئے رہیے، لیکن اسے حرام تو سمجھئے۔ قرآن کے معاشی نظام کے بجائے اسے اختیار کرنے سے جو شر باقی دنیا کا ہوگا، وہی ہمارا بھی ہوگا۔ لیکن اس کے اسلامی قرار دینے سے اسلام دنیا میں بدنام ہو جائے گا۔ یہی وہ جرم عظیم تھا جس کے احساس سے علامہؒ نے انتہائی سوز و گداز کے ساتھ کہا تھا:-

”نمانداری از محسّد رنگ و بو! اذرو د خود میسالا نام او! ہمارے وجہ سے اگر اسم محمدؐ پر کوئی حرف آگیا تو یہ جرم ناقابل معافی ہوگا۔ جو ہمیں کہیں کا نہیں چھوٹے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔“

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ دین کا نظام اختیار نہ کرنے سے جو شر باقی قوموں کا ہوگا وہی ہمارا ہوگا۔ لیکن ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھئے تو نظر آجائے گا کہ حشر ان قوموں سے بھی زیادہ اندوہناک اور عبرت آموز ہوگا۔ سیکولر قوموں کی کیفیت یہ ہے کہ جو معاملہ ان کے سامنے آتا ہے وہ عقل و فکر کی رو سے اس پر غور کرتی ہیں۔ علم و آگہی کی روشنی میں اس کے ہر پہلو کا جائزہ لیتی ہیں۔ زمانے کے تقاضوں کے ترازو میں رکھ کر اسے تولیتی ہیں۔ اور اس کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچتی ہیں۔

جب تجربہ بتاتا ہے کہ اس فیصلہ میں کوئی مستقم رہ گیا ہے تو وہ اس پر نظر ثانی کرتی ہیں۔ اور اس طرح دائرہ بینش کے ہر کباب زندگی کا سفر طے کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے برعکس، ہماری حالت یہ ہے کہ جو نہی کوئی معاملہ ہمارے سامنے آئے، اُدھر سے آواز آجاتی ہے کہ یہ شرمناک جائزہ ہے۔ (بغیر بتائے کہ اس کی اتھارٹی کیا ہے۔) اس آواز کے ساتھ ہی عقل و فکر کی کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں۔ علم و شعور کے دروازے مقفل ہو جاتے ہیں۔ دماغوں پر تالے پڑ جاتے ہیں، ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔ آپ اگر اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہیں تو آپ پر کفر و الحاد حتیٰ کہ ارتداد تک کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ آپ کو ان کا فیصلہ ماننا پڑتا ہے۔ اس باب میں ائمہ ادہی نہیں، محوئیں بھی بے بس ہوتی ہیں۔ وہ اعتراف کرتی ہیں کہ فلاں (شرعی) قانون ناممکن العمل ہے لیکن وہ اسے منسوخ کرنا تو ایک طرف اس میں کسی قسم کا رد و بدل بھی نہیں کر سکتیں۔ اس کی زندہ مثالیں خود ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں شدید جذباتی واقعہ ہوئے ہیں، تو اس کی وجہ یہی ہے۔ جس قوم پر صدیوں سے علم و عقل سے کام لینا حرام قرار دے دیا گیا ہو۔ جس کا غور و فکر کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو، وہ جذباتی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی؟ اور عقل و فکر

سے عاری، جذباتی قوموں کا جو شر ہوا کرتا ہے، ظاہر ہے۔ اس کی زندہ مثال ہم خود ہیں۔ اقبالؒ ساری عمر یہی رونا روتا رہا اور یہ کہہ کہہ چلا گیا کہ
 داستانِ او مپرس از من، کہ من چوں بگویم، آنچہ ناید در سخن
 اور یہی کہتا خود میں بھی چلا جاؤں گا۔

والسلام

پروفیزر۔ مئی ۱۹۸۲ء